خصوصی
طنز و مزاح نمبر
اردو ڈائجسٹ
/urdudigest.pk
+33
مزاحیہ کہانیاں
نمکین غزلیں اور
گدگداتی تحریریں
www.pdfbooksfree.pk
مُسکرائیے!
کرکٹ کے میدانوں
میں پھوٹنے والی ہنسی
نمک پارے
100 لفظوں سے تخلیق ہونے والی کہانیاں
ذرا خبر لگوا دینا
عطاء الحق قاسمی کی موشگافیاں

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.COM

ضروری التماس!

معزز خواتین وحضرات!

www.aiourdubooks.net کو پسند کرنے کے لئے آپ سب کا بہت بہت شکریہ! ہماری ویب سائیٹ کا مقصد علم وادب کی ترقی و ترویج ہے۔ جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ کتابیں پڑھنے کا شوق دن بدن کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس امر کی کئی وجوہات ہیں لیکن سب سے بنیادی وجہ کتابوں کی بڑھتی ہوئی قیمتیں ہیں۔ ہمارا اولین مقصد عوام الناس کو اعلیٰ کتابیں اور وہ بھی مفت فراہم کرنا ہے۔ امید ہے آپ سب ہمارے اس عظیم مقصد کی تائید کرتے ہیں۔ ہم (www.aiourdubooks.net) آپ کو نیٹ کی وسیع دنیا سے ہر قسم کی کتابیں فراہم کرتے ہیں۔ ہم بلا معاوضہ آپ کی اور علم وادب کی یہ خدمت سر انجام دے رہے ہیں۔ اس کے جواب میں ہم آپ سے درج ذیل باتوں کی توقع کرتے ہیں۔

۱۔ برائے مہربانی www.aiourdubooks.net کا نام اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ تاکہ اگر کسی وجہ سے سائیٹ گوگل میں نہ بھی ملے تو باآسانی ہماری سائیٹ تک پہنچ سکیں۔

۲۔ اگر کوئی کتاب پسند آئے تو اسے Share ضرور کریں تاکہ اور دوست احباب بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

۳۔ اس کے علاوہ آپ ہماری سائیٹ چھوڑنے سے پہلے شکریہ ادا کرتے جائیں تو ہم اس کے لئے شکر گزار ہوں گے۔

منجانب:۔

انتظامیہ: www.aiourdubooks.net

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

ماں باپ کے ساتھ بھلائی

اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف تک نہ کہنا نہ انھیں جھڑکنا اور ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا O اور عجز و نیاز سے ان کے آگے کندھے جھکائے رکھنا اور دعا کرنا کہ اے رب جس طرح انھوں نے مجھے بچپن میں (شفقت سے) پالا تو بھی ان پر رحمت فرمایا۔ O

(سورۃ بنی اسرائیل: 17۔24-23)

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ سے بھلائی کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور اس کو تکلیف سے جنا۔

(سورۃ احقاف: 46۔15)

رسولﷺ کا فرمان

حسنِ سلوک کا حقدار

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہﷺ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''تیری ماں'' اس نے پوچھا: اس کے بعد کون؟ آپؐ نے فرمایا: ''تیری ماں'' اس نے پھر پوچھا: ''اس کے بعد کون؟ آپؐ نے پھر فرمایا: ''تیری ماں'' اس نے پھر دریافت کیا: ''اس کے بعد کون زیادہ حقدار ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''اس کے بعد تیرا باپ۔''

(بخاری کتاب 78۔ باب 2: مسلم کتاب البر۔ باب 1)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے ایک شخص رسول کریمﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپؐ سے جہاد میں جانے کی اجازت طلب کی۔ رسول کریمﷺ نے دریافت فرمایا: ''کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟'' اس نے عرض کیا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تو پھر ان دونوں (کی خدمت کرنے) میں ہی جدوجہد کرو (یہی تمہارا جہاد ہے)''۔

(بخاری کتاب۔ 56۔ باب 138: مسلم کتاب البر۔ باب 1)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

فہرست

طنز و مزاح نمبر

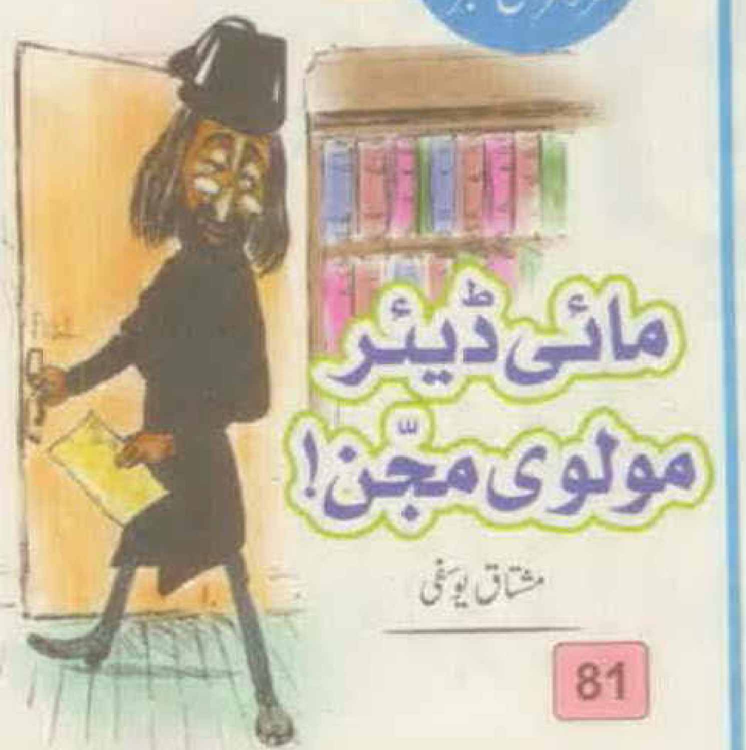

مائی ڈیئر مولوی مجنّ!

مشتاق یوسفی

81

بے معنی کانفرنسوں کی شوقین خواتین کے لیے ایک تحفہ

سنگھار میز کانفرنس

بشریٰ رحمٰن

257

اُردو ڈائجسٹ

فروری 2014ء
ربیع الثانی 1434ھ
جلد نمبر 54 شمارہ نمبر 02
www.urdudigest.pk

صدر مجلس ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ الطاف حسن قریشی
مینیجنگ ایڈیٹر طیب اعجاز قریشی

ایڈیٹر اختر عباس ایڈیٹر (ریسرچ) پروفیسر محمد فاروق قریشی
مجلسِ تحریر حافظ افروغ حسن، نوید اسلام صدیقی، سلمیٰ اعوان
سب ایڈیٹر غلام سجاد
مہتمم طباعت فاروق اعجاز قریشی انچارج کمیونیکیشن افنان کامران قریشی
تخلیق و تزئین راکعہ رضا کمپوزر اشرف سکندر، اشفاق علی
پروف خواں خالد محی الدین

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر مارکیٹنگ ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

مینیجر ایڈورٹائزمنٹ احمد فیاض 0324-4255178
لاہور ندیم حامد گوجرانوالہ احسان القدرت
کراچی شازیہ قمر 0345-2558648

سالانہ خریداری

خریداری نمبر کیلئے رابطہ
subscription@urdu-digest.com فون: 92-42-37589957
19/21 ایکڑ سکیم، سمن آباد، لاہور

اردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے

600 روپے کی شاندار بچت کے ساتھ

پاکستان 1450 کے بجائے 850 روپے میں
بیرون ملک 50 امریکی ڈالر

اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731
editor@urdu-digest.com

قیمت 130 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے جسارت پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ
سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مینیجنگ ایڈیٹر نوٹ

مسکرایئے!

ماضی کے مشہور پی ٹی وی ڈرامے الف نون کا کردار "ننھا" جب معاشرے میں موجود برائیوں، جھوٹ اور فراڈ کو اپنی معصومیت سے ہمارے سامنے لا کر "الن" سے مار کھاتا تو سب دیکھنے والے ہنستے مسکراتے بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتے۔ اسی طرح ففتھ ففتھ کے خاکوں اور محترم عطاء الحق قاسمی کے لکھے "خواجہ اینڈ سن" جیسے ڈراموں کے ذریعے ہم اپنی ناکامیوں اور کمزوریوں کو بے نقاب تو کرتے ہی تھے لیکن اس میں بچوں بڑوں سب کے لیے تفریح کا سامان بھی ہوتا۔

مرحوم معین اختر کئی برس انور مقصود کی کاٹ دار اور طنز و مزاح سے بھرپور تحریروں کو دلچسپ کرداروں کی شکل میں پیش کر کے داد تحسین سمیٹتے رہے۔ طنز و مزاح... شاعری، ڈراما، کارٹون خواہ کسی بھی شکل میں ہو ہر زندہ اور نارمل معاشرے میں پسند کیا جاتا ہے۔

ماضی میں ہم سب صحت مند اور مثبت طنز و مزاح کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے بلکہ اس سے محظوظ بھی ہوتے۔ لیکن گزشتہ چند سالوں سے الیکٹرونک اور سوشل میڈیا میں طنز و مزاح کے نام پر منفی رویوں اور مسائل کی نشان دہی کے بجائے سیاسی و معروف شخصیات کی تضحیک اور دل آزاری فیشن بن گیا ہے جس سے وقتی تفریح کا سامان تو ہو جاتا ہے لیکن مثبت تبدیلی اور اصلاح کا کوئی امکان نہیں رہتا۔

ہم نے اس ماہ معروف مزاح نگاروں کی شگفتہ تحریروں، نمکین نظموں، چٹ پٹے لطیفوں اور دلچسپ کارٹونوں سے سجے خصوصی طنز و مزاح نمبر کے ذریعے آپ کے چہروں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ان صفحات کو پڑھتے جائیں گے، ہنستے جائیں گے اور کچھ دیر حالات کی تپش سے محفوظ رہ سکیں گے۔ خوش رہیے اور اپنے اردگرد لوگوں کو خوش رکھنے کی کوشش کیجیے۔

طیب اعجاز قریشی

tayyab.aijaz@urdu-digest.com

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اٹھایئے

ذرا خبر لگوا دینا

عطاء الحق قاسمی کی موشگافیاں

129

ملہوترہ کے کتے

معروف مزاحیہ شاعر کی زندگی سے جڑے دلچسپ واقعات

145

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اسلامی زندگی کی کہکشاں

33 یہ احساسات — راحت بشیر
جفائے دوست کی لذت کو غیر کیا جانے

35 ذکرِ الٰہی — ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی
بے سکونی کے سمندر میں سکون کا جزیرہ

38 ثوبانؓ کیوں اُداس تھے؟ — سید عاصم محمود
سیرتِ رسول ﷺ کا انسانی پہلو

42 ابن بطوطہ — طارق عزیز خان
ایک کروڑ مربع کلومیٹر کی سیاحت کرنے والے مسلمان سیاح کا احوال

انٹرویو

کچھ شکایتیں اچھی ہوتی ہیں انہیں باقی رہنا چاہیے!

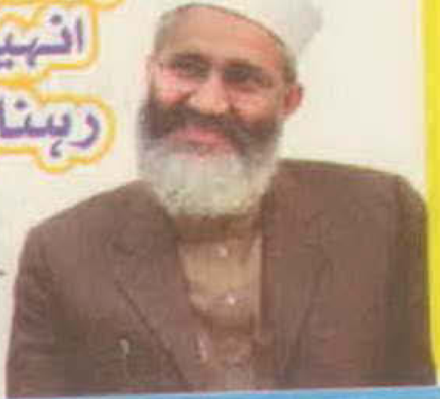

اختر عباس

50

مشینی دور کی اولاد

151

ممتاز شاعر اور دانشور نعیم صدیقی مرحوم کی 70 سال قبل لکھی گئی ایک حیرت انگیز تحریر

نعیم صدیقی

منکہ ایک آل راؤنڈر

228

نیوزی لینڈ کے عظیم کھلاڑی سر رچرڈ ہیڈلی کی جگ بیتی

عاصم محمود

کاغذی ملبوسات

پہنیے اور پھینک دیجیے

فرزانہ نگہت

225

ایسے ...... ویسے

چٹ پٹی تحریریں، زندگی کے چار رنگوں کا ذائقہ لیے ضروری نہیں یہ ذائقہ کھٹا بھی ہو

انجم انصار

266

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

15 کچھ اپنی زبان میں
تصور اور حقیقت میں ہم آہنگی چاہیے

17 ہم کہاں کھڑے ہیں
طاقت کے اصل سرچشموں کا سُراغ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

177 اتفاق میں برکت ہے ———— ابن انشاء
ایک بڑے میاں کی زندگی کے آخری لمحات کی کہانی

85 اس کے بعد انٹرویو کیا ہوتا تھا؟ ———— کرنل اشفاق حسین
ایک حیرت انگیز انٹرویو کا ماجرا

87 اوئے ———— فرحت اللہ بیگ
یہ کبھی دل توڑتی ہے اور کبھی دلی اجاڑتی ہے

93 قائداعظم بھی شاعر تھے ———— کرنل اشفاق حسین
کبھی کبھی چھوٹی سی غلطی کیسا رخ اختیار کر لیتی ہے

107 ہمارا صحیح مقام ———— ابن انشاء
شگفتائی میں قدیم الشال استقبال کا احوال

117 اردو کی پہلی کتاب ———— یوسف ناظم
اُن کے لیے خاص جو اُردو سکھانے میں بے حد دلچسپی رکھتے ہیں

133 گھوڑا اور کار بوریٹر ———— عطاء الحق قاسمی
زندگی کے مختلف شعبوں میں بروئے کار سفید گھوڑوں کا دلچسپ ماجرا

135 آپریشن پلان خروس ———— اختر حسین شیخ
نصیب اوج پر ہوں تو سُنا ہے چوروں کی دعائیں بھی قبول ہو جاتی ہیں

169 مزاحیہ واقعات ———— رانا محمد شاہد
کھیل کے میدان سے وابستہ لوگوں کی زندگی سے جڑے مزاحیہ واقعات

180 دیکھنا تقریر کی دہشت ———— ڈاکٹر ایس ایم محجوب
پاکستانی عوام کے مزاج کو یا بھٹو نے سمجھا یا اداکار رنگیلا نے

184 بے چارے سرکاری ملازمین ———— صالحہ محجوب
اتنا کام کرنے پر نہیں جتنا اس سے بچنے کے بہانے ڈھونڈنے پر وقت لگاتے ہیں۔

193 ادیبوں کی عجیب عادات ———— شاہد محمد شاہد
مشہور ادیبوں کے لکھنے کے عجیب و غریب طریقوں کا ذکر

212 فہد میاں فیل کیوں ہوئے ———— سارہ الیاس
ایک بچے کی ذہانت کا اعلیٰ شاہکار

233 یقین کیجیے ———— اُم ہاشم
سب لوگ اتنے خوش قسمت نہیں ہوتے

237 چند یادیں چند تاثرات ———— عاشق حسین بٹالوی
مسلم اکابر میں سے کوئی بھی اُن کا ہم خیال نہ بن سکا

241 اسمارٹ بننے کے طریقے ———— ڈاکٹر سفیر علی
صحت کی ایسی سچی باتیں جو اصل میں جھوٹ ہیں

247 اسٹابری ———— حکیم قاضی ایم۔اے خالد
صحت کی ضامن اور محبت کی علامت

250 ماؤس کو خدا حافظ ———— عبدالہادی سید
انگلی کے اشارے سے کمپیوٹر چلایئے

252 پکانے کا تیل کون سا بہتر ———— عالیہ احمد
زیتون کے تیل کی غذائیت تباہ ہونے سے کیسے بچائی جا سکتی ہے

254 انسان کے منہ میں جانوروں کے دانت ———— محمد اشرف
دانتوں کے بارے میں سوچ کر ہی گھن آتی ہے

نمک پارے

100 لفظوں کی مکمل کہانیاں

187

مبشر علی زیدی

یہ تیرے "پُراسرار" بندے

123

ناصر محمود ملک

خامہ بگوش کے قلم سے

نامور کالم نگار، نقاد اور ادیب مشفق خواجہ کے قلم کی شوخیاں۔ ایسے شگفتہ کالم انہی کا خاصہ تھے

221

عبدالغفور صاحب

خوشبو میں بسے قیامت کے ان ناموں کا ذکر جنھوں نے پڑھنے والے کو ہی نہیں سننے والوں کو بھی بے چین و بے قرار کر دیا تھا

134

عطاء الحق قاسمی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

شکر ہے خوف سے نکلی چیخیں سننے والا یہاں کوئی نہ تھا

آٹے کا کن کھجورا

خالد محی الدین

209

قصہ ہماری مونچھ تراشی کا

سجاد قادر

215

سٹیل مین

پاکستانی سیاست کی سب سے اہم شخصیت کا سکرپٹ جسے
آج کے نمایاں ترین مزاح نگار نے لکھا ہے

ڈاکٹر محمد یونس بٹ

71

لُٹنا میرا استنبول کے کیپلی کارسی میں

ایک سادہ دل سیاح کا ماجرا
اس کا واسطہ ایک چور سے پڑ گیا تھا

سلمیٰ اعوان

196

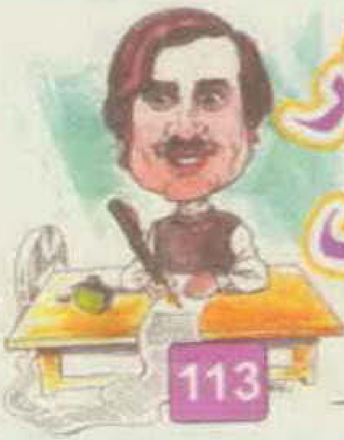

ہارن دے کر پاس کریں

فردوس عالم

113

اور بستہ کُھل گیا

محمد سعید جاوید

97

ایک معصوم بچے کی شرارتوں کا دلچسپ احوال
"ظالم" ماموں کو بچوں کی آزادی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی

کیا خبر اس سے خوش ہو جائیں

اپنے میاں کی دوری سے نالاں ایک بیوی کا ماجرا

تنویر قریشی

177

مستقل سلسلے اور کالم

273	صحت نہیں وزن کم کریں	نوشین ناز
264	قصہ کوئز	غلام سجاد
277	چمن خیال	آپ کے خطوط
285	بوجھیں تو جانیں	نوجوانوں کیلئے کوئز
283	در دل پہ دستک	اختر عباس

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

PRESTON UNIVERSITY

Chartered by the Govt. of NWFP
Chartered by the Govt. of Sindh
Recognized by HEC
All campuses placed in Highest Category "W"
Islamabad Campus Upgraded to "W-4"

The leader and pace-setter in higher education!

— Executive Programs —

EMBA/MCS
MBA (Evening)

— Regular Programs —

BBA/BSCS
MBA/MCS

BS Psychology, Economics, Intl. Relations, Physics, Maths, Electronics, Telecommunication, Biology, Biotechnology

M.Sc
Psychology, Economics, Education, International Relations, Physics, Maths, Electronics, Telecommunication, Biology, Biotechnology, Disaster Risk Management, Environment Management, Occupational Health & Safety Management

B.Ed/M.Ed
MA/MS (Education)

M.Phil/PhD
Psychology, Mathematics, Management, Economics, International Relations, Education, Computer Science, IT

http://www.facebook.com/Preston.University http://twitter.com/prestonuni http://preston-uni.blogspot.com/

UAN:111-707-808
www.preston.edu.pk

ISLAMABAD	KOHAT	PESHAWAR
(92-51) 4430597-8	(92-922) 860211-13	(92-91) 5845540-2
LAHORE	KARACHI	
(92-42) 35858745-8	(92-21) 34534663-4	

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.COM

ضروری التماس!

معزز خواتین وحضرات!

www.aiourdubooks.net کو پسند کرنے کے لئے آپ سب کا بہت بہت شکریہ! ہماری ویب سائیٹ کا مقصد علم وادب کی ترقی وترویج ہے۔ جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ کتابیں پڑھنے کا شوق دن بدن کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس امر کی کئی وجوہات ہیں لیکن سب سے بنیادی وجہ کتابوں کی بڑھتی ہوئی قیمتیں ہیں۔ ہمارا اولین مقصد عوام الناس کو اعلیٰ کتابیں اور وہ بھی مفت فراہم کرنا ہے۔ امید ہے آپ سب ہمارے اس عظیم مقصد کی تائید کرتے ہیں۔ ہم (www.aiourdubooks.net) آپ کو نیٹ کی وسیع دنیا سے ہر قسم کی کتابیں فراہم کرتے ہیں۔ ہم بلا معاوضہ آپ کی اور علم وادب کی یہ خدمت سر انجام دے رہے ہیں۔ اس کے جواب میں ہم آپ سے درج ذیل باتوں کی توقع کرتے ہیں۔

۱۔ برائے مہربانی www.aiourdubooks.net کا نام اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ تا کہ اگر کسی وجہ سے سائیٹ گوگل میں نہ بھی ملے تو با آسانی ہماری سائیٹ تک پہنچ سکیں۔

۲۔ اگر کوئی کتاب پسند آئے تو اسے Share ضرور کریں تا کہ اور دوست احباب بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

۳۔ اس کے علاوہ آپ ہماری سائیٹ چھوڑنے سے پہلے شکریہ ادا کرتے جائیں تو ہم اس کے لئے شکر گزار ہوں گے۔

منجانب:۔

انتظامیہ:www.aiourdubooks.net

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تصور اور حقیقت میں ہم آہنگی چاہیے

تقسیمِ اختیارات کے جدید نظریے کے مطابق انتظامیہ کو امورِ مملکت آزادی اور ذمے داری سے سرانجام دینے کا اختیار دیا جاتا ہے جبکہ مقننہ قانون سازی میں آزاد اور عوامی نمائندگی کا سب سے بالاتر ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ تیسرا ادارہ عدلیہ قانون کی شارح اور بنیادی انسانی حقوق کی نگہبان تصور کی جاتی ہے۔ یہ تینوں ادارے اپنے اپنے دائرے میں ٹھیک طور پر کام کرتے رہیں' تو کوئی بڑا قضیہ کھڑا ہوتا ہے نہ کوئی بحران جنم لیتا ہے' مگر پاکستان اِس اعتبار سے خوش نصیب ملکوں میں شمار نہیں ہوتا۔ یہاں بار بار فوج اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کرتی رہی جس کے سبب ان ریاستی اداروں کے درمیان توازن قائم نہیں رہ سکا۔ بدقسمتی سے سیاسی آمروں کے غیر متوازن اور عاقبت نااندیش رویے بھی تقسیمِ اختیارات کے مسلمہ تصورات پر کاری ضرب لگاتے اور سنگین صورتِ حال پیدا کرتے رہے جس کے نتیجے میں عوام کی مشکلات اور قومی اضمحلال میں بڑا اضافہ نظر آتا ہے۔

گزشتہ پانچ برسوں میں تصور اور حقیقت کے درمیان ایک کھلی جنگ ہوتی رہی۔ پارلیمانی طرزِ حکومت میں کسی پارٹی کا سربراہ صدرِ مملکت نہیں ہوسکتا جو آئین کی رُو سے وفاق کی وحدت کا غیر جانب دار نمائندہ ہوتا ہے۔ اس مسلمہ پارلیمانی روایت کے برعکس جناب زرداری صدرِ مملکت منتخب ہونے کے بعد بھی پیپلز پارٹی کے ایک بااختیار چیئرمین کے طور پر بے حد سرگرم رہے اور تمام ایگزیکٹو اختیارات نہایت ڈھٹائی سے استعمال کرتے رہے۔ وزیرِاعظم کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ کی نہ تھی۔ اس اقدام سے پارلیمانی نظام عملاً صدارتی نظام کی شکل اختیار کر گیا۔ صدر اور وزیرِاعظم جن کا تعلق ایک ہی سیاسی جماعت سے تھا' اُنہوں نے پبلک اتھارٹیز اور کارپوریشنز میں اہل اور دیانت دار افراد کے بجائے اپنے جیل کے ساتھی اور ہم مشرب تعینات کر دیے جو ملکی وسائل بڑی بے دردی سے لوٹنے میں شب و روز مصروف ہو گئے۔ اُن کا ایک ایک اسکینڈل اربوں سے کسی طرح کم نہ تھا۔ جب عدالتِ عظمیٰ نے قومی خزانہ لٹتے دیکھا' تو وہ ملکی مفاد میں سرگرم ہو گئی اور ازخود نوٹس میکانزم کے ذریعے معاملات کا جائزہ لینا' غلط تقرریوں کو اسٹرائیک ڈاؤن کرنا اور لوٹی ہوئی دولت

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

واپس خزانے میں لانے کے احکام جاری کرتی گئی۔ اسی طرح سرکاری محکموں میں بھی اندھیر مچا ہوا تھا۔ اعلیٰ ملازمتوں پر جونیئر افسر لگانے کی رسم چل نکلی تھی اور درجنوں من پسند افراد بائیس گریڈ میں ترقی پا گئے تھے۔ اس بے انصافی کے خلاف ہمارے جی دار سرکاری اعلیٰ افسر جناب اوریا مقبول جان نے سپریم کورٹ میں رٹ پٹیشن دائر کی، تو کئی ماہ بعد ایک تاریخی فیصلہ سامنے آیا جس کے مطابق چالیس پچاس افسر دوبارہ اکیس گریڈ میں بھیج دیے گئے۔ اُس عہدِ بے مہار میں ایک بے لگام ایگزیکٹو کو لگام دینا ازبس ضروری ہو گیا تھا، تاہم اس عدالتی عمل میں کچھ فیصلے ایسے بھی ہوئے جن سے نظمِ حکومت چلانے میں دشواریاں پیش رہی ہیں۔

اس حوالے سے ایک عدالتی فیصلہ یہ ہے کہ پبلک کارپوریشن اور حکومت کے اعلیٰ مناصب پر سربراہ کا تقرر اس طور سے کیا جائے کہ پہلے اخبارات میں اشتہار دیا جائے، تمام درخواستوں کی چھان بین ایک سرچ کمیشن کے ذریعے کی جائے جو باصلاحیت افراد پر مشتمل ہو۔ وہ کمیشن اُمیدواروں کا انٹرویو لینے کے بعد اپنی سفارشات حکومت کو بھیج دے اور تین اشخاص میں سے کسی ایک شخص کی تقرری کا نوٹیفکیشن جاری کرنے کی مجاز ہوگی۔ بظاہر اس کی روح یہ ہے کہ اہلیت کی بنیاد پر لوگوں کا انتخاب کیا جائے اور ایگزیکٹو اپنی من مانی نہ کر سکے، مگر اس طریقِ کار کے منفی نتائج بھی سامنے آرہے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ حکومت باصلاحیت اور قابل افراد کی خدمات حاصل کرنے سے تقریباً محروم ہو گئی ہے۔ وہ شخص جو بگڑے اور زوال پذیر اداروں کو ایک نئی زندگی دینے کی غیر معمولی صلاحیتوں سے مالا مال ہوگا، وہ کبھی درخواست دے گا نہ کسی جھنجھٹ میں پڑنا پسند کرے گا۔ وہ تو اُس وقت ذمے داریاں اُٹھانے کے بارے میں سوچے گا جب حکومت اُسے باوقار طریقے سے ایک اچھے پیکج کی پیش کش کرے گی اور اُس کی عزتِ نفس کا پورا پورا خیال رکھے گی۔

اِس عدالتی فیصلے کے نتیجے میں اَن گنت ادارے سربراہوں سے محروم چلے آرہے ہیں اور یوں ایک انتظامی خلفشار بحران کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ سرچ کمیشن کی سست روی نے مسائل میں مزید اضافہ کر دیا ہے اور پورا عمل اس قدر صبر آزما اور پیچیدہ ہے کہ مردانِ کار قریب ہی نہیں پھٹک رہے۔ یوں ایک خلا پیدا ہونے سے حکومت کی کارکردگی بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ منصب کی مناسبت سے مختلف سطح پر سرچ کمیٹیاں قائم کی جائیں جو ماہرین پر مشتمل ہوں۔ اُن کے سامنے حکومت اُن افراد کی پوری تفصیلات پیش کرے جو اُس کی نگاہ میں کسی منصب کے لیے سب سے موزوں ہوں۔ اگر غیر جانب دار ماہرین کے علم اور تجربے کی رُو سے اور بھی مناسب لوگ موجود ہیں، تو اُن کے کوائف کا بھی جائزہ لیا جائے اور باہمی مشورے سے جوہرِ قابل پر اتفاق کے بعد اُن کی خدمات حاصل کرنے کے لیے اُن سے نہایت سلیقے سے درخواست کی جائے۔ یوں عدالت کا منشا بھی کسی حد تک پورا ہو جائے گا اور حکومت کو بھی فیصلے کرنے میں آسانی میسر آجائے گی اور تصور اور حقیقت کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم ہوتا جائے گا۔

الطاف حسن قریشی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

طاقت کے اصل سرچشموں کی دریافت

ہمارے بالا دست طبقات کی خواہشات اور توقعات کچھ اور جبکہ تاریخ کی طغیانیاں کچھ اور کہتی ہیں۔ روحِ عصر نے یہ راز افشا کر دیا ہے کہ طاقت کے اصل سرچشمے کہیں اور واقع ہیں اور دنیا مستقبل قریب میں کچھ سے کچھ ہونے والی ہے۔

آنے والے حالات کی ایک تجزیاتی رپورٹ

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

ہمارے دین میں ناامیدی اور مایوسی کفر ہے کہ اس سے باطن پر مردنی چھا جاتی ہے' مگر پاکستان ان دنوں جن مشکلات میں گھرا ہوا ہے' انہیں دیکھ کر ہاتھ سے اُمید کا دامن بار بار چھوٹ جاتا ہے۔ میرا وطن دہشت گردی اور فرقہ وارانہ تشدد سے لہولہو ہے۔ بستیاں بے سکون اور عبادت گاہیں غیر محفوظ ہیں۔ دشمن ہمارے درمیان پرورش پا رہا ہے اور خودکش حملہ آور ہمارے چمن زیستکو خاکستر کیے دے رہے ہیں۔ دوسری طرف سکڑتی معیشت' توانائی کے بحران اور بجلی اور گیس کی لوڈشیڈنگ سے بیروزگاری' مہنگائی اور بدامنی میں ہولناک اضافہ ہوا ہے' کیونکہ حکومت کا ڈلیوری سسٹم مفلوج ہوتا جا رہا ہے۔ انتخابات میں اُبھرنے والی قیادتوں اور حکومتوں سے عوام نے جو توقعات وابستہ کی تھیں' وہ اب عالمِ بے قراری میں کہنے لگے ہیں کہ کوئی اُمید بر نہیں آتی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بلاشبہ مایوسی گناہ ہے' لیکن ان تلخ حقیقتوں کا کیا کیا جائے کہ سرکاری محکموں میں کرپشن' فرائض سے کوتاہی اور قوانین کی سنگین خلاف ورزی سے جان لیوا حادثات ہماری روزمرہ زندگی کا معمول بن گئے ہیں۔

نامساعد حالات کے باوجود ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے' آگے بڑھنے اور امکانات پر کمند ڈالنے کا ہنر آزمانا ہوگا۔ آج ہمارا ملک ان گنت مصائب کی زد میں اس لیے ہے کہ ہمارے حکمران طاقت کے اصل سرچشموں سے دور ہو گئے ہیں اور اپنے نفس اور جھوٹی انا کی پرستش کر رہے ہیں۔ مسندِ اقتدار پر ایسے لوگ بھی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

براجمان ہیں جو اپنی ناک سے آگے دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اُنہوں نے نازک شاخ پر آشیانہ بنا رکھا ہے جسے ہوا کے تند و تیز جھونکے کسی وقت بھی اُڑا لے جائیں گے۔ عوام سے مینڈیٹ لے کر آنے والی جماعتیں اپنی ترجیحات کا صحیح تعین ابھی تک نہیں کر پائیں' کیونکہ یہ کام گہرے غور وخوض اور اعلیٰ درجے کی دانش مندی کا متقاضی ہے جس کا اقتدار کے ایوانوں میں زمانوں سے داخلہ بند ہے۔ تاریخی شعور سے یکسر محروم یہ طبقہ سمجھتا ہے کہ روپے پیسے سے ہر کام نکالا اور بیوروکریسی کی چابک دستیوں سے مخالف سیاسی طاقتوں کو اشاروں پر نچایا جا سکتا ہے۔ وہ اس زعم کا بھی شکار ہے کہ خوشنما منصوبوں کی سحر کاری سے عوام کے دل جیتے اور اُنہیں سہانے خواب دکھائے جا سکتے ہیں۔ اُسے یہ بھی خوش گمانی ہے کہ فوج کی پشت پناہی اور امریکی خوشنودی سے اُن کے اقتدار کو دوام حاصل ہو جائے گا' لیکن عالمی سطح پر رونما ہونے والی بڑی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں نے اُس کے حسین تصورات اور زمینی حقائق کے درمیان رشتہ بہت کمزور کر دیا ہے اور حکمرانی کے تجربات نے طاقت کے حقیقی سرچشمے دریافت کر لیے ہیں۔

☆

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جو معاشرہ اخلاقی اور تخلیقی اعتبار سے توانا اور صحت مند ہے' اُسے صدیوں تک زوال نہیں آتا۔ سرورِ دوعالم حضرت محمد ﷺ نے دنیا کا سب سے عظیم انقلاب بلند ترین اخلاق اور اعلیٰ ترین کردار کی طاقت سے برپا کیا تھا اور مدینہ منورہ میں ریاست کی بنیادیں لازوال روحانی اخلاقی اصولوں پر اُٹھائی تھیں۔ مکہ مکرمہ میں کٹر مخالفین آپؐ کی امانت' دیانت اور صداقت کی گواہی دیتے اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ اخلاقی برتری اور توانائی ہی سے اسلام نصف صدی کے اندر اندر پورے جزیرۃ العرب میں پھیل گیا تھا اور اسلامی ریاست کی سرحدیں شمالی افریقہ تک جا پہنچی تھیں۔ خلافتِ راشدہ میں اخلاقی جوہر پوری طرح ضوفشاں رہا جو بعدازاں مسلم تہذیب و تمدن میں ایک بنیادی عنصر کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ برصغیر میں حضرت قائداعظم نے انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف جنگ اخلاقی اور سیاسی قوت کے بل بوتے پر جیتی تھی۔ اُن کے بدترین دشمن بھی اس امر کے معترف ہیں کہ وہ کچی اور پختہ بات کہتے' ہر معاملے میں دیانت سے کام لیتے' اصولوں پر قائم رہتے اور خریدے اور جھکائے نہیں جا سکتے تھے' مگر سو سال کے لگ بھگ انگریزوں کے تحت اور ہندوانہ رسوم و رواج کے زیرِ اثر زندگی بسر کرنے کے باعث مسلم معاشرے میں بے شمار اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ خوش قسمتی سے ہندوستان میں وقفے وقفے سے اصلاحی اور دینی تحریکیں اُٹھتی رہیں اور مدرسوں اور خانقاہوں کے ذریعے اخلاقی اقدار کے تحفظ اور احیاء کا سلسلہ جاری رہا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران عامۃ المسلمین

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

میں اپنی عظمتِ رفتہ کی بازیابی کا جذبہ طاقت ور ہوتا گیا اور جب آگ اور خون کے دریا عبور کر کے اُنہیں ایک آزاد وطن حاصل ہوا' تو اُنہوں نے بے مثل عزیمت' بے پایاں ایثار اور غیر معمولی اخلاقی ذمے داری کا ثبوت دیا۔ یوں ہندو قیادت کے اندھے خواب چکنا چور ہو گئے جو خاکم بدہن چھ ماہ کے اندر اندر پاکستان کو سرنگوں ہوتا دیکھ رہی تھی۔

آج کے دورِ آشوب میں انہی عظیم صفات کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی ہے جن کا بے مثال مظاہرہ قیامِ پاکستان کے اوّلین دور میں ہوا تھا جب ہمارے قائدین کرپشن سے پاک' اخلاقی ضابطوں کے پابند اور عوام کے حقوق اور مفادات کے محافظ تھے۔ بعد کے وقتوں میں سیاسی قیادت اور معاشرہ روبہ زوال ہوتے گئے۔ اس کے برعکس اسلام نے عمدہ حکمرانی کے جو راہنما اصول دیے ہیں' اُن پر مغربی ممالک نے فلاحی ریاستوں کے نظام وضع کیے اور حکمرانوں کے لیے سخت ضابطۂ اخلاق بڑے مؤثر انداز میں نافذ کرنے کا قابلِ تقلید تجربہ کیا ہے۔ وہاں کے اربابِ اقتدار جھوٹ بولتے ہیں نہ خیانت کرتے ہیں' نہ فریب دہی سے کام لیتے ہیں اور جواب دہی کے گہرے احساس کے ساتھ ایک صاف ستھری پبلک لائف بسر کرتے ہیں۔ اگر صدر' وزیراعظم یا حکومت کے ذمے دار عمال پر یہ الزام آئے کہ اُنہوں نے قوم سے حقائق چھپائے ہیں یا ملکی اور غیر ملکی معاہدوں اور کاروباری معاملات میں کمیشن کھایا ہے یا وہ جنسی جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں' قانون فوری طور پر حرکت میں آ جاتا ہے۔ الزامات درست ثابت ہونے کی صورت میں اُنہیں سخت سزائیں بھگتنا پڑتی ہیں۔ امریکی صدر نکسن واٹرگیٹ اسکینڈل میں اقتدار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ جاپان کے ایک وزیراعظم اور ایک اہم کورین صدر سزائے موت پا چکے ہیں۔ امریکی صدر بل کلنٹن جنسی اسکینڈل میں مواخذے سے بال بال بچے تھے۔ ورلڈ بینک کے ایک بہت طاقت ور صدر بھی شکنجے میں آ گئے تھے۔ اِن ممالک میں قانون کی حکمرانی کا وہی تصور کارفرما ہے جو اسلام نے صدیوں پہلے دنیا کو دیا تھا کہ حکمران ہوں یا عام شہری' قانون سب کے لیے برابر ہے۔ وزرائے کرام قطار میں کھڑے رہتے' پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرتے' عوام کے درمیان درمیانے درجے کے مکانات میں رہتے اور باقاعدگی سے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

☆

پاکستان کو مہذب ممالک میں ایک بلند مقام بنانے کے لیے حکمرانی کا وہی اسلوب اختیار کرنا ہو گا جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہے۔ اس کے حکمرانوں کو محصور قلعوں اور عشرت کدوں سے نکل کر عوام کی سطح پر آنا اور وی آئی پی کلچر کو خیرباد کہنا ہو گا۔ عوام کی سطح پر آنے کا مطلب یہ ہے کہ اشرافیہ اور عام شہری کے بچے ایک ہی اسکولوں میں تعلیم

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

حاصل کریں اور ایک جیسی بستیوں ہی میں پروان چڑھیں اور علاج معالجے کا معیار اور ترقی کے مواقع یکساں ہوں۔ عوام کو بنیادی اہمیت دی جائے اور اُن کی نشوونما، ترقی اور تحفظ کے لیے زیادہ سے زیادہ مالی وسائل فراہم کیے جائیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم، صحت، پبلک ٹرانسپورٹ اور امنِ عامہ پر غیر معمولی توجہ دینے کے علاوہ ذہنی تفریح اور سیر و سیاحت کے مواقع بھی لازمی طور پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ منتخب نمائندے اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں رائے دہندگان کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہیں اور ہر انتخابی حلقے میں اُن کے باقاعدہ دفتر قائم ہیں جن میں خوش اخلاق اور تربیت یافتہ عملہ شہریوں کی ہر معاملے میں راہنمائی کرتا اور حکومت کے اداروں سے اُن کے مسائل حل کرانے میں ہر وقت سرگرم رہتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رُو سے اسلامی ریاست ہر شہری اور ہر جاندار کو معاشرتی تحفظ فراہم کرنے کی پابند ہے۔ اِن تعلیمات کی روشنی میں مغرب نے سوشل سیکیورٹی سسٹم وضع کیے ہیں جن میں بے گھر اور بیروزگار شہریوں کی باعزت طریقے سے اعانت اور کشادہ امکانات کی ایک وسیع دنیا فراہم کی جاتی ہے۔ وہاں عوامی رائے عامہ کا اس قدر احترام ہے کہ اگر پانچ افراد بھی کسی مسئلے پر خاموش احتجاج کرتے ہیں، تو انتظامیہ میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ اِس اعتبار سے اخلاقی قوت کے بعد ہمارے لیے عوامی حمایت طاقت کا دوسرا بڑا سرچشمہ ہے۔

انسانی تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہی معاشرے زندہ رہتے اور پھلتے پھولتے ہیں جو آئین اور قانون کی حکمرانی پر قائم ہیں۔ فرانسیسی مفکّرین نے صدیوں پہلے ایک تصوراتی معاہدۂ عمرانی پیش کیا تھا جس کے بعد یورپ اور امریکہ میں منتخب ادارے اور دستوری حکومتیں قائم ہوئیں اور دستور اور قانون کی اہمیت عوام کے تحت الشعور میں اُترتی چلی گئی تھی جبکہ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے بیشتر سیاسی قائدین نظامِ مملکت میں دستور کی اصل اہمیت سے بے خبر تھے۔ پہلی دستور ساز اسمبلی جس سے قائداعظم نے گیارہ اگست 1947ء کو خطاب فرمایا تھا، وہ اپنی گراں قدر ذمے داریوں سے ٹھیک طور پر عہدہ برآ نہ ہو سکی اور دستور سازی میں تاخیر ہوتی گئی۔ سب سے پہلے امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی نے آئین کی اہمیت کو پوری طرح اُجاگر کرنے اور دستور سازی کے عمل میں تیزی لانے کے لیے ایک زبردست عوامی تحریک شروع کی اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں تواتر کے ساتھ واضح کیا کہ آئین دراصل ریاست اور شہریوں کے درمیان ایک عمرانی معاہدے کی حیثیت رکھتا ہے اور حقوق اور فرائض کا واضح تعین کرتا ہے۔ کئی بحرانوں سے گزرنے کے بعد پہلا دستور 23 مارچ 1956ء کو نافذ ہوا جسے بدقسمتی سے صدر اسکندر مرزا اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ایوب خاں نے دو سال بعد ہی پھاڑ ڈالا اور وہ بنیاد ہی منہدم کر ڈالی جس پر پاکستان کے دونوں بازوؤں کے نمائندوں نے مشترکہ مقاصد اور مفادات کا ایک ڈھانچہ تعمیر کیا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تھا۔ ایوب خاں کا دستور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خاں نے 25 مارچ 1969ء کو کالعدم قرار دے دیا اور دسمبر 1970ء میں ایک نئی دستور ساز اسمبلی کے ''فری فار آل'' انتخابات کرا ڈالے' مگر مسٹر بھٹو (مرحوم) اور جنرل یحییٰ کی ملی بھگت سے اس دستور ساز اسمبلی کا اجلاس منعقد ہی نہ ہو سکا اور کشت و خون کے درمیان سانحۂ مشرقی پاکستان پیش آ گیا تھا۔ تب قوم سکتے میں آ گئی اور اُسے شدت سے پہلی بار محسوس ہوا کہ دستور کے ٹوٹ جانے سے ملک بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

☆

مشرقی پاکستان کی المناک علیحدگی کے بعد بقیہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے 1973ء میں متفقہ آئین منظور کیا جس میں اُس کی حفاظت کا غیر معمولی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس میں بطور خاص ایک ہی جرم کا ذکر بیان کیا گیا ہے جس کی صراحت آرٹیکل 6 میں یوں کی گئی ہے کہ ''جو کوئی بھی آئین سے بغاوت کرے گا' وہ سنگین غداری کے جرم کا مرتکب ہوگا''۔ اس کے بعد پارلیمنٹ نے ''ہائی ٹریزن ایکٹ 1973ء'' منظور کیا جس میں وفاقی حکومت کو بغاوت کا مقدمہ دائر کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ پھر اسپیشل کورٹ ایکٹ 1976ء نافذ ہوا جس میں درج ہے کہ سنگین بغاوت کے ملزم کے خلاف مقدمہ خصوصی عدالت میں چلے گا جو ہائی کورٹ کے تین جج صاحبان پر مشتمل ہو گی جسے وفاقی حکومت قائم کرنے کی مجاز ہو گی۔ ان تمام حفاظتی تدابیر کے باوجود مارچ 1977ء کے انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلی کے خلاف حزبِ اختلاف کی تمام جماعتیں سڑکوں پر نکل آئیں۔ وزیر اعظم بھٹو معاملات کو سلجھانے کے بجائے خودسری اور طاقت آزمائی کے راستے پر چل نکلے۔ چار ماہ کی جاں گسل کشمکش میں حکومت کی رِٹ ختم ہو گئی اور فوج نے پاکستان کو خانہ جنگی سے بچانے کے لیے اقتدار سنبھال کر آئین کو التوا میں ڈال دیا۔ عدالتِ عظمیٰ نے نظریۂ ضرورت کے تحت فوجی بغاوت کو جائز قرار دے دیا جبکہ آٹھویں آئینی ترمیم نے اُسے ''انڈیمنٹی'' عطا کر دی۔ جنرل ضیاء الحق کے خلاف غالباً بغاوت کا مقدمہ اس لیے نہیں چلا کہ ایک طرف اُن کی حکومت کو آئینی جواز مل گیا تھا اور دوسری طرف اُن کے غیر قانونی اقدام کو ابتدا میں عوامی تائید حاصل تھی جو حکومتی مشینری کے مفلوج ہو جانے سے حد درجہ ناگزیر ہو گیا تھا۔

12 اکتوبر 1999ء کی رات جنرل پرویز مشرف نے آئین سے بغاوت کرتے ہوئے جناب نواز شریف کی منتخب حکومت کا تختہ اُلٹ دیا جس کا محترمہ بے نظیر بھٹو' نوابزادہ نصر اللہ خاں' عمران خاں' حامد ناصر چٹھہ اور ایم کیو ایم نے خیر مقدم کیا۔ عدالتِ عظمیٰ نے فوجی بغاوت کو عدالتی جواز فراہم کرتے ہوئے جنرل پرویز مشرف کو آئین میں ترمیم کرنے کی بلا مانگے اجازت بھی دے دی اور سترہویں آئینی ترمیم نے ''انڈیمنٹی'' کی مہر بھی ثبت کر ڈالی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

آرمی چیف کی حیثیت سے جنرل مشرف نے صدارت کی دوسری ٹرم کو یقینی بنانے کے لیے دوسری بار آئین معطل کیا اور اعلیٰ عدالتوں کے خلاف آپریشن کر ڈالا۔ اِس آئین شکن اقدام کے خلاف عوام کی طرف سے زبردست تحریکِ مزاحمت شروع ہوئی جو دو برسوں پر محیط رہی۔ فروری 2008ء کے انتخابات کے بعد جنرل پرویز مشرف کے مواخذے کا شور اُٹھا اور اِس مہم سے خوفزدہ ہو کر وہ صدارت سے مستعفی ہو گئے اور اُنہیں گارڈ آف آنر پیش کر کے ملک سے رخصت کر دیا گیا۔ چند سال گزر گئے‘ تو اُنہیں ”سٹیٹس کو“ کا حصار توڑنے اور انتخابات میں حصہ لینے کا شوق چُرایا۔ وہ آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی کے مشورے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پاکستان آ گئے جہاں عدالتوں میں اُن کے خلاف مقدمات پہلے سے دائر تھے۔ دریں اثنا عدالتِ عظمیٰ یہ فیصلہ دے چکی تھی کہ نومبر 2007ء کی ایمرجنسی پلس کے واحد ذمے دار جنرل پرویز مشرف ہیں اور وفاقی حکومت کو اُن کے ٹرائل میں پیش قدمی کرنی چاہیے۔ عدالتی ہدایات کی روشنی میں اور آئین کے عین مطابق خصوصی عدالت قائم کرنے کا فیصلہ ہوا اور جج صاحبان کے تقرر میں مشاورت کے لیے معاملہ چیف جسٹس آف پاکستان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ اُنہوں نے پانچ ہائی کورٹس کے چیف جسٹس صاحبان سے موزوں نام طلب کیے جو وفاقی حکومت کو پہنچا دیے گئے۔ وزیراعظم نے اُن میں سے تین جج صاحبان پر مشتمل خصوصی عدالت قائم کی اور وفاقی حکومت کی طرف سے سنگین غداری کا مقدمہ دائر کر دیا گیا‘ مگر کمانڈو جنرل اُس کے سامنے پیش ہونے کے بجائے راہِ فرار اختیار کیے ہوئے ہیں۔

☆

وزیراعظم نواز شریف نے بار بار کہا ہے کہ میرے اور میرے خاندان سے جو زیادتیاں پرویز مشرف نے کی ہیں‘ وہ میں نے معاف کر دی ہیں اور اب مقدمہ ریاست اور آئین کی طرف سے دائر کیا گیا ہے جس کے خلاف بغاوت کی گئی تھی۔ بغاوت کا مقدمہ چلانے کے تمام واقعات منطقی انداز سے آگے بڑھ رہے ہیں جن میں کسی بدنیتی‘ کسی تعصب اور کسی ذاتی انتقام کا ادنیٰ سا عنصر بھی شامل نہیں‘ لیکن جنرل مشرف کے حواری اس مقصد کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ خاکم بدہن ریاست ناکام ہو جائے‘ آئین بازیچۂ اطفال بن جائے‘ عدلیہ کی عزت اور ساکھ داؤ پر لگ جائے‘ فوج کئی حصوں میں تقسیم ہو جائے اور بیرونی ممالک پاکستان کے نظامِ انصاف میں دخل اندازی پر اُتر آئیں۔ اُن کے وکلا کی یہ سرتوڑ کوشش نظر آتی ہے کہ آرٹیکل 6 کے تحت آئین سے غداری کے مقدمے میں کوئی کارروائی ہونے پائے‘ نہ پرویز مشرف پر فردِ جرم عائد ہو سکے۔ اُن کی تمام تر قانونی موشگافیاں معاملے کو اُلجھانے اور زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنے کے لیے ہے۔ سابق آرمی چیف کے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

خلاف جو ٹرائل شروع ہوا ہے' اُس نے کئی چہرے بے نقاب کر دیے ہیں اور اُن کی جواں مردی اور آئین کے ساتھ وفاداری کا پول کھول دیا ہے۔ پرویز مشرف کہا کرتے تھے کہ میں کسی سے نہیں ڈرتا اور میں عدالتوں میں اپنے خلاف قائم شدہ مقدمات ختم کرانے آیا ہوں۔ اِن گرجتے دعوؤں کے مقابلے میں وہ انتہائی بزدل نکلے ہیں' عدالت میں پیشی کے خوف سے اُن کی حالت غیر ہو گئی ہے اور وہ ایک فوجی ہسپتال میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ سٹیٹس کو کا حصار توڑنے کا دعوے دار فوجی آمر اب ہر قیمت پر ملک سے باہر جانے کے لیے جتن کر رہا ہے۔ پہلے اُن کی طرف سے عدالت میں استدعا کی گئی کہ میں اپنی بوڑھی ماں سے ملنے دبئی جانا چاہتا ہوں' اس لیے میرا نام ای سی ایل سے نکال دیا جائے۔ پھر پینترا بدلتے ہوئے درخواست دی کہ مجھے اپنے علاج کے لیے بیرونِ ملک جانا ہے۔ اس مقصد کے لیے ٹیکساس سے ڈاکٹر ارجمند ہاشمی کا خط بھی منگوایا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ اُن پر بغاوت کے مقدمے کی بڑی ہیبت طاری ہے اور وہ بغاوت کا مقدمہ ختم کرانے اور ملک سے فرار ہونے کی راہیں تلاش کر رہے ہیں۔

پرویز مشرف نے اپنے معاملات میں فوج کو اُلجھانے کی بار بار مذموم کوشش کی ہے۔ آرمی چیف جنرل راحیل شریف سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ میں اس انتظار میں ہوں کہ وہ میرا کتنا ساتھ دیتے ہیں اور فوج مجھے کس قدر تحفظ فراہم کرتی ہے۔ اُن کے حاشیہ بردار تواتر سے یہ تاثر دیتے آئے ہیں کہ فوج اپنے سابق سربراہ کی تذلیل کسی طور برداشت نہیں کرے گی اور معاملے کے حد سے گزر جانے پر حکومت کا تختہ اُلٹ دے گی۔ جنرل راحیل شریف نے اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ فوج کو پرویز مشرف کے عدالتی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اے ایف آئی سی گئے' مگر فوج کے سابق سربراہ سے نہیں ملے جو وہاں زیرِ علاج ہیں۔ ممکن ہے کہ فوج کے ایک حلقے میں اُن کے لیے کچھ ہمدردی بھی پائی جاتی ہو' مگر غالب امکان یہ ہے کہ اُن کی غیر قانونی اور غیر پیشہ ورانہ حرکات نے فوج کے مورال اور امیج پر جو منفی اثرات مرتب کیے تھے اور افسروں اور جوانوں کے لیے وردی پہن کر باہر نکلنا بالکل محال ہو گیا تھا' فوج اپنے آپ کو اُن سے فاصلے پر رکھنا پسند کرے گی اور جنرل کیانی کی قیادت میں اُس کے عوام کے ساتھ جو خوشگوار تعلقات بڑی کاوشوں کے بعد قائم ہوئے ہیں' اس ''متاع'' کی وہ ہر قیمت پر حفاظت کرے گی۔ پھر یہ افواہ بھی پھیلائی گئی کہ سعودی عرب کے وزیرِ خارجہ جناب سعود الفیصل پرویز مشرف کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے پاکستان آ رہے ہیں' مگر ان شیخ چلیوں کی اُس وقت بڑی سبکی ہوئی جب ایک رپورٹر نے سعودی وزیر خارجہ سے مشرف کے بارے میں سوال کیا' تو انہوں نے بڑے معنی خیز انداز میں پوچھا ''کون مشرف؟'' بعد ازاں ڈوبتے ہوئے دل کو یہ کہہ کر ڈھارس دی گئی کہ ابوظہبی کے خلیفہ شیخ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بن النہیان ''مردِ آہن'' کو عدالت کے شکنجے سے نکالنے کے لیے رحیم یار خاں پہنچ رہے ہیں' لیکن یہ آس بھی یاس میں تبدیل ہو کے رہ گئی۔ پرویز مشرف نے برطانیہ میں اپنے کچھ وکلا کو مدد کے لیے پکارا تھا جنہوں نے مغربی سرپرستوں سے اپیل کی کہ جنرل صاحب نے نائن الیون کے بعد امریکہ کے سارے مطالبات چشمِ زدن میں تسلیم کرنے اور القاعدہ کے اہم قائدین کو امریکی تحویل میں دینے کی جو ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دی تھیں' اُن کے صلے میں اُن کی پشت پناہی کرتے ہوئے اُنہیں بغاوت کے مقدمے سے رہائی دلائی جائے۔

☆

خوش قسمتی سے برطانوی وکلا کی اپیل کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا' تاہم یہ بات غور طلب ہے کہ نام نہاد لبرل سوچ کے حامل دانش ور اور قانون دان اپنی سرگرمیوں اور کوششوں میں کس حد تک آگے جا سکتے ہیں۔ اُن کی طرف سے ایک ایسی ہیجانی کیفیت پیدا کرنے کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے جس میں عدلیہ کے ہر اقدام کو متنازع بنا دیا جائے اور ٹی وی ٹاک شوز میں یہ شور مچایا جائے کہ حکومت اور عدلیہ متعصب ہیں اور ذاتی انتقام پر اُتر آئی ہیں۔ اِس ضمن میں عاصمہ جہانگیر صاحبہ کی میڈیا سے مختصر گفتگو قومی ضمیر پر بہت شاق گزری ہے۔ وہ ایک جرأت مند اور جمہوریت پسند خاتون ہیں' مگر اُنہوں نے خصوصی عدالت کو کنگرو کورٹ کہہ کر عدلیہ کا مذاق اُڑایا ہے' ریاست اور آئین کے باغی کا ساتھ دیا ہے اور یہ پیش گوئی کی ہے کہ آئندہ ایک خونی فوجی انقلاب آئے گا جو دو عشروں پر محیط ہو گا۔ اُن کا یہ رویہ جمہوریت اور قانون کی روح سے متصادم اور اُن کے ذہنی خلفشار کا آئینہ دار ہے۔ اسی طرح احمد رضا قصوری وہ زبان استعمال کر رہے ہیں' جو اُن کے ذہنی عدمِ توازن کا غماز ہے۔ صحافیوں کو بھارت کا ایجنٹ قرار دینا اور اُن پر ''لفافے'' وصول کرنے کے سنگین الزامات عائد کرنا ظاہر کرتا ہے کہ پرویز مشرف کی ٹیم کے بعض ارکان اخلاق' تہذیبی اقدار اور حب الوطنی کے اعلیٰ جذبات سے تہی دامن ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگ اُن کی بے ہودگی سے تنگ آ کر حکومت سے یہ مطالبہ کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ پرویز مشرف کو باہر بھیج کر دردناک عذاب سے چھٹکارہ حاصل کر لیا جائے۔ کچھ حلقوں میں یہ رائے بنتی جا رہی ہے اور ٹی وی ٹاک شوز میں یہ تجویز کیا جا رہا ہے کہ فوجی آمر کا غرور ٹوٹ گیا ہے' اس کے کس بل نکل چکے ہیں' اس لیے بہتر یہی ہو گا کہ وہ عدالت میں پیش ہو کر معافی مانگ لیں اور اس بنیاد پر اُنہیں باہر جانے کی اجازت دے دی جائے تاکہ حکومت خوفناک رفتار سے دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے واقعات کے سدِ باب پر پوری توجہ دے سکے جو ہمارے قومی وجود کے لیے خطرہ بنتے جا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت اور عظمت پر ایمان رکھنے والے اربابِ بصیرت کو کامل یقین ہے کہ پرویز مشرف مکافاتِ عمل سے بچ نہیں سکیں گے اور اُنہیں پاکستان کا سیاسی شیرازہ بکھیر دینے' تہذیبی اقدار تباہ کرنے اور پورا قانونی اور

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

معاشرتی ڈھانچہ پاش پاش کر دینے کا حساب دینا ہوگا۔ آئین توڑنے والے کو منصفانہ ٹرائل کے ذریعے سزا دینے سے ہم پاکستان کو جمہوری طور پر محفوظ بنا سکیں گے اور اس آگ پر بھی قابو پالیں گے جو پرویز مشرف نے ہوسِ اقتدار میں بھڑکائی تھی اور دہشت گردی کے اسباب پیدا کیے تھے۔ وہ حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد کتوں کے پلے بغل میں دبائے ٹی وی پر نمودار ہوئے تھے اور نعرہ بلند کیا تھا کہ اُن کے آئیڈیل کمال اتاترک ہیں۔ اس بدصورت منظر سے دیندار طبقے کو یہ احساس ہوا کہ پاکستان سے اسلام کو جلد دیس نکالا ملنے والا ہے۔ پھر اُن کے عہد میں لاہور میں خواتین کی میراتھن ریس کا انعقاد کیا گیا جس نے مشرقی اقدار سے محبت کرنے والے شہریوں میں شدید اضطراب پیدا کیا تھا۔ 2005ء میں صدر بش کے دورے سے ایک رات پہلے جنوبی وزیرستان میں فوجی آپریشن کیا گیا جس میں عورتیں اور بچے بڑی تعداد میں جاں بحق ہوئے اور فاٹا میں کہرام مچ گیا۔ 2007ء میں لال مسجد اور جامعہ حفصہؓ میں عورتوں اور مردوں پر فاسفورس بم استعمال کیے گئے جس کے ردِعمل میں تحریکِ طالبان پاکستان وجود میں آئی جس نے ظلم کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کا اعلان کیا اور یوں دہشت گردی کے واقعات شدت اختیار کر گئے۔ ایک سال پہلے 2006ء میں نواب اکبر بگٹی کی شہادت نے بلوچستان میں علیحدگی پسندی کی تحریک میں جان ڈال دی اور پورا صوبہ آتش فشاں بن گیا۔ اتنے بڑے مجرم کو انصاف کے کٹہرے میں لانا وسیع تر قومی مفاد میں ازبس ضروری ہے۔ برطانیہ میں کرامویل کی لاش کو قبر سے نکال کر سزا دینے کے بعد پارلیمنٹ کے خلاف طاقت کے استعمال کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔

☆

وہ ممالک جنہوں نے اپنے معاملات دستور کے مطابق چلانے اور اُس کی حفاظت کے آداب سیکھ لیے ہیں' وہ طاقت کے سرچشموں سے فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ اُن میں قانون کی بالادستی بڑی آب و تاب سے قائم ہے۔ اچھی حکمرانی کے سارے لوازمات بروئے کار ہیں اور قابلِ اعتماد اور سبک رفتار' ڈیلیوری سسٹم کام کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں حکومت کی ترجیحات یکسر مختلف ہیں۔ عوام کو بروقت انصاف ملتا رہے' اُنہیں معاشرتی اور معاشی تحفظ حاصل ہو جائے اور ملکی وسائل سے جائز حصہ ملتا رہے' تو انتہا پسندی اور تشدد کے رجحانات معاشرے میں خلل ڈالنے اور فساد پھیلانے کا باعث نہیں بنتے۔ وزیراعظم نواز شریف نے بڑے کام کی بات کہی ہے کہ ہمیں وسائل کا رُخ عام آدمی کی طرف موڑ دینا ہوگا' مگر سوال اُٹھتا ہے کہ کیا بالادست طبقے ایسا ہونے دیں گے۔ اتنی بڑی تبدیلی محض خواہشات کی بنیاد پر ظہور پذیر نہیں ہوتی' اس کے لیے ایک منصفانہ اور شفاف نظام قائم کرنا لازم ہے۔ حکومت نے گزشتہ مہینوں میں نادرا کے چیئرمین طارق

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ملک اور اکاؤنٹنٹ جنرل طاہر محمود کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے' وہ قانون کی حکمرانی سے یکسر متصادم ہے۔ رات کے دو بجے برطرفی کے احکام گھر پر بھیجنا ایک ایسا بھونڈا اور اخلاق سے گرا ہوا اقدام تھا جس پر ذمے دار اشخاص کو عبرت ناک سزا ملنی چاہیے تھی۔ یہ جرم بھی دہشت گردی کے زمرے میں آتا ہے اور اس جرم کے بار بار ارتکاب سے اقتدار کے سرچشمے خشک ہو سکتے ہیں۔

مہذب معاشروں میں سیاسی جماعتیں عوام اور حکمرانوں کے درمیان مضبوط رابطوں کا کام کرتی ہیں اور اُنہیں سیاسی عمل میں شریک رکھتی ہیں۔ نچلی سطح تک منظم اور ہمہ وقت سرگرم سیاسی ادارے لوگوں میں بے چارگی اور بے تعلقی کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں جمہوریت محض نمائشی ہے اور سیاسی جماعتیں بڑی حد تک جمہوری عمل کے ثمرات سے محروم چلی آ رہی ہیں۔ وہ بالعموم حکمران خاندانوں یا چہیتوں کے گرد گھومتی رہتی ہیں۔ اُن کی سرگرمیوں اور فیصلوں میں عام آدمی کی آواز بہت کم شامل ہوتی ہے۔ زیادہ تر ہنگامہ انتخابات تک محدود رہتا ہے جن کے بعد حکمرانوں اور سیاسی کارکنوں میں رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ مرکز اور پنجاب میں حکمران جماعت کے دفتر تقریباً بند پڑے ہیں۔ بیوروکریسی عوام کے اندر کوئی جذبہ پھونک سکتی ہے نہ اُنہیں کسی بڑے مقصد کے لیے متحرک رکھ سکتی ہے۔ ملک پر دہشت گردی کی ہیبت طاری ہے اور سیاسی جماعتیں عضوِ معطل بنی ہوئی ہیں۔ حالانکہ یہ وقت عام شہریوں کو سنگین چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے تیار کرنے اور جذبوں میں صور پھونکنے کا ہے۔ سیاسی جماعتوں کی جدید خطوط پر تنظیم اور اُن کی قومی اور حکومتی معاملات میں پیہم اور مسلسل شرکت کے بغیر طاقت کے سرچشموں سے فیض یابی ناممکن دکھائی دیتی ہے۔

☆

اسلام کے نزدیک اقتدار ایک مقدس امانت ہے اور ہمارے دستور میں بھی یہی درج ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بے پایاں اختیارات بے پناہ کرپشن کو جنم دیتے ہیں۔ اُن کے درست استعمال کے لیے ذمے دار حکومتوں نے قابلِ عمل اور پائیدار نظام وضع کیے ہیں۔ پارلیمانی نظامِ حکومت میں ایگزیکٹو پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے' اُس سے طاقت حاصل کرتی ہے اور اُس میں ہونے والی کارروائی کے ذریعے عوامی اُمنگوں سے باخبر رہتی ہے۔ اُن کے مطابق پالیسیاں ترتیب دیتی ہے جنہیں کابینہ کے ذریعے نافذ کرتی ہے۔ اس طریق کار سے وزیراعظم اور اُن کی کابینہ کے عوامی نمائندوں سے تواتر کے ساتھ رابطے رہتے اور فکر و عمل کے نئے نئے زاویے اُبھرتے جاتے ہیں۔ اس مسلمہ روایت کے برعکس ہمارے وزیراعظم پارلیمنٹ کی کارروائی میں شریک ہونے سے گریزاں ہیں اور وہ اقتدار میں آنے کے بعد ایک بار بھی ایوان

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بالا میں نہیں گئے۔ نتیجہ یہ کہ عوامی نمائندوں اور اپنی جماعت کے کارکنوں سے کٹتے جا رہے ہیں اور اُن کا تمام تر انحصار بیوروکریسی پر ہوتا جا رہا ہے جس کے مضر اثرات ظاہر ہونے لگے ہیں۔ مسلم لیگ نون انتخابات میں ایک بہت بڑی جماعت کے طور پر اُبھری تھی، مگر جڑ سے لے کر اونچی شاخوں تک آکسیجن کے کم ہونے سے اُس کے پتے مرجھانے لگے ہیں اور خاندانی مفادات کی تنگنائے میں بند رہنے سے جوہرِ قابل سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ پوری کابینہ میں دستور اور قانون کی نزاکتوں سے واقف وزیرِ قانون ہی دستیاب نہیں جس کی وجہ سے قانون سازی کا عمل چیونٹی کی رفتار سے چل رہا ہے۔ حال ہی میں یہ عظیم نقصان بھی سامنے آیا ہے کہ وزارتِ داخلہ نے قومی سلامتی پالیسی کا جو ڈرافٹ پانچ سات ماہ کی محنت کے بعد کابینہ میں پیش کیا، تو اُس میں اتنے زیادہ قانونی سقم پائے گئے کہ وزیرِاعظم نے اُس پر غور و خوض ملتوی کر دیا اور اس کی درستگی کا کام جناب زاہد حامد کے سپرد کیا جن کے پاس پرویز مشرف کے زمانے میں وزارتِ قانون کا قلمدان تھا۔

وفاقی کابینہ کے اندر انتہائی حساس معاملات کے بارے میں شدید اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ ایک وزیر صاحب فرماتے ہیں کہ ریٹائرڈ جنرل قوم کا مجرم ہے اور اُس نے بیماری کا ڈھونگ رچا کر فوجی ہسپتال میں پناہ لے رکھی ہے۔ ایک دوسرے وزیر کا ارشاد ہے کہ پرویز مشرف کو واقعی دل کی تکلیف تھی جس کی اُنہوں نے بروقت اطلاع کر دی تھی۔ گویا وہ اُن کے لیے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ جناب اکرم شیخ ایڈووکیٹ جو بغاوت کے مقدمے میں پراسیکیوٹر مقرر ہوئے ہیں، وہ قانونی جنگ تنہا لڑ رہے ہیں جبکہ پرویز مشرف کو اٹھارہ رکنی ٹیم دستیاب ہے جس کے انداز بڑے جارحانہ ہیں۔ طالبان سے مذاکرات کیے جائیں یا جنگ، اس پر بھی جماعت میں یکسوئی کا فقدان ہے۔ مراقبے میں اور سیاسی تنہائی میں مستقبل کا حال معلوم کرنے والے ہمارے وزیرِ داخلہ نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ طالبان سے مذاکرات بھی مشکل ہیں اور جنگ دشوار تر ہے۔ جناب وزیرِاعظم نے مولانا سمیع الحق کے ذمے طالبان سے رابطے کرنے کا ٹاسک دیا مگر بعدازاں مڑ کر نہیں پوچھا کہ کامیابی کس قدر ہوئی ہے۔ وہ یہ کہہ کر مذاکرات کے عمل سے علیحدہ ہو گئے ہیں کہ وزیرِاعظم نے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔ حالات ایک انتہائی کٹھن وادی میں داخل ہو گئے ہیں جبکہ حکومت سیاسی اور پارلیمانی قوت سے کنارہ کش ہوتی جا رہی ہے جو آج کے دور میں طاقت کے عظیم الشان سرچشمے تصور ہوتے ہیں۔

☆

عوام کے اندر بڑھتی ہوئی بے چینی، دہشت گردی اور شدت پسندی کے خوں آشام واقعات، کراچی پر جرائم پیشہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

عناصر کی یلغار' مستونگ میں فرقہ وارانہ تشدد کی لہر' بنوں گیریژن میں ایف سی جانبازوں کی شہادتیں اور شمالی وزیرستان میں فوج کا ٹارگٹڈ آپریشن' اِس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ خونی معرکہ گرم ہو چکا ہے اور ہمیں ایک سخت امتحان سے گزرنا ہے۔ دراصل جنرل پرویز مشرف نے امریکہ کی جنگ ہم پر مسلط کر کے ملک میں بدامنی کا جو بیج بویا تھا' وہ نفرتوں' خونریزیوں اور ہلاکتوں کا تن آور درخت بن چکا ہے اور خاص مائنڈ سیٹ وجود میں آچکا ہے۔ دہشت گردی میں طالبان کے علاوہ نسلی' لسانی اور فرقہ وارانہ عصبیتیں اور طاقتیں شامل ہو گئی ہیں جو جدید ترین اسلحے اور کمیونی کیشن نیٹ ورک سے لیس ہیں۔ غالباً کچھ بیرونی عناصر بھی اُن کی پشت پر ہیں۔ ایسے میں ہر قدم اُٹھانے سے پہلے اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی کرنا اور فیصلہ ساز اور قانون نافذ کرنے والے اداروں میں غیر معمولی نوعیت کی کوآرڈینیشن درکار ہے اور اس نازک ترین مرحلے میں حکومت اور فوج کے درمیان ہم آہنگی اور کامل یکسوئی ہر پہلو سے نہایت کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ تمام سیاسی اور دینی جماعتوں کی مشترکہ اور مربوط کوششوں سے بقا کی جنگ یقیناً جیتی جاسکتی ہے۔

اس مطلوبہ مقصد کے لیے وزیراعظم کو قائدانہ کردار ادا کرنا اور وقت سے آگے چلنا ہو گا۔ اِس آن فیصلہ سازی کا عمل بہت مایوس کن ہے جبکہ فوج کے افسر اور جوان شہید ہو رہے ہیں اور اُس کے ہم وطن شدت پسندی کا شکار ہیں۔ کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اِس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا ہے جس کی شمالی وزیرستان میں ٹارگٹڈ آپریشن غمازی کر رہا ہے' تاہم عسکری قیادت کو اِس امر کا احساس کرنا ہو گا کہ گوریلا جنگ میں فیصلہ کن محرکات کی نوعیت بڑی مختلف ہے۔ قومی قیادت کو اپنے تمام وسائل جمع کر کے اور تمام تر توانائی اور دانش مندی کے ساتھ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ دہشت گردوں کو معاشرے میں پذیرائی نہ ملنے پائے اور عوام کے اندر اُن سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ فزوں تر ہوتا جائے۔ ہنگو اسکول کے نوجوان طالب علم اعتزاز حسن نے جاں نثاری کی ایک لازوال اور تابناک مثال قائم کی ہے۔ اُسے بہادری اور شجاعت کا اعلیٰ ترین قومی ایوارڈ ملنا چاہیے کہ اِس سے تحریکِ مزاحمت برگ و بار لائے گی اور دہشت گردوں کے لیے بستیوں میں پناہ لینا پہلے کے مقابلے میں تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔ ہماری مسجدوں' ہماری دانش گاہوں' ہمارے وکلا اور صحافیوں کی تنظیموں سے یہ آواز بلند سے بلند تر ہونی چاہیے کہ طالبان کی تعبیرِ دین اور انسانوں کا قتل اسلام کے بنیادی اصولوں سے بغاوت ہے۔ یہ پیغام سیاسی اور دینی جماعتیں اور میڈیا کے نمائندے اور پارلیمنٹ کے ارکان ہی سرانجام دے سکیں گے۔ اس آن قومی قیادت کو بے خطر آتشِ نمرود میں کود جانا اور قوم کو طاقت کے سرچشموں سے سیراب کرنا ہو گا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ہر گھر اور لائبریری کے لیے اہم کتابیں

پاکستان ایٹمی طاقت کیسے بنا؟	میاں عبدالوحید	580
بلوچستان کا مسئلہ۔ بلوچ قوم پرستی کا ایک جائزہ	عنایت اللہ بلوچ	700
بلوچستان۔ آزادی سے صوبائی بے اختیاری تک	احمد سلیم	590
پاکستان سے بنگلہ دیش۔ ان کہی جدوجہد	شریف الحق دالیم	580
پاکستان کا مستقبل	سٹیفن پی۔ کوہن	200
جو میں نے دیکھا (پاکستانی سیاست و حکمرانی کی اندرونی کہانی)	راؤ رشید	320
پاکستان میں جمہوریت کے تضادات	سلمان عابد	490
غیر مقدس جنگیں (Unholy Wars)	جان کے۔ کولی	490
ورلڈ آرڈر کی حقیقت	نوام چومسکی	450
سرکش ریاستیں	نوام چومسکی	450
ریاستی دہشت گردی	نوام چومسکی	450
اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی	اسرائیل شحاک / نارٹن میز	250
شہباز شریف۔ سیاست اور عمل	چودھری محمد اخلاق	600
عالمی بینکاروں کی دہشت گردی۔ سرمائے کے آقا	فرخ سہیل گوئندی	180
اسلام کا معاشی نظام اور تحریک پاکستان	شیخ محمد رشید	125
لاہور۔ تاریخ و تعمیر	رضوان عظیم	280
کامی کازی ڈائری۔ جاپانی خودکش طلبا کے تاثرات	امیکو اونوکی تیرنے	450
امریکہ کی عوامی تاریخ	ہاورڈ زن	600
تاریخ سلطنتِ عثمانیہ۔ سلیمان عالیشان	ہیرالڈ البرٹ لیمب	520
تاریخ سلطنت مغلیہ۔ ظہیر الدین بابر۔ عظمت کی ابتدا	ہیرالڈ البرٹ لیمب	385
صلیبی جنگوں کی تاریخ۔ غازیِ اسلام۔ صلاح الدین ایوبی	ہیرالڈ البرٹ لیمب	590
تاریخ گلگت	ڈاکٹر امر سنگھ چوہان	390
ٹیپو سلطان، مزاحمت اور جدیدیت کی داستان	عرفان حبیب	200
استنبول (تاریخی و رومانی شہر)	جے اے کڈن	450
قانون دانِ اقبال	ظفر علی راجا ایڈووکیٹ	860
حیات قائداعظم	ہیکٹر بولیتھو	580
مہاراجہ پورس، سکندر اعظم کے حملے اور پورس کی مزاحمت کی داستان	بدھا پرکاش	150
مسلمان اندلس میں	سٹینلے لین پول	250
اکہتر کے وہ دن (مشرقی پاکستان کے آخری 9 ماہ)	جہاں آرا امام	500
میرا لہو۔ ذوالفقار علی بھٹو۔ سیاست و شہادت	فرخ سہیل گوئندی	500
عمران خان۔ فسانہ یا حقیقت	فرینک حضور	680
جنگل میں منگل (ناول)	انیس احمد	460
ایک ترک خاندان (ناول)	عرفان اورگا	400
گرفتار نغموں کی رہائی (کرد ترک تاریخ پر لکھا گیا ناول)	اویا بیدر۔ مترجم: ہما انور	580
سمرقند (معروف لبنانی ادیب کا تاریخی ناول)	امین معلوف	425
بوئے گل (معروف ترک ادیب کا عالمی شہرت یافتہ ناول)	یشار کمال	480
انجام بہاراں (مایہ ناز ترک ادیبہ کا ناول)	عدالت آغاوغلو۔ مترجم: ہما	450
فاطمہ گل۔ آخر میرا قصور کیا؟ (ناول)	ودات ترکالی	250
کنیز۔ عثمانی سلطان کی حقیقی داستانِ عشق (ناول)	گل اری پلو	390
کرفیو۔ ترکی کے تیسرے مارشل لاء کے ایام کی روداد (ناول)	عدالت آغاوغلو۔ مترجم: ہما	580
کنجری کا پل (ناول)	یونس جاوید	340
ناظم حکمت کے ساتھ جیل	اورحان کمال	390
باپ کا گھر — معروف ترک ادیب کا ناول (ناول)	اورحان کمال	250
بیکار کے مہ و سال (ناول)	اورحان کمال	250
جمیلہ (ناول)	اورحان کمال	250
بیرک 72 کے قیدی (ناول)	اورحان کمال	250
یادوں کی بارشیں (شاعری)	نگل صابری	550
روشنیوں کے رنگ (شاعری)	نگل صابری	500
جدید ترکی میں اسلام ([illegible])	مصنفہ: شکر آواحدی	550
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	360
مجید امجد کی داستان محبت	ڈاکٹر وزیر آغا	200

ہر بک سٹال پر دستیاب

ایک فون کال پر گھر بیٹھے بذریعہ وی پی کتاب حاصل کیجئے

جمہوری پبلیکیشنز۔ 2۔ ایوانِ تجارت روڈ، لاہور 042-36314140

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

TENDER NOTICE

1. Punjab Workers Welfare Board, Lahore invites sealed Tenders (Technical and Financial) from eligible bidders for the supply of following Summer & Winter Uniform for the year 2013-14 for the students of Workers Welfare Schools in Punjab under Rule 36(B), "Single stage two envelope bidding procedure" of PPRA:

Sr. No.	Detail of required Uniform Items	Total No. of uniform Items	
		Summer	Winter
1	White Shirt (Boys)	39233	20675
2	Shalwar /Qameez with Band (Girls)	37606	17272
3	Trousers Grey (Boys)	23535	18675
4	Socks Grey (Boys & Girls)	71101	34600
5	Full Sleeve Sweater Grey (Boys)	-	18613
6	Half Sleeve Sweater Grey (Boys)	-	17766
7	Cardigan Grey (Girls)	-	16440
8	Half Sleeve Sweater Grey (Girls)	-	16366

2. Bid documents containing detailed terms & conditions, specifications and tentative quantity of required Summer & Winter Uniform Items (Boys & Girls) will be issued from the office of the undersigned at Punjab Workers Welfare Board, F-A/I Khyber Block, Allama Iqbal Town, Lahore uptill **07.02.2014** during office hours at the payment of Rs.1000/- non refundable.

3. All the technical and financial bids must be delivered to the office of the undersigned on or before 10:00 hours on **10.02.2014** out of them technical bids will be publicly opened in the Committee Room of Punjab Workers Welfare Board, F-A/I Khyber Block, Allama Iqbal Town, Lahore Pakistan, **at 1100 hours, on same day i.e. 10.02.2014** in presence of the authorized representatives of the participating firms/companies.

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

4. All financial bids must be accompanied by a call deposit (CDR) of two percent (2%) of total bid amount as bid security which will be sealed in presence of the representatives of the firms / companies and will be opened subject to qualification of the firms / companies as per criterion mentioned in the bid document and specifications.

5. Tenderers/Companies shall submit tender, which comply with tender Documents. Alternative Bids will not be considered.

6. Financial tenders of those firms / companies will be opened whose technical proposals found responsive and obtain 70% marks of the evaluation criteria as mentioned in the bid document and subject to the Lab. results of the samples of uniform items according to their technical specifications as mentioned in the tender document and according to specimen of Punjab Workers Welfare Board.

7. Punjab Workers Welfare Board, Lahore will not be responsible for any costs or expenses incurred by bidders in connection with the preparation or delivery of bids.

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

8. The procurement of Summer & Winter Uniform Items (Boys & Girls) will be carried out in accordance with PPRA Rules 2009 (Amended).

9. Tender Notice will also be available on PPRA **Website www.ppra.punjab.Gov.Pk. and Punjab Workers Welfare Board website www.pwwb.com.pk**

10. A pre-bid/tender meeting will be held on **03.02.2014 at 11:00** am in the Committee Room of the Punjab Workers Welfare Board, F-A/1, Khyber Block, Allama Iqbal Town, Lahore so that procedure and specifications of uniform items could be well discussed in order to procure the standardized items.

11. Successful bidders have to furnish Performance Guarantee @ 8% (including 2% earnest money) of the contract value in the shape of CDR before the award of contract alongwith signing of Performance Security (on Stamp Paper value of Rs. 100/) as given in the bid document. Failure to supply items within the stipulated time period will invoke penalty as specified in penalty clauses of this document. In addition to that, amount of performance guarantee/bid security (CDR) will be forfeited, besides blacklisting of the company / firm.

12. Supply of Summer & Winter Uniform Items of said tenders will be carried out in Workers Welfare Schools in Punjab mentioned in bid document.

IPL-800

Director Education
Punjab Workers Welfare Board,
F-A/I Khyber Block,
Allama Iqbal Town, Lahore.

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

یہی احساسات میری زندگی کا حاصل ہیں

جفائے دوست کی لذت کو غیر کیا جانے

راحت بشیر

اللہ جو کہ میرا آقا ہے، مالک ہے۔ صرف میرا ہی نہیں بلکہ تمام کائنات کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہے۔ ایسا آقا مالک جس نے اپنی سجی سجائی دنیا میں مجھ ناچیز کو صرف اس لیے بھیج دیا کہ بن دیکھے میری یہ بندی میرا کتنا کہنا مانتی ہے۔

میں اور میرا اللہ

اگرچہ میرا اور اللہ کا تعلق آقا اور باندی کا سا ہے، لیکن سچ پوچھیں تو اس باندی کا سا ہرگز نہیں جو آقا کی بزرگی و برتری کو حقیقی طور پر تسلیم کرتے ہوئے اور خود کو اس کا محتاج سمجھتے ہوئے اس کے لگے بندھے اصولوں کی پابند ہوتی ہے اور اپنے آقا کی حلیمی و بردباری سے زیادہ اس کے غضب سے گھبراتی ہے کہ مبادا کوئی ایسا کام، کوئی ایسی حرکت ہو جائے جس سے میرے مالک کا اعتماد ہمیشہ کے لیے اُٹھ جائے اور وہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دھتکار دے، بلکہ اس بندی کا سا محسوس کرتی ہوں جو اسے بزرگ و برتر اور خود کو اس کا محتاج سمجھتے ہوئے بھی اس کے اصولوں کی پابندی اپنی مرضی کا خیال رکھتے ہوئے کرتی ہے اور اس کی مرضی کے بغیر بہت سے اصول، جن کی پابندی کرنے کو جی نہیں چاہتا، اپنے مالک کی حلیمی و بردباری کی صفت کی نذر کر دیتی ہے۔

دل میں خلش بدستور رہتی ہے، لیکن یہ سوچ اس خلش کو زائل کر دیتی ہے کہ یہی تو سنہری موقع ہے اللہ کی اس صفت سے فائدہ اُٹھانے کا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اللہ کے غضب سے نہیں ڈرتی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اللہ کی غفور الرحیمی، اُس کی قہاری و جباری کی نسبت محسوسات پر زیادہ طاری رہتی ہے۔

بارش، گرج، چمک، آندھی جیسی تنبیہات کی صورت میں بھی ڈر کے ساتھ ساتھ یہی احساس شدت اختیار کر جاتا ہے کہ میرا رحیم و شفیق اللہ میری اس خود ساختہ غفلت کے پردے کو چاک کرنے کا احساس دلا رہا ہے جو میں نے دنیا کی خوشیوں کی خاطر خود پر طاری

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کی ہوئی ہے اور اس طرح ایک نئے عزم کے ساتھ جواب دہی کی تیاری شروع کر دیتی ہوں۔

اسی طرح وقتاً فوقتاً اپنے مالک کی نظرِ التفات خود پر محسوس کرتی ہوں، جو کبھی غم و تفکرات کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس لیے ان حالات میں اللہ کی یاد اور بندگی کا جو سرور محسوس کرتی ہوں، وہ عام دنوں میں کہاں نصیب ہوتا ہے۔ سوچتی ہوں، اسی لیے اللہ اپنے پیارے بندوں کو آزمائشوں میں مبتلا رکھتا ہے کہ اس کے ساتھ ان کے روحانی تعلق میں کسی طور فرق نہ آنے پائے۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو آزمائش کی ان بھٹیوں سے کندن بن کر نکلیں۔ اور کتنا پیارا ہے وہ آقا جو اپنے بندوں کو اصلاحِ احوال کے مواقع عطا کرتا ہے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ کوئی ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر سرخرو ہو جاتا ہے اور کوئی اِن مواقع کو خاطر ہی میں نہیں لاتا اور خود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدقسمت بنا لیتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ ان مواقع سے فائدہ بھی تو وہی اٹھا سکتا ہے جو اللہ سے اس کی توفیق طلب کرے۔ اس لیے کہ انسان خود کچھ نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ اللہ نہ چاہے اور اللہ ہر شخص کو ہدایت دینا چاہتا ہے، اسی لیے تو ایسے حالات سے دوچار کرتا ہے، لیکن ہم جلد بازی میں اللہ سے مدد طلب کیے بغیر، اس کی مرضی و رضا کو مدنظر رکھے بغیر اپنے طور پر ان حالات سے نپٹتے ہیں اور نتیجتاً کبھی کامیاب ہوتے ہیں کبھی ناکام۔ ادھر اللہ ہماری اس کامیابی و ناکامی سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہم نے اُسے اہمیت نہ دے کر ناراض کر دیا ہوتا ہے۔ بعد میں اگرچہ توبہ و استغفار کے ذریعے اپنی اس غلطی کی معافی مانگ لیتے ہیں، اس امید کے ساتھ بلکہ یقین کے ساتھ کہ اللہ معاف کرتا ہے اور اس حسنِ ظن کے بل بوتے پر غلطیوں پر غلطیاں کرتے ہیں اور توبہ پر توبہ کرتے ہیں اور پھر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

پھر بھی جس چیز کی خواہش ہوتی ہے اسی سے طلب کرتے ہیں۔ اپنی قسمت کا بنانے والا اسی کو مانتے ہیں۔ خواہش پوری ہو جائے فبہا، ورنہ بصورتِ دیگر قسمت کی حقانیت کا تصور زبان گنگ کر دیتا ہے اور پھر یہ حدیث بھی دل کو بڑی تسلّی دیتی ہے کہ اللہ اپنے بندے کی دعا یا تو فوراً قبول کر لیتا ہے یا اس کے بدلے اس پر آنے والی مصیبت ٹال دیتا ہے اور یا پھر آخرت کے لیے اجر محفوظ کر لیتا ہے۔

اتنا بڑا خیر خواہ میرا پیارا اللہ جب کسی صورت ہمارے لیے برا نہیں کرتا، تو پھر اس سے خوب کیوں نہ مانگیں؟ لہٰذا میں تو ہر ہر بات، ہر ہر خواہش اور ہر ہر مشکل اپنے خدا کے سامنے رکھ دیتی ہوں اور اللہ سے توفیق طلب کرتی ہوں کہ وہ مجھے اپنی قسمت پر صابر و شاکر رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

پھر اس سے بڑھ کر ایک اور احسان جو اللہ کا خود پر محسوس کرتی ہوں وہ یہ ہے کہ اس نے مجھے دینِ اسلام کا صحیح شعور عطا فرمایا۔ آج میں اطاعت کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک ایسے گروہ سے بھی منسلک ہوں جو خود نیک بننے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی نیکی کی طرف راغب کرنے کے لیے کوشاں ہے۔

یہ ہیں وہ احساسات جو میں اللہ کے بارے میں رکھتی ہوں۔ بعض اوقات تو یہ شدت اختیار کر جاتے ہیں اور بعض اوقات خفیف سا تصور رہ جاتا ہے، لیکن یہی احساسات میری زندگی کا حاصل ہیں۔ اللہ تعالیٰ میرے ان احساسات کو میرے عمل کے تیز تر ہونے میں مددگار بنا دے۔ آمین ثم آمین!

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بے سکونی کے سمندر میں سکون کا جزیرہ

ریت کے ذرات کے برابر بھی گناہوں کی معافی کا ایک سبب ہے

ذکرِ الٰہی

ذکر کو معمولات زندگی میں یوں لائیے
کہ پھر یہ عادت کمزور نہ پڑے

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

ذکرِ الٰہی انوار کی کنجی ہے' بصیرت کا آغاز ہے' جمال فطرت کا اقرار ہے۔ یہ حصول علم کا جال ہے۔ یہ تماشا گاہِ ہستی کی جلوہ آرائیوں اور حُسن آفرینیوں کا اقرار ہے۔ ذاکر کے ذکر میں اور زاہد کے فقر میں خالقِ آفاق کی جھلک نظر آتی ہے۔ ذکرِ الٰہی دراصل خالق حقیقی سے رابطے کی ایک شکل ہے۔

سورۃ عنکبوت کی آیت 45 میں ارشاد ربانی ہے:

''اور یقین کرو کہ اللہ کا ذکر ہر چیز سے بزرگ تر ہے۔''

اللہ کے ذکر میں نماز' تلاوتِ قرآن حکیم' دعا اور استغفار سب شامل ہیں۔ بقول حافظ ابن قیم (بحوالہ مدارج السالکین) ذکر اللہ کی بڑی عظمت اہمیت اور برکات ہیں۔ ذکر الٰہی سے اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے اور انسان کی روحانی ترقی ہوتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ جہاں اللہ کا ذکر ہوتا ہے اُس جگہ کو فرشتے گھیر لیتے ہیں (صحیح مسلم)۔ بخاری شریف میں بحوالہ حضرت ابوہریرہؓ درج ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس وقت بندہ میرا ذکر کرتا ہے اور میری یاد میں اس کے ہونٹ حرکت کرتے ہیں تو اس وقت میں اپنے اس بندہ کے ساتھ ہوتا ہوں'' ۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس دنیا کی وہ تمام چیزیں جن پر سورج کی روشنی اور اس کی شعاعیں پڑتی ہیں' ان سب چیزوں کے مقابلے میں مجھے یہ زیادہ محبوب ہے کہ میں ایک دفعہ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہوں ۔''

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسے درخت کے پاس سے گزرے جس کے پتے سوکھ چکے تھے ۔ آپؐ نے اس پر اپنا عصا مبارک مارا تو اس کے سوکھے پتے جھڑ پڑے ۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''یہ کلمے: سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر بندے کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتے ہیں جس طرح تم نے اس درخت کے پتے جھڑتے دیکھے۔''

قرآن حکیم میں بھی ارشاد ہے: ''یقینی بات ہے کہ نیکیاں گناہوں کا صفایا کر دیتی ہیں۔''

اگر ریت کے ذرات کے برابر بھی گناہ ہوں تو ذکر الٰہی سے معاف ہو جاتے ہیں ۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے روزانہ سو دفعہ سبحان اللہ وبحمدہ کہا اس کے قصور معاف کر دیے جائیں گے اگرچہ کثرت میں سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں'' ۔ حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کلاموں میں کون سا کلام افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وہ کلام جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ کے لیے منتخب فرمایا یعنی سبحان اللہ وبحمدہ ۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سب سے افضل ذکر لا الہ الا اللہ ہے۔''

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو بندہ خلوص دل سے کہے لا الہ الا اللہ اس کے لئے لازماً آسمانوں کے دروازے کھل جائیں گے ۔ یہاں تک کہ وہ عرشِ الٰہی تک پہنچے گا ۔ بشرطیکہ وہ آدمی کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے۔''

ترمذی شریف میں ایک اور حدیث ہے: ''کلمہ لا الہ الا اللہ کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ۔ یہ کلمہ سیدھا اللہ کے پاس پہنچتا ہے۔'' حضرت شاہ ولی اللہ اپنی شہرہ آفاق کتاب (حجتہ اللہ البالغہ) میں ارشاد فرماتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تین خواص ہیں: (۱) یہ کلمہ شرکِ جلی کو ختم کرتا ہے۔ (۲) یہ کلمہ شرکِ خفی کو بھی ختم کرتا ہے۔ (۳) یہ کلمہ حصولِ معرفت اور قربِ الٰہی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

امام بغویؒ (شرح السنہ) میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ اے میرے رب مجھے کوئی کلمہ تعلیم فرما جس کے ذریعے میں تیرا ذکر کروں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ! لا الٰہ الا اللّٰہ کہا کرو۔ انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب! یہ کلمہ تو تیرے سارے ہی بندے کہتے ہیں' میں تو وہ کلمہ چاہتا ہوں جو آپ خصوصیت سے مجھے ہی بتائیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور میرے سوا وہ سب کائنات جس سے زمین کی آبادی ہے اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور لا الٰہ الا اللّٰہ دوسرے پلڑے میں تو لا الٰہ الا اللّٰہ کا وزن ان سب سے زیادہ ہوگا۔''

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر لحظہ اور لمحہ اللہ کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔ ابن ماجہ نے لکھا ہے کہ حضرت ربیعہ بن کعب اسلمیؓ رات کو آپ کے آستانہ اقدس پر پہرہ دیتے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ کی تسبیح اور تہلیل کی آواز سنتے سنتے میں تھک جاتا تھا اور مجھے نیند آجاتی تھی۔ بقول علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ (سیرت النبیؐ: جلد سوم صفحہ ۱۵۸)۔

''اُٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے' کھاتے پیتے' سوتے جاگتے' وضو کرتے' نئے کپڑے پہنتے' سوار ہوتے' سفر میں جاتے' واپس آتے' گھر میں داخل ہوتے' مسجد میں قدم رکھتے' غرض ہر حالت میں دل و جان ذکر الٰہی میں مصروف رہتے۔''

آپؐ سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل ادا فرماتے۔ سواری کا جانور جدھر چل رہا ہوتا آپؐ ادھر ہی چہرہ مبارک کر کے نماز کی نیت فرما لیتے۔ اس کی پروا نہیں فرماتے تھے کہ قبلہ کی طرف رُخ مبارک ہے یا نہیں۔ آپؐ میدانِ جنگ میں بھی یادِ الٰہی سے غافل نہیں رہتے تھے۔ بدر کے غزوہ میں خشوع وخضوع سے دونوں ہاتھ پھیلا کر بارگاہِ ایزدی میں دعا کر رہے تھے۔ اس بے خودی کے عالم میں ردائے مبارک کندھے سے گر پڑتی ہے اور حضورؐ کو خبر تک نہیں۔ حضرت علیؓ تین مرتبہ میدان جنگ میں حاضر ہوتے ہیں اور ہر دفعہ یہ دیکھتے ہیں کہ پیشانی مبارک زمین پر ہے۔

دور حاضر میں بے سکونی کی کیفیت ذکر الٰہی سے بہتر بنائی جا سکتی ہے۔ اہل مغرب کے ہاں خودکشیاں روحانیت سے فرار کی وجہ سے ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں بھی بے سکونی یادِ الٰہی سے غفلت کی وجہ سے ہے۔ نت نئی جسمانی اور نفسیاتی بیماریاں یادِ الٰہی سے غفلت کی وجہ سے ہیں۔ بلاشبہ ذکر الٰہی دلوں کو سکون بخشتا ہے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ثوبانؓ کیوں اُداس تھے

آنحضور ﷺ نے ان کی بات سن کر آنکھیں کیوں بند کرلی تھیں

سیرت رسول ﷺ کا انسانی پہلو

سید عاصم محمود

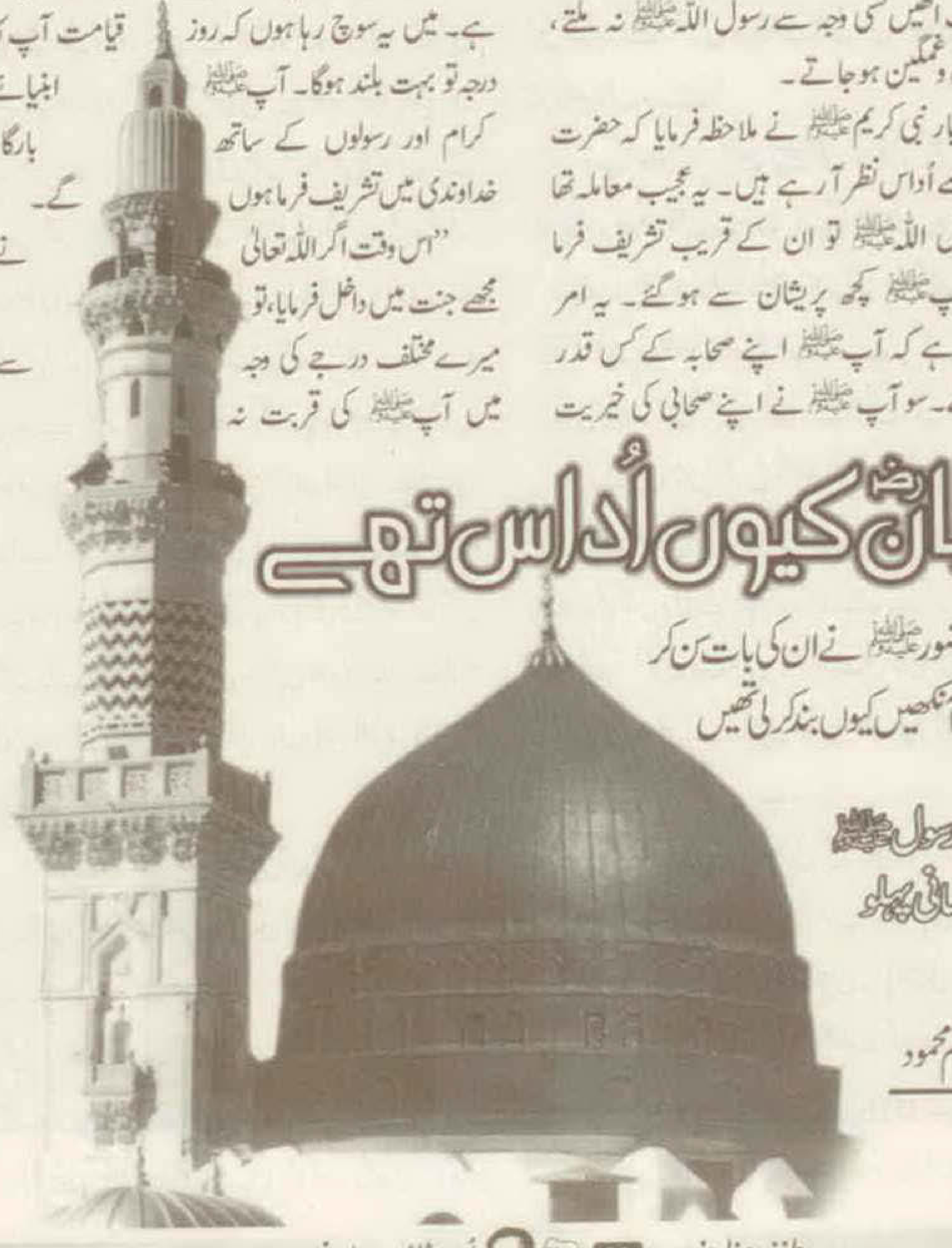

حضرت ثوبانؓ کا شمار اصحاب الصفہ میں ہوتا تھا۔ آپ ایک آزاد کردہ غلام تھے۔

حضرت ثوبانؓ کو حضور اکرم ﷺ سے بہت عقیدت والفت تھی۔ آپ ﷺ بازار میں ہوتے یا مسجد تشریف لے جاتے، حضرت ثوبانؓ کو سعادت مندی سے آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے دیکھا جاتا۔ جب انھیں کسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نہ ملتے، تو وہ اُداس و غمگین ہوجاتے۔

ایک بار نبی کریم ﷺ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت ثوبانؓ خاصے اُداس نظر آرہے ہیں۔ یہ عجیب معاملہ تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ تو ان کے قریب تشریف فرما تھے۔ سو آپ ﷺ کچھ پریشان سے ہوگئے۔ یہ امر عیاں کرتا ہے کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کے کس قدر نزدیک تھے۔ سو آپ ﷺ نے اپنے صحابی کی خیریت دریافت فرمائی۔

حضرت ثوبانؓ گویا ہوئے: ”رسول خدا ﷺ! آپ پریشان مت ہوں میری طبیعت غیر ہے۔ دراصل جب میں آپ ﷺ سے جدا ہوتا ہوں، تو پھر اگلے دن ہی آپ ﷺ کا چہرہ مبارک نظر آتا ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ روز قیامت آپ کا درجہ تو بہت بلند ہوگا۔ آپ ﷺ انبیائے کرام اور رسولوں کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں تشریف فرما ہوں گے۔

”اس وقت اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت میں داخل فرمایا، تو میرے مختلف درجے کی وجہ سے میں آپ ﷺ کی قربت نہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پاسکوں گا۔ کیونکہ تب یقیناً آپ ﷺ کا درجہ میرے درجے سے بلند ہوگا اور اگر رب تعالیٰ نے مجھے جہنم میں داخل فرمایا، تو تب بھی ہماری ملاقات نہیں ہوسکے گی۔"

جب نبی کریم ﷺ نے حضرت ثوبانؓ کی یہ گفتگو سنی، تو خاموش ہوگئے اور آنکھیں بند کرلیں۔ تبھی حضرت ثوبانؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کو احساس ہوا کہ آپ ﷺ پر وحی نازل ہورہی ہے۔ سو وہ بے تابی سے آپ ﷺ کے کلام کا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد رسول اللہ ﷺ نے آنکھیں کھولیں، تبسم فرمایا اور حضرت ثوبانؓ کو یہ خوش خبری سنائی کہ وہ جنت میں آپ ﷺ کے قریب ہی ہوں گے۔

دراصل اس موقع پر درج ذیل آیت نازل ہوئی:

"جو لوگ خدا اور اس کے نبی ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں، وہ (روز قیامت) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل کیا، یعنی انبیائے کرام، صدیق (حق گو) شہید اور نیک لوگ اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی خوب ہے۔"

(سورہ النساء۔ 69)

یہ واقعہ ہمارے سامنے دو بڑے اہم پہلو لاتا ہے۔ اول یہ کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے احکامات پر چلیں، نیک زندگی گزاریں، تو ہمیں اطمینان ہونا چاہیے کہ روز حشر ہمیں انتہائی برگزیدہ ہستیوں کا قرب ملے گا۔ دوم یہ واقعہ حیات نبی کریم ﷺ کا انسانی رُخ بخوبی اُجاگر کرتا ہے جس پر مسلمان عموماً توجہ نہیں دیتے۔

کامل انسان

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو اپنا پیغمبر مقرر فرمایا۔ لیکن کمال درجے کی بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ذات اعلیٰ کامل ترین انسانی کردار کا بہترین و آئیڈیل نمونہ ہے۔ وجہ یہی ہے کہ عمر بھر رسول اللہ ﷺ کی یہی سعی رہی کہ مسلمانوں اور بہ حیثیت مجموعی انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم رہیں۔

آپ ﷺ دور بین تھے اور مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات بہت پہلے جانچ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی وحی اس فطری خوبی پہ مستزاد تھی۔ انہی خوبیوں کے باعث آپ ﷺ لوگوں کے جذبات فوراً سمجھ جاتے اور کوشش فرماتے کہ ان کے دماغ نہیں دل جیتے جائیں۔ آپ ﷺ کا انسانی جذبات کی نبض پر ہاتھ ہوتا، اسی لیے دشمن بھی نبی کریم ﷺ کی نرمی و مہربانی سے متاثر ہوکر دوست بن جاتے۔

لطف و کرم، نرمی، محبت اور عفو و درگزر آپ ﷺ کی ذات گرامی کا بنیادی حصہ تھی۔ اسی لیے آپ ﷺ اپنے پرائے، ہر کسی سے نہایت محبت کا برتاؤ فرماتے تھے۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے:

"رسول اللہ ﷺ اپنی نرم دلی کے باعث لوگوں کے دل فتح کرلیا کرتے۔ آپ ﷺ کبھی سخت مزاجی یا تنگ دلی کا مظاہرہ نہ فرماتے۔ آپ ﷺ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ فرماتے۔ سکون سے ہر ایک کی بات سنتے اور سب کو بولنے کا موقع عطا فرماتے۔ آپ ﷺ بڑے صبر اور مستقل مزاجی سے گفتگو فرماتے۔ اگر کوئی تمنا ظاہر کرتا، تو آپ ﷺ کی سعی ہوتی کہ پوری کی جائے۔ ورنہ آپ ﷺ تسلی و تشفی کے کلمات ادا فرماتے۔"

جان سے زیادہ پیارے

یہ نبی کریم ﷺ کے اعلیٰ ترین اخلاق کا کرشمہ تھا کہ صحابہ کرام آپ ﷺ سے اتنی شدید محبت کرنے لگتے کہ اپنی بیویوں، اولاد، والدین حتیٰ کہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ آپ ﷺ کو عزیز گردانتے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ایک بار رسول اللہ ﷺ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ دوران گفتگو آپ ﷺ نے حضرت عمر فاروقؓ کے ہاتھ پر شفقت سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ محبّت کا یہ انمول عمل دیکھ کر فاروق اعظمؓ گویا ہوئے: اے رسول خدا ﷺ! میری ذات کے بعد میرے لیے آپ ﷺ ہی محبوب ترین ہیں۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، تم اسی وقت سچے مسلمان بنوگے جب اپنے سے زیادہ مجھ سے محبّت کرنے لگو۔''

یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا: ''اب آپ ﷺ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیارے ہیں۔''

حضور اکرم ﷺ نے تبسّم فرما کر ارشاد فرمایا: ''عمرؓ! اب تمھارا ایمان مکمل ہو چکا۔'' (البخاری)

کتب سیرت میں درج ان گنت واقعات اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا کردار انتہائی بلند، قابل قدر اور مثالی تھا۔ اسی باعث جب آپ ﷺ پر وحی نازل نہیں ہوئی تھی، تب بھی لوگ آپ ﷺ کو ''صادق'' اور ''امین'' کہتے اور آپ ﷺ سے محبت کرتے تھے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق محض صحابہ کرامؓ یا مسلمانوں تک محدود نہ تھے۔ بلکہ آپ ہر انسان کے لیے مکارم اخلاق کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے مسلمانوں کو سکھایا و بتایا کہ نسل، رنگ اور عقیدے سے ماورا ہو کر دوسروں کی عزت و تکریم کرو۔

ایک دن رسول کریم ﷺ مسجد نبوی میں صحابہ کرامؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ تھوڑی دیر بعد سامنے سے ایک یہودی کا جنازہ گزرا۔ وہ مدینے کے یہودی قبائل سے تعلق رکھتا تھا۔ جنازہ دیکھ کر آپ ﷺ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

یہ دیکھ کر بعض صحابہؓ بہت حیرن ہوئے۔ انھوں نے آپ ﷺ سے کہا: ''رسول خدا ﷺ! یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے۔''

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کیا مردہ یہودی کی روح اللہ تعالیٰ نے تخلیق نہیں فرمائی؟''

(البخاری، صحیح مسلم)

یوں رسول اللہ ﷺ نے اپنے طرز عمل سے مسلمانوں پر آشکارا کیا کہ وہ دوسروں کے جذبات کا خیال رکھیں۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ نے ایک مردے کی بھی تعظیم فرمائی۔ لیکن ہم میں سے کتنے مسلمان اس عظیم سنت نبوی ﷺ پر عمل کرتے ہیں؟ بلکہ شاید بہت سے مسلم نادانستگی میں دوسرے انسانوں کی توہین کر جاتے ہیں۔

لیکن نبی کریم ﷺ نے ساری عمر کسی انسان پر لعنت نہیں بھیجی، حتیٰ کہ جانوروں کو بھی ڈانٹا نہ ڈپٹا۔ وجہ یہی ہے کہ آپ ﷺ بہت نرم مزاج اور ہمدرد شخصیت کے مالک تھے۔ تشدد اور سختی آپ ﷺ کی سرشت ہی سے عنقا تھی۔

دشمنوں سے سلوک

بیشتر مستشرقین کی سعی رہتی ہے کہ وہ کسی طرح ثابت کر سکیں کہ رسول اللہ ﷺ جنگ کے حامی تھے اور یہ کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ مگر سیرت، حدیث اور تاریخ، تینوں شعبوں کی کتابیں شہادت دیتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ حقیقتاً جنگ سے نفرت فرماتے تھے۔ اور جب کبھی دفاع کی خاطر لڑائی ناگزیر ہو جاتی، تو آپ ﷺ بڑے رحم دل کمانڈر ثابت ہوتے۔

اسلام کے پہلے معرکے غزوہ بدر سے ایک دن قبل

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

رات کو آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے تقریر فرمائی۔ اس میں رحمت للعالمین ﷺ نے ارشاد فرمایا: دشمن سے مقابلہ کرنے کی کبھی تمنا مت کرو، لیکن اگر تم پر جنگ مسلط ہو جائے، تو پھر صبر کا مظاہرہ فرماؤ۔" (البخاری) یہ حدیث یہ عظیم الشان سچائی عیاں کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے نزدیک جنگ کبھی پہلا انتخاب نہیں رہا۔

یہی وجہ ہے، نبی کریم ﷺ نے جنگوں اور مہمات میں کبھی جارحانہ رویّہ اختیار نہیں فرمایا۔ ہاں، جب دشمن نے جنگ تھوپی، تو آپ ﷺ نے بڑی ثابت قدمی اور بہادری سے اپنا اور قوم کا دفاع فرمایا۔ آپ ﷺ کے جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے کبھی کفار کو معاف فرما دیا۔

کتب میں درج ہے کہ مسلمانوں کی کثرت تعداد دیکھ کر حضرت سعدؓ بن عبادہ کو فخر محسوس ہوا۔ چناں چہ وہ گویا ہوئے: "آج زبردست جنگ ہوگی۔ آج تمام ناقابل فسخ قوانین فسخ ہوجائیں گے۔ آج ذلت و رسوائی قریش کا مقدر بنے گی۔"

یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "نہیں سعد! آج عفو و درگزر کا دن ہے۔ آج کے دن کسی کی عزت پامال نہیں ہوگی۔ یہ اہل قریش کے لیے باعزت دن ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے پھر تقریباً تمام اہلِ مکہ کو معاف فرما دیا، حالانکہ وہ پچھلے 21 برس سے آپ ﷺ اور مسلمانوں پر ہر قسم کے مظالم ڈھا چکے تھے۔

بادشاہ نہیں مددگار

صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کو سر آنکھوں پر بٹھاتے اور ان کے اشارے پر جان قربان کرنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ نبی کریم ﷺ چاہتے، تو مسلمانوں میں بادشاہ بن کر رہ سکتے تھے۔ پھر یہ قدم ہر لحاظ سے آپ ﷺ کو زیبا بھی دیتا تھا۔ مگر حضور اکرم ﷺ بادشاہ نہیں انسانیت کے ہادی و پیشوا بن کر دنیا میں تشریف لائے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے سارے نجی کام خود انجام فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ مسلم قوم پر بحیثیت مجموعی کوئی ذمے داری آن پڑتی، تو آپ ﷺ بھی حتی المقدور اس کام میں حصہ لیتے۔

غزوۂ احزاب کے موقع پر تمام مسلمان خندق کھودنے لگے تاکہ مدینہ منورہ کو دشمنوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ تب نبی کریم ﷺ اپنے مبارک ہاتھوں سے مٹی ڈھوتے رہے۔ حضرت براءؓ بن عازب سے روایت ہے: "میں نے دیکھا کہ مٹی کے باعث سینے تک آپ ﷺ کے کپڑے خاک آلود ہوگئے۔ (البخاری) کیا تاریخ انسانی ایسا حکمران پیش کرسکتی ہے جس نے اپنے پیروکاروں کے ہوتے ہوئے آپ ﷺ مٹی ڈھونے جیسا معمولی کام انجام دیا۔

حقیقتاً نبی کریم ﷺ کے معمولاتِ زندگی عام انسانوں کے مانند تھے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے: "آپ گھریلو کاموں میں اہل خانہ کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ مگر جب صدائے اذان بلند ہوتی، تو تمام کام چھوڑ کر مسجد تشریف لے جاتے۔"

رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہم مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ یہ ہمیں بتاتی ہے کہ ہم محبت کرنا اور امن سے جینا کیونکر سیکھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آج کی گلوبل دنیا میں ایک دوسرے سے تعلقات کیونکر قائم کیے جائیں۔ نبی کریم ﷺ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہم بھی ایک مطمئن اور شاد و آباد زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پہلے مسلمان مہم جو کا جنون آپ کو حیران کر دے گا

اسے اندازہ نہ تھا کہ اگلے 24 سال وہ اپنے وطن کو دوبارہ نہ دیکھ پائے گا

ابن بطوطہ

(Ibn Battutah)

(1304ء سے 1369ء)

ایک کروڑ مربع کلومیٹر کی سیاحت کے لیے 30 سال تک ایک لاکھ کلومیٹر سے زائد پیدل چلنے والے مسلمان سیاح ابن بطوطہ کے اسفار کا ایک طائرانہ جائزہ

طارق عزیز خان

مراکش سے تعلق رکھنے والے مسلمان مؤرخ اور سیلانی ابن بطوطہ نے 1325ء سے 1354ء کے دوران ایشیا، یورپ اور افریقا کی طویل سیاحت کی۔ تقریباً تین عشروں پر مشتمل ابن بطوطہ کے اس تاریخی سفر کی بدولت نہ صرف یورپی اقوام کو اسلامی ریاست کے جغرافیہ، تاریخ اور قوانین سے آگاہی حاصل ہوئی بلکہ دنیا کے الگ الگ خطوں میں بسنے والی اقوام کو ایک دوسرے کے حالات جاننے کا موقع بھی ملا۔

ابن بطوطہ کا اصل نام محمد بن عبداللہ ابن بطوطہ تھا۔ وہ 24 فروری 1304ء میں مراکش کے شہر طنجہ (Tangiers) میں پیدا ہوا۔ اس نے شمالی مراکش کے ایک ''سنی مالکی'' مدرسے سے قرآن و حدیث، ادب، تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم حاصل کی۔ اسے بچپن سے سیر و سیاحت اور نئی نئی زبانیں سیکھنے کا شوق تھا۔ ابن بطوطہ نے 21 سال کی عمر میں اپنے والد اور چند قریبی لوگوں کے ساتھ سرزمین حجاز جانے کی منصوبہ بندی کی۔ اس زمانے میں خشکی کے راستے مراکش سے سعودی عرب کے پیدل سفر میں کل 16 ماہ لگتے تھے۔ تاہم ابن بطوطہ کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اگلے 24 سال تک اپنے وطن کو دوبارہ نہ دیکھ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پائے گا۔ ابن بطوطہ نے جون 1325ء میں اونٹوں، خچروں اور گھوڑوں پر مشتمل ایک قافلے کے ساتھ مراکش سے اپنے تاریخی سفر کا آغاز کیا۔ وہ شمالی افریقا کے ساحلی علاقوں میں سفر کرتا ہوا تیونس پہنچا۔ وہاں دو ماہ گزارنے کے بعد وہ 1326ء کے موسم بہار میں مصر اور فلسطین کے علاقوں پر مشتمل سلطنت مملوک (Mamluk Empire) کی حدود میں داخل ہوا۔ مصر میں چند روزہ قیام کے دوران ابن بطوطہ نے تاریخی شہر اسکندریہ، غزہ اور قاہرہ کی سیاحت کی۔ اس نے سعودی عرب جانے کے لیے صحرائے سینائی (Sinai Desert) کے مروجہ راستے کو اختیار کرنے کے بجائے بحیرہ احمر کے راستے جدہ جانے کا فیصلہ کیا۔ تاہم مصری ساحلوں پر مقامی باغیوں کی لوٹ مار کی وجہ سے اسے واپس قاہرہ آنا پڑا۔ وہ صحرائے سینائی کو پار کر کے ایشیا (فلسطین) میں داخل ہوا۔ ابن بطوطہ نے فلسطین میں مقدس مقامات کی سیاحت کی۔ اس نے ماہ رمضان، شام میں گزارنے کے بعد عربستان کا سفر اختیار کیا اور بالآخر اکتوبر 1326ء کے آغاز میں مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ مدینہ منورہ میں چار دن قیام کے بعد حاجیوں کے ایک قافلے کے ساتھ مکہ معظمہ روانہ ہوا۔ جہاں اس نے مناسک حج ادا کیے اور قریب ایک ماہ وہاں قیام کیا۔ مکہ معظمہ میں قیام کے دوران ابن بطوطہ نے مغربی ایشیا کی سیاحت کا فیصلہ کیا۔

17 نومبر 1326ء کو ابن بطوطہ اپنے والد کو لے کر حاجیوں کے ایک قافلے کے ساتھ عراق روانہ ہوا۔ انھوں نے مدینہ منورہ میں مختصر قیام کیا اور نجد (Najd) کے علاقے میں داخل ہوئے۔ اگلے 44 دن کے دوران ان کے قافلے نے لگ بھگ 1500 کلومیٹر کا فاصلہ طے

کرتے ہوئے جزیرہ نما عرب کو پار کیا اور دریائے ف
کے کنارے آباد عراق کے شہر نجف میں داخل ہو گئے
دریائے فرات کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا جنوب میں
بصرہ پہنچا۔ جہاں چند دن سیر سپاٹے کے بعد وہ
جانے والے قافلے سے وابستہ ہو گیا۔ یہ قافلہ مشر
طرف سفر کرتا ہوا جنوب مشرقی ایران میں واقع
ہائے زاگروس (Zagros) میں داخل ہوا۔ مراکش
خشک اور بنجر کوہ اٹلس میں زندگی گزارنے والے کسی ا
باشندے کے لیے زاگروس کی برف پوش چوٹیوں کا
مبہوت کر دینے والا تھا۔ ابن بطوطہ نے فروری 27
میں اصفہان (Esfahan) اور مارچ کے آغاز پر
ایران میں واقع شیراز کی سیاحت کی۔ وہ جون 27
میں ایک بار پھر عراق میں موجود تھا جہاں اس نے بغد
میں 13 ویں صدی کے دوران چنگیز خان کے پوتے
خان (Hulagu Khan) کے ہاتھوں ڈھائی جانے
تباہی کا مشاہدہ کیا۔ مقامی لوگوں نے ابن بطوطہ کو بتا
فتح کے نشے میں چور ہلاکو خان نے بغداد شہر کو آگ لـ
سے پہلے مقامی خلیفہ اور اس کے خاندان سمیت لگ
8 لاکھ عراقی باشندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔
کی سیر کے بعد ابن بطوطہ، شمالی ایران کے شہر تبر
مشرقی ترکی کے علاقوں کی سیاحت کے بعد وہ ایک با
عراق پہنچا۔ جہاں وہ ایک قافلے سے وابستہ ہو کر 29
میں دوبارہ مکہ معظمہ پہنچ گیا۔ اس نے اپنے والد کے
دوسری بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔

مناسک حج ادا کرنے کے بعد ابن بطوطہ،
جانے والے ایک قافلے کے ہمراہ بحیرہ عرب کی بن
عدن پہنچا۔ اس زمانے میں عدن کی بندرگاہ خلیج
بحیرہ احمر اور بحیرہ عرب کی طرف آنے والے تجارتی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ں کا اہم پڑاؤ تھی۔ چونکہ اس
تک راس امید (Cape of
Good H) کا بحری راستہ
ت نہیں ہوا تھا۔ اس لیے گرم
ں کے یورپین اور عرب تاجر براستہ عدن، جنوبی
ہندوستان کی
ماہ کالی کٹ جاتے
ے۔ ابن بطوطہ نے

عدن کے بازاروں میں لونگ، دارچینی اور
کالی مرچ کے ڈھیر لگے دیکھے۔ اس نے
چند ہفتے یمن کی سیر کے بعد بحیرہ احمر کو پار کیا
صومالیہ میں قدم رکھا۔ وہاں 1330ء اور 1331ء
دوران صومالیہ، کینیا، تنزانیہ اور زین زی بار کے
ے کی سیاحت کی۔ وہ 1332ء میں ایک بار پھر
ظمہ پہنچا، جہاں اس نے تیسرا حج ادا کیا۔

اس بار مکہ معظمہ میں قیام کے دوران ابن بطوطہ کی
ستان کے بادشاہ سلطان محمد بن تغلق سے ملاقات
۔ اس نے مکہ معظمہ میں قیام کے دوران سلطان
لیے مترجم کے فرائض سرانجام دیے۔ سلطان کی
ستان واپسی کے بعد ابن بطوطہ نے مراکش واپس
نے کے بجائے یورپ کی سیاحت کا فیصلہ کیا۔ پھر
ں اور شام میں مختصر قیام کے دوران اپنے والد کی
ث پر انہیں دمشق ہی میں چھوڑ دیا۔ ابن بطوطہ
1ء میں ترکی اور جنوب مشرقی یورپ (یونان،
یہ، یوگوسلاویہ اور جنوبی اٹلی) پر مشتمل بازنطینی
ت (Byzantine Empire) کی حدود میں
ہوا۔ اسی سال اس کی Constantinople
جودہ نام استنبول) میں بازنطینی حکمران اینڈ رونی
کوس سوم (Andronikos III) سے ملاقات ہوئی۔ اینڈ رونی سوم نے ابن بطوطہ سے مشرق وسطیٰ کے سیاسی حالات معلوم کیے۔ استنبول کے بعد ابن بطوطہ کی اگلی منزل یوکرائن تھا۔ اس نے بحیرہ اسود (Black Sea) کو پار کیا اور یوکرائن کی بندرگاہ فیوڈوسیا (Feodosiya) میں قدم رکھا۔ وہ 1334ء کے آخر میں دریائے وولگا پار کر کے بحیرہ کیسپین کے شمالی کنارے پر واقع روسی بندرگاہ استراخان (Aastrakhan) پہنچا۔ وہاں چند دن گزارنے کے بعد ابن بطوطہ، قازقستان سے ہوتا ہوا ازبکستان میں داخل ہوا جہاں اس نے بخارا اور سمرقند کے تاریخی شہروں کی سیاحت کی۔

1335ء کے اواخر میں ابن بطوطہ، افغانستان کے راستے پاکستان میں داخل ہوا۔ وہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا جنوبی پنجاب میں داخل ہوا۔ اس نے تاریخی شہر ملتان کی سیر کی اور صوبہ سندھ میں چند روز گزارنے کے بعد ہندوستان پہنچ گیا۔ اُس زمانے میں دہلی کے تخت پر مسلمان بادشاہ سلطان محمد بن تغلق براجمان تھا۔ سلطان کی ابن بطوطہ سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی، بادشاہ نے ابن بطوطہ کی بڑی آؤ بھگت کی اور اسے قاضی کے عہدے پر سرفراز کیا۔ ابن بطوطہ نے اگلے دو سال تک ہندوستان میں نہایت شاہانہ زندگی بسر کی۔ اس دوران محمد بن تغلق نے اسے خلیج بنگال اور آبنائے ملاکا کے بحری راستے کے ذریعے ایک سفارتی مشن پر چین جانے کا حکم دیا۔ ابن بطوطہ نے جنوبی ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ جانے سے پہلے گجرات کی سیاحت کی جہاں مقامی لیٹروں کے حملے میں وہ مرتے مرتے بچا۔ تقریباً ایک ماہ تک ساحل مالا بار پر

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بھٹکنے کے بعد وہ کالی کٹ پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ خلیج بنگال کے سفر کے دوران ابن بطوطہ کا بحری جہاز سمندری طوفان کے باعث مجبوراً انڈونیشیا کے جزیرے سماٹرا پہنچ گیا۔ اس نے سماٹرا میں چند ہفتے قیام کے دوان چین جانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ 1339ء کے آغاز پر ایک بار پھر جنوبی ہندوستان میں موجود تھا۔ چین کی ناکام سفارت سے خوف زدہ ابن بطوطہ نے اگلے چند ہفتے ایک مقامی مسلمان جمال الدین کی پناہ میں گزارے اور دہلی جانے کے بجائے مالدیپ کے جزائر پہنچ گیا۔ وہاں نو ماہ کے قیام کے دوران مقامی مسلمان حکمران عمر اول نے ابن بطوطہ کی علمیت سے متاثر ہوکر اسے اپنی ریاست کی سب سے بڑی عدالت کا چیف جسٹس مقرر کر دیا۔ 1340ء کے موسم بہار میں ابن بطوطہ نے مالدیپ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی ایک نومسلم خاتون سے شادی کی۔

ابن بطوطہ کی اگلی منزل سری لنکا تھی جہاں اس نے کوہ آدم (Adam's Peak) کی سیاحت کی۔ سری لنکا میں مختصر قیام کے بعد اس نے اپنے ادھورے سفارتی مشن کی تکمیل کے لیے چین جانے کا قصد کیا اور اس بار کامیاب رہا۔ ابن بطوطہ 1342ء میں سماٹرا، ویت نام اور فلپائن کی مختصر سیاحت کرتا ہوا جنوبی چین میں داخل ہوا۔ اس زمانے میں چین پر منگول سلطنت کے تابع یوآن (Yuan) خاندان کی حکومت تھی۔

ابن بطوطہ نے دریائے ینگسی (Yangzi) کے دہانے پر واقع چین کے سب سے بڑے شہر شنگھائی (Shanghai) میں چند دن گزارے۔ اس نے چین کے موجودہ دارالحکومت بیجنگ کے شمال میں واقع دیوار چین کو پار کیا اور منگول سلطنت کے دارالحکومت شانگ دو (Shangdu) پہنچا۔ 1343ء یا 1344ء میں ابن بطوطہ مقامی منگول حکمران سے ملاقات کر کے اسے ہندوستان کے بادشاہ سلطان محمد بن تغلق کی طرف سے خیر سگالی کا پیغام پہنچایا۔ اس کام سے فراغت کے بعد ابن بطوطہ نے 1346ء میں ہندوستان واپسی کا سفر اختیار کیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سلطان محمد بن تغلق کو چین کے حالات بتانے کے بعد شام میں مقیم اپنے والد کو ساتھ لے کر مراکش روانہ ہو جائے گا۔

ابن بطوطہ 1347ء کے آغاز پر جنوبی ہندوستان پہنچا۔ اس نے یہ دیکھتے ہوئے کہ محمد بن تغلق اپنے خلاف برپا ہونے والی بغاوتوں کو کچلنے میں مصروف ہے، ہندوستان سے روانہ ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ بحیرۂ عرب اور خلیج فارس سے ہوتا ہوا عراق اور پھر 1348ء میں شام پہنچ گیا۔ دمشق میں اپنے والد کی تلاش کے دوران پتا چلا کہ اُن کا تو عرصہ پہلے (1333ء) انتقال ہو چکا تھا۔ ابن بطوطہ نے مراکش واپسی سے پہلے مکہ معظمہ جا کر چوتھی بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ حج کے فوراً بعد وہ افریقا جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو کر مصر، لیبیا اور الجزائر کی خاک چھانتا بالآخر 1349ء میں مراکش واپس پہنچ گیا۔ ابن بطوطہ نے لگ بھگ ... سال بعد اپنے وطن طنجہ میں قدم رکھا۔ اسے یہ جان کر افسوس ہوا کہ چند ماہ پہلے اس کی والدہ بھی اس ...

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

لوچ کر چکی تھی۔ ابن بطوطہ کی بے چین طبیعت نے
ے چند روز بھی ٹک کر نہ بیٹھنے دیا۔ اس نے آبنائے
، الطارق کو پار کر کے جنوبی اسپین میں واقع غرناطہ
(Granac) کی اسلامی ریاست میں سیر و سیاحت
۔ اسپین میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ 1350ء
، دوبارہ طنجہ پہنچا۔ جہاں اس نے صحرائے اعظم
(Sahara Dese) کو پار کر کے سلطنت آف مالی
(Mali Empir) کے تاریخی شہر ٹمبکٹو
(Timbukt) تک رسائی مہم ترتیب دی۔

شمالی افریقا میں 94 لاکھ مربع کلومیٹر پر پھیلا
رائے اعظم دنیا کا سب سے بڑا ریگستان ہے۔ آج
(201ء) اس عظیم ویرانے میں کل 25 لاکھ افراد
بتے ہیں جن کی اکثریت مصر، لیبیا، الجزائر، ماریطانیہ
مالی سے تعلق رکھتی ہے۔ یوں تو شمالی افریقا کے
ندے زمانہ قدیم ہی سے صحرائے اعظم کی خاک
انتے رہے ہیں، تاہم ابن بطوطہ کو وہ پہلا مہم جو مانا
نا ہے جس نے ایک باقاعدہ مہم کے تحت اس کے
ربی حصے کو پار کیا۔ 1351ء کی خزاں میں شمالی
کش کے شہر فیس (Fes) سے ابن بطوطہ کے قافلے
ے اپنے دلچسپ سفر کی شروعات کی۔ قریب تین سو
ومیٹر تک جنوب میں آگے بڑھنے کے بعد وہ لوگ
رقی مراکش میں واقع سجلماسا (Sijilmasa) کے
ریخی قصبے میں داخل ہوئے۔ (یاد رہے کہ مراکش میں
قع فیس اور سجلماسا وہ تاریخی شہر ہیں جہاں بالترتیب
76ء اور 790ء میں پہلی اسلامی کالونی کی بنیاد رکھی
ئی) سجلماسا میں چار ماہ قیام کے دوران ابن بطوطہ
کے قافلے نے اونٹوں اور خچروں کی خرید و فروخت کی۔
اسا سے روانہ ہونے کے بعد ابن بطوطہ کا قافلہ
مغربی الجزائر کے صحرائی علاقے میں داخل ہوا۔ جنوب
میں ماریطانیہ کی طرف سفر کے دوران وہ لوگ دن کی
جھلستی گرمی میں آرام کرتے اور رات میں نقطہ انجماد
سے کم درجہ حرارت میں ٹھٹھرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ
فاصلہ طے کرنے کی کوشش کرتے۔ ابن بطوطہ کے
قافلے نے جنوری 1352ء کے دوران شمالی ماریطانیہ
کے صحرائی علاقے الغزیب (El Gseib) کو پار کیا۔
اس کا قافلہ فروری کی شروعات میں مالی کے شمالی حصے
میں واقع تغازا (Taghaza) پہنچا۔ عین خط سرطان
پر واقع مالی کے اس حصے میں خشک نمکین جھیلوں کی
بہتات ہے۔ اس زمانے میں یہ علاقہ سلطنت مالی کی
حدود میں شامل تھا اور یہاں ماسوفا (Masufa) قبائل
آباد تھے۔ تغازا میں قیام کے دوران ابن بطوطہ یہ دیکھ
کر حیران ہوا کہ نمک کی خشک جھیلوں سے اٹی اس
سرزمین میں واقع مقامیوں کے گھر بھی نمک کی سلوں
سے بنے ہوئے تھے۔ تغازا میں دس روزہ قیام کے بعد
ابن بطوطہ کا قافلہ تین سو کلومیٹر جنوب میں واقع ایک
نخلستان (Bir al-Ksaib) پہنچا۔ یہاں سے انھوں
نے پینے کے لیے پانی جمع کیا اور اپنے اونٹوں کو بھی جی
بھر کر پلایا۔ ان کی اگلی منزل مالی کے جنوب حصے میں
بہنے والا دریائے نائیجر تھا۔

لگ بھگ دو ماہ تک بے آب و گیاہ صحرا میں سفر
کرنے کے بعد ابن بطوطہ، مئی 1353ء میں دریائے
نائیجر کے کنارے واقع مالی کے مشہور تاریخی شہر ٹمبکٹو
پہنچا۔ اس نے اگلے چند ہفتے ٹمبکٹو کی سیاحت کی اور
جولائی میں سلطنت مالی کے دارالحکومت بماکو
(Bamako) میں داخل ہوا۔ جہاں اس کی مسلمان
حکمران سلیمان مانسا سے ملاقات ہوئی۔ ابن بطوطہ نے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پایا کہ مانسا ایک دولت مند حکمران تھا جس کے دربار میں موجود ہر شے سونے سے بنی تھی۔ مقامی لوگ مسلمان لیکن مذہب اور تہذیب سے کوسوں دور تھے۔ ان کی عورتیں لباس سے بے پروا معلوم ہوتی تھیں اور معاشرے میں جنسی بے راہ روی عام تھی۔ ابن بطوطہ اگلے آٹھ ماہ تک سلیمان مانسا کا مہمان بنا رہا۔ اس دوران بادشاہ نے اس کی دل بستگی کے لیے اپنی بیٹی سمیت عریاں کنیزیں تحفتاً پیش کیں جنھیں ابن بطوطہ نے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔ اکتوبر میں ابن بطوطہ نے وطن واپسی کا سفر کیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ مراکش واپس جانے والے اس کے قافلے میں 600 بے لباس لڑکیاں بھی شامل تھیں جنھیں فروخت کے لیے یورپ لے جایا جا رہا تھا۔

صحرائے اعظم کے تاریخی سفر کے بعد ابن بطوطہ نے 1354ء کے آغاز میں مراکش واپس پہنچ کر مقامی حکمران سلطان ابو عنان فارس (Abu Inan Faris) سے ملاقات کی۔ اس نے سلطان کے سامنے اپنے 30 سالہ سفر سے متعلق مشاہدات بیان کیے اور اسے سلطنت مملوک، مغربی و وسطی ایشیا، یورپ کی بازنطینی سلطنت، ہندوستان اور چین کے حالات بتائے۔ ابن بطوطہ نے سلطان کو اپنے پاس موجود کاغذ کے ٹکڑوں، چمڑے کے تھیلوں، کپڑوں، لوہے کے برتنوں، جوتوں، سر پر پہنی پگڑی یہاں تک کہ اپنے جسم کے نمایاں حصوں پر بھی سفر سے متعلق لکھی تحریریں دکھائیں تو وہ حیران رہ گیا۔ اس نے ابن بطوطہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے طویل سفرنامے کو کتابی صورت میں شائع کرے۔ سلطان کی ہدایت پر ابن بطوطہ نے اس کے دربار میں موجود مؤرخ، شاعر اور قانون داں ابن جوزی الکلبی (Ibn Juzayy al-Kalbi) کو اپنے پاس موجود تحریری مواد اور ذہن میں موجود یادداشتوں کے سہارے اپنی طویل مہماتی داستان املا کروانی شروع کی۔

قریب ایک سال کی کڑی محنت اور تحقیق کے بعد ابن جوزی نے ابن بطوطہ کے تاریخی سفرنامے کو مکمل کیا۔ مختلف ممالک کے تاریخی و جغرافیائی حالات پر مبنی اس کتاب کا نام ”تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار“ (A Gift to those who contemplate the wonders of cities and the Marvels of Travelling) ہے۔ اس کتاب کو عربی میں مختصراً ”الرحلہ“ (The Rihla) اور انگریزی میں (The Journey) کہتے ہیں۔ اس سفرنامے کی اشاعت کے دوران ہی ابن بطوطہ کو مراکش کی سب سے بڑی عدالت کا قاضی مقرر کر دیا گیا تھا۔ اس نے کوئی اور نئی مہم شروع نہیں کی یہاں تک کہ 1368ء کے آخر یا پھر 1369ء کے آغاز پر ابن بطوطہ کا مراکش میں انتقال ہوگیا۔

بدقسمتی سے ابن بطوطہ کے تاریخی سفرنامے کی روداد اگلی چار صدیوں تک منظر عام سے غائب رہی۔ حتیٰ کہ اس دوران کسی مسلمان حکمران نے بھی اس نادر روزگار تاریخی دستاویز کو تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ یورپ میں 1800ء کے آغاز میں بعض عرب اسکالرز کی تحریروں کی بنیاد پر جرمن اور انگریزی زبان میں ابن بطوطہ کے تاریخی سفر سے متعلق اقتباسات شائع ہوئے۔ 1830ء میں فرانس کے الجزائر پر قبضے کے دوران فرانسیسیوں کو الجزیرہ شہر سے ابن بطوطہ کے اصل سفرنامے کے پانچ قدیم نسخے ملے۔ ان نسخوں کو فوری طور پر پیرس روانہ کر دیا گیا۔ جہاں فرنچ اسکالر Charles Defremery اور

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

Beniamino Sanguinetti نے ان کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ انھوں نے تین سالہ تحقیق کے بعد ان نسخوں کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ جس کے بعد فرانس میں The Journey کی چار جلدوں پر مبنی پہلی کتاب شائع کی گئی۔ فرانس کے بعد پوری دنیا کی قابل ذکر زبانوں (غالباً اردو کے سوا) میں ابن بطوطہ کے تاریخی سفرنامے کے ترجمے شائع ہوئے۔

ابن بطوطہ کا قدرتی موازنہ اطالوی مارکو پولو ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ان دونوں مہم جوؤں کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔ دونوں ہی نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں مہمات کا آغاز کیا۔ مارکو پولو کے سفر کا بنیادی مقصد منگول حکمران قبلائی خان کو عیسائی یورپ کی طرف سے خیر سگالی کا پیغام پہنچانا تھا جب کہ ابن بطوطہ کا طویل سفر محض اس کے شوق سیاحت کا آئینہ دار تھا۔ مارکو پولو کی یورپ واپسی کے بعد اس کے سفرنامے کی تفصیلات سرعت کے ساتھ یورپ کے طول و عرض میں پھیل گئیں۔ مارکو پولو کے برعکس ابن بطوطہ نے کہیں زیادہ علاقوں کی سیاحت کی۔ اس نے اپنی 30 سالہ مہم کے دوران ایشیا، یورپ اور افریقا کے لگ بھگ ایک کروڑ مربع کلومیٹر علاقے کی خاک چھانی اور تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار کلومیٹر کا پیدل سفر طے کیا۔ دنیا کی تاریخ میں یہ کسی بھی سیلانی کی طرف سے طے کیا گیا آج تک کا سب سے طویل پیدل سفر ہے۔ ابن بطوطہ ایک زرخیز ذہن کا مالک، سیماب فطرت شخص تھا۔ اس پر ہر وقت اپنے قرب و جوار کے علاقوں کو دریافت کرنے کا جنون سوار رہتا تھا۔ اس کی بے چین طبیعت نے اسے کسی مخصوص علاقے تک محدود نہ رہنے دیا۔ نئی نئی دنیاؤں تک رسائی کی جستجو نے اسے ہمیشہ حالت سفر ہی میں رکھا۔ وہ پہلا مسلمان مہم جو کہلایا جس نے اس زمانے تک دریافت شدہ تینوں براعظموں کی سیاحت کی تھی۔ گو کہ ابن بطوطہ نے اپنی مہمات کے دوران کسی نئے علاقے کو دریافت نہیں کیا، تاہم اس کی طویل سیر و سیاحت کے نتیجے میں دنیا کے تین الگ الگ خطوں میں بسنے والی اقوام کو ایک دوسرے کے حالات جاننے کا موقع ملا۔

ہم ابن بطوطہ کے سفرنامے سے متعلق پائی جانے والی دو غلط فہمیوں کو دور کرتے چلیں۔ تاریخ سے ناواقف بعض ذرائع نے لکھا ہے کہ ابن بطوطہ اپنے سفر کے آخری مرحلے میں ایران پہنچا جہاں اس نے ایرانی بادشاہ ابوعنان فارس کے کہنے پر اپنے سفرنامے کو کتابی شکل دی۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات غلط ہے۔ اس نے ایران کی سیاحت ضرور کی تھی، تاہم ایسے کوئی شواہد موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ابن بطوطہ کی کسی ایرانی بادشاہ سے ملاقات ہوئی ہو۔ شاید ابوعنان کے نام سے جڑے "فارس" کے لفظ سے یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ وہ ایران کا بادشاہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ ابوعنان فارس، ایران کے بجائے مراکش کا سلطان تھا۔ وہ 1329ء میں مراکش میں پیدا ہوا اور 1348ء اپنے والد ابوالحسن ابن اوتھان کی وفات کے بعد مراکش کا حکمران بنا۔ اسے 1358ء میں قتل کر دیا گیا۔ ابن بطوطہ کے سفرنامے سے متعلق دوسری غلط فہمی، ابن جوزی کے نام سے متعلق ہے۔ بعض ذرائع نے مشہور عراقی عالم، شاعر اور مؤرخ علامہ ابن جوزی کو ابن بطوطہ کے سفرنامے Rihla کا مصنف لکھا ہے۔ جب کہ سچ یہ ہے کہ علامہ ابن جوزی، ابن بطوطہ کے دنیا میں آنے سے لگ بھگ سو سال پہلے انتقال فرما چکے تھے۔ ان کا زمانہ 1116ء سے 1206ء کے درمیان ہے جب کہ ابن بطوطہ کے سفرنامے کے مصنف ابن جوزی الکلبی کا زمانہ 1321ء سے 1357ء کے درمیان ہے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

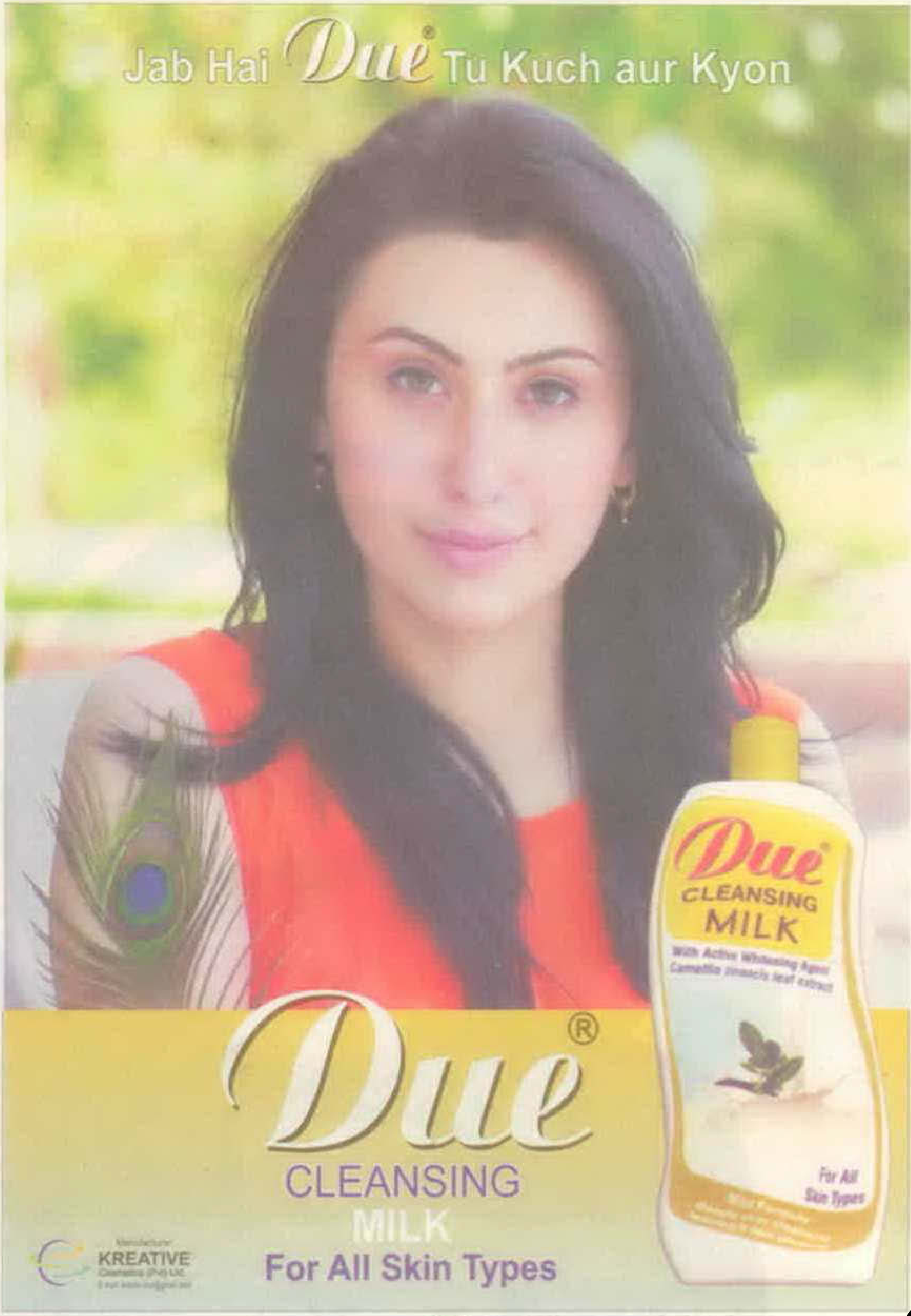

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

انٹرویو

کچھ شکایتیں اچھی ہوتی ہیں انہیں باقی رہنا چاہیے!

☆ لاری اڈے پر کام کرنے والے نے میری الیکشن فیس جمع کروائی۔

☆ میں تو سمجھتا ہوں یہ فساد روکا جا سکتا ہے

☆ بالآخر عمران نے یہ ہمت والا کام بھی کر ڈالا

☆ الیکشن میں ہم پیدل تھے، دوسرے جہاز پر سوار تھے

☆ الیکشن میں جو پیسے خرچ ہونے سے بچ گئے، ہم نے واپس کر دیے۔

☆ وزیراعلیٰ کے ساتھ بہت اچھا ورکنگ ریلیشن ہے

☆ میں نے عمران کو بڑا اچھا پایا۔ بات سنتا ہے، سمجھتا ہے۔

☆ غلط بیانی اور جھوٹ کے لیے دوسروں کی زیادتی وجہ جواز نہیں بن سکتی

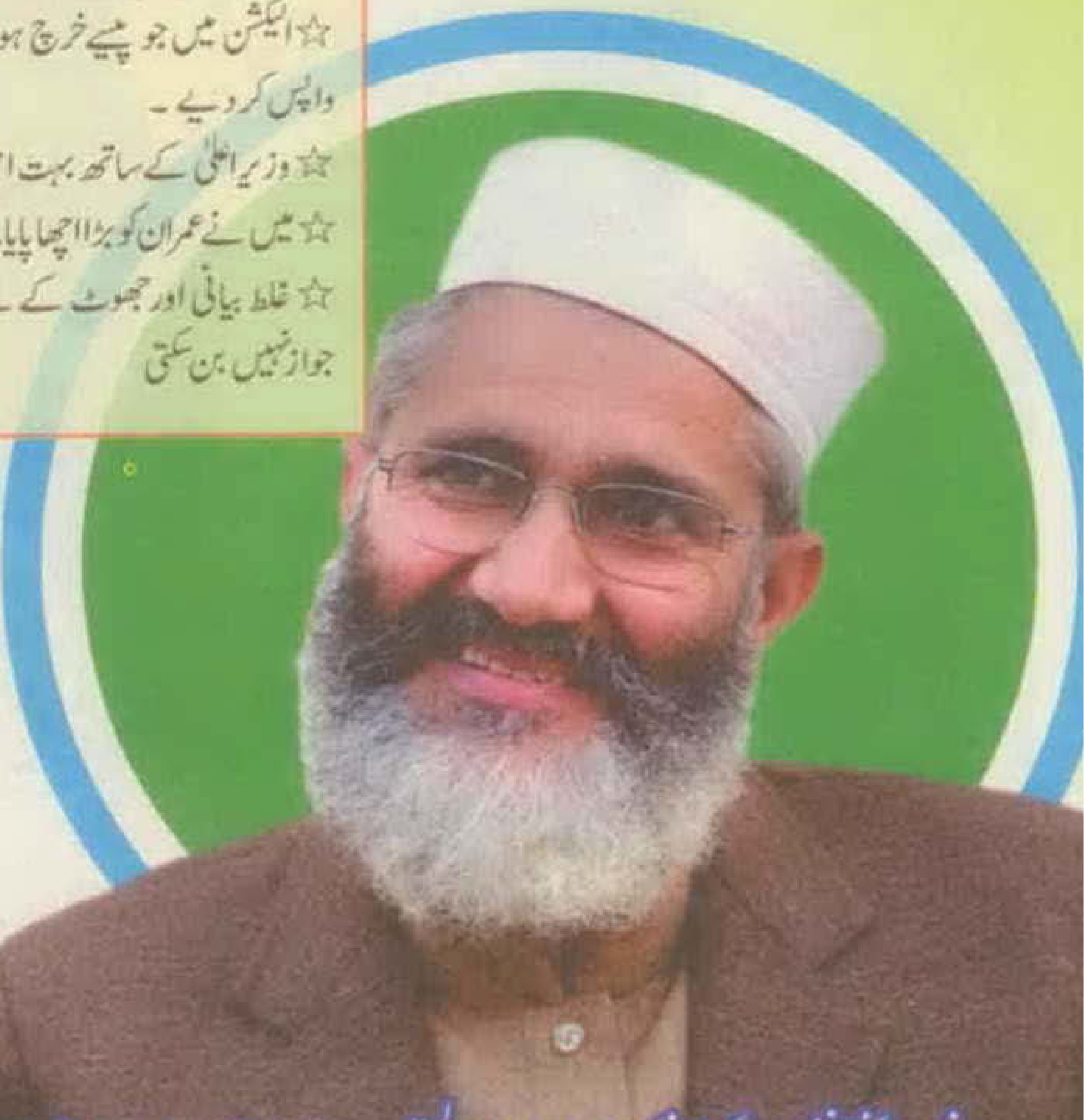

اختر عباس

خیبر پختونخواہ کے سینئر وزیر سراج الحق سے تازہ ترین ملاقات کا احوال

وہ بہت سی باتیں جو لوگ پوچھنا چاہتے ہیں، سننا چاہتے ہیں

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سر پر وہی سفید ٹوپی جو اکثر ٹیڑھی رکھی ہوتی ہے۔ آنکھوں میں وہی چمک اور روشنی جس میں پہچان اور اپنائیت ہوتی ہے، جسم البتہ اب کچھ بھرنا شروع ہوگیا ہے۔ جنوری کی ایک خنک اور یخ بستہ صبح جب لوگ لحافوں میں دبکے سو رہے تھے۔ ہم دونوں برسوں بعد بڑی گرم جوشی سے مل رہے تھے۔ 87-1986ء میں جب وہ پشاور یونیورسٹی میں بی ایڈ کر رہے تھے اور صوبہ سرحد جمعیت کے ناظم تھے، ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ پھر ہم مردان میں ان کے مہمان ہوئے اور بعد میں جب وہ پنجاب یونیورسٹی میں ایم ایڈ کے طالب علم بنے یہ قربت اور بڑھی۔ ان کا بچپن اسکول میں فٹ بال کھیلتے اور ساتھیوں کے ساتھ برف باری میں شکار کھیلتے کب شروع ہوا اور کب رخصت ہوا اس کا تعین کرنا انھیں بھی مشکل ہے۔ سرد رات کے سناٹے میں جب تا حدنگاہ زمین برف زاروں میں ڈھل جاتی ہے، خرگوش غاروں میں واقع اپنے کھوہ نما گھروں سے نکل کر رزق کی تلاش میں نکلتے ہیں تو برف پر ان کے پاؤں کے نشان بڑے واضح ہوتے ہیں۔ نئے اور پرانے شکاری انہی نشانوں کی مدد سے ان کو جا لیتے ہیں۔ سراج الحق کے جسم کی چستی اور آنکھوں میں چیتے کی سی لپک شاید انہی دنوں کی دین ہے جب وہ اپنے والد کی گھر سے غیر موجودگی میں ساری ساری رات شکار کرنے میں گزار دیتے۔ یہی وہ دن تھے جب دن کو وہ بکریوں کے ایک مختصر سے ریوڑ کو لے کر چرانے نکلتے جس میں ان کی اپنی ہی نہیں، ہمسایوں کی بکریاں بھی ہوا کرتی تھیں۔

ٹھنڈی ہواؤں میں، کسی قصبے کے کنارے کوئی ساتھی گڈریا جب بانسری بجاتا تو سراج الحق کو بہت مزا آتا۔ مگر یہ تب کی بات ہے جب وہ اسے برا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ جناب اشفاق احمد کی بات سے متفق ہیں کہ اللہ نے بکریاں چرانے میں بڑے سبق رکھے ہیں، مخلوق کو سنبھالنے، غصہ نہ کرنے اور محبت اور توجہ سے صرف ڈرا دھمکا کر ان کو آگے بڑھانے یا کامیابی سے واپس لانے کی باکمال صفت بکریوں کے ساتھ وقت گزارے بنا سیکھنا مشکل ہے۔

پہلے صوبہ سرحد اور اب خیبر پختون خواہ کے دو بار سینئر وزیر بننے والے سراج الحق کو نہ اپنے ماضی سے کوئی مسئلہ ہے اور نہ اپنے حال سے کہ اس کے پاس اب بھی نہ ذاتی کار ہے اور نہ ذاتی گھر۔ چھے بچوں کی پرورش ان کے لیے بوجھ نہیں ہے۔ ایک خوش گوار ذمہ داری ہے جس کو ادا کرنے کے لیے وہ رات گئے اپنے گھر لوٹ آتے ہیں۔

جناب سراج الحق کو ملنا، جاننا، سننا ایک دلچسپ تجربہ ہوتا ہے۔ وہ جماعت اسلامی کے کارکن، راہنما اور پورے پاکستان کے نائب امیر ہوتے ہوئے بھی ایک مختلف آدمی ہیں۔ بظاہر سیدھے سادے مگر بباطن کسی پرانی جھیل جیسے گہرے، انھیں ہنستے بھی دیکھا جا سکتا ہے اور کسی شب خدا کے خوف سے نکلتی سسکیوں کو چیخوں میں ڈھلنے کی گواہی بھی دی جا سکتی ہے۔ وہ عام لوگوں میں بیٹھے ہوں تو بھی اپنے انداز اور آواز سے خاص لگتے ہیں۔ ہمیشہ سفید کپڑے پہننے والے سراج الحق کی ٹوپی اور چادر بھی عام طور پر سفید ہوتی ہے۔

عملی زندگی کو اگر دوسروں کی خدمت اور راہنمائی سے جوڑا جائے تو سراج الحق 1983ء سے اس دریا کے شناور ہیں جب ڈگری کالج تیمر گرہ کے وہ صدر منتخب ہوئے تھے۔ کالج یونین میں وہ جمعیت کے واحد

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

نمایندہ تھے باقی سبھی عہدہ دار ان کی مخالف تنظیم سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ یہ بتاتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب جاتے ہیں کہ اس چھوٹی سی عمر میں اپنے مخالف اُمیدوار کے گھر کیسے پہنچ گئے جس کو وہ ''ووٹوں سے ہرا چکے تھے۔ وہاں جا کر یہ کہنا کہ آپ صرف گیارہ ووٹ کم کالج یونین کے پورے صدر ہیں۔ ہم آپ کو عزت بھی دیں گے، احترام بھی اور معاملات کی مشاورت میں پوری طرح اپنے ساتھ رکھیں گے۔ سراج الحق آج بھی اسی طرح سوچتے ہیں۔ اس لیے مخالفین ان کے ایسے کسی بھی فیصلے سے خوف زدہ رہتے ہیں کہ ہارے ہوئے مخالف صدر کی طرح اُٹھ کر گلے لگ جانا اور یہ کہہ دینا نہ پڑ جائے کہ اس سے زیادہ مجھے اور کچھ چاہیے بھی نہیں جو آپ مجھے بن مانگے دینے آگئے ہو۔

پٹھانوں کے مشوانی قبیلے سے تعلق رکھنے والے سادہ مزاج شب زندہ دار سید سراج الحق کی جائے پیدائش ضلع چارسدہ کا ایک چھوٹا سا گاؤں سپرزور (شب قدر) ہے۔ جبکہ تحصیل ثمر باغ اور ضلع دیر میں واقع کاکس آبائی گاؤں ہے۔ جہاں ان کے والد مولوی احسن الحق کی زندگی ایک چھوٹی سی مسجد، حجرے اور مدرسے تک سمٹی ہوئی تھی۔ احسن الحق صاحب دارالعلوم دیوبند سے فاضل اور فارغ التحصیل تھے۔ چار بھائیوں اور دو بہنوں میں سے ایک بھائی اسکول ٹیچر ہیں دوسرے نے میل نرس کا کورس کیا ہوا ہے اور وہ ابھی حال ہی میں ہونے والے سرکاری ملازمت کے انٹرویوز میں میرٹ پر نہیں آسکا۔ تیسرے بھائی ڈاکٹر ذکی الدین ہیں جو ثمر باغ میں کلینک کرتے ہیں۔

سراج الحق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قاضی حسین احمد کی طرح ان کا حافظہ بہت اچھا ہے، کسی نے کہا وہ 18 سال کے نوجوان والا حافظہ رکھتا ہے۔ لوگوں کو یاد رکھتا ہے۔ ان کی غلطیاں بھول جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دوسروں کی صرف غلطیاں یاد رکھنے والے ایک روز اکیلے رہ جاتے ہیں۔

سراج الحق کی زندگی میں کئی ٹرننگ پوائنٹس ہیں مگر ایک حادثہ میں جب ان کی وین ایک کھائی میں گر رہی تھی اور موت یقینی تھی تو انھوں نے اپنے رب سے دعا کی۔ الٰہی اگر زندہ بچ گیا تو باقی زندگی شکرگزاری کی ہوگی، صرف تیری اور تیرے پیغام کی سرفرازی کے لیے جیوں گا۔ اس حادثے کو سالہا سال گزر گئے، سراج الحق نے اس وعدے کو اپنی سانسوں کا حصہ بنا لیا۔ ایک روز انھوں نے حیرت سے ایک آدمی سے پوچھا جو ایک نہایت قیمتی باز کو ہاتھ پر بٹھائے پیار کر رہا تھا۔ تم نے یہ کیسے کیا؟ جواب ملا پورے تیس دن 24 گھنٹے سوئے بنا اس کے ساتھ جیا ہوں۔ لمحہ لمحہ۔ تب یہ مجھے سمجھا اور میرے اشاروں کو سمجھنے لگا۔ بے اختیار منہ سے نکلا اگر اتنا وقت اور اتنے گھنٹے تم اللہ کو دے دیتے تو ایک شاہین کیا اور بھی بہت سے پرندے تیرے مطیع ہو جاتے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

قرآنِ پاک کی تلاوت کو عزیز ترین جاننے والے سراج الحق اقبال کی نظمیں اور اشعار بھی شوق سے پڑھتے ہیں۔ گزشتہ دنوں لاہور آئے تو ان کے ساتھ ایک دلچسپ نشست رہی۔ آئیے آپ بھی اس نشست کا حصہ بنیے۔

ایڈیٹر: کچھ لوگوں کو شکایت ہے کہ جماعت والے جب Politics میں آتے ہیں وزیر بنتے ہیں تو پتا ہی نہیں چلتا کہ ہیں یا نہیں ہیں؟

مہمان: مُسکراتے ہوئے۔ شکایت تو جائز ہے کچھ شکایتیں اچھی ہوتی ہیں انھیں باقی رہنا چاہیے۔

ایڈیٹر: پہلے لوگ یہ مذاق میں کہتے تھے اب سنجیدہ ہو کر کہتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جیسے طالبان کے گورنر اور مختلف وزرا رہے ہیں۔ وہ ایک لحاظ سے تو یہ ثابت کرتے رہے کہ ہم بہت سادہ ہیں اور down to earth ہیں۔ لیکن جو ایڈمنسٹریشن کی ذرا توہر والا تاثر تھا وہ اُس میں سے Missing رہا۔ آپ اس سے Agree کرتے ہیں؟

مہمان: اُن کا انتظام تو اچھا تھا اس لیے امن و امان بھی بہتر تھا اُن کے وقت۔ کہ آپ اگر اپنا سامان رکھ دیتے تھے سڑک کے کنارے تو آپ وہاں سے اُٹھا بھی سکتے تھے۔ محفوظ تھا سامان۔ میں اگر اکیلا جا رہا تھا سڑک کے کنارے تو مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن لوگ شاید اس لیے سمجھتے ہوں کہ کوئی وزیر آسانی سے ملتا نہ ہو (Approachable) نہ ہو تو وہ وزیر لگتا ہے۔ ایک سائیکی ہے۔ گزشتہ دنوں ایک آدمی آیا تھا پنجاب سے مجھے پتا چلا کہ پنجاب سے کوئی آدمی آیا ہوا ہے۔ میں خود باہر آیا۔ اُس کو ایک دوست کی طرح بلایا، بٹھایا۔ نہایت ادب و احترام کے ساتھ چائے پلائی۔ پھر اس نے کہا میں تو وزیر اعلیٰ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کوئی خاص کام ہے؟ اس نے کہا کہ کوئی کام تو نہیں بس ویسے ملنا چاہتا ہوں، شوق ہے، جا کر بتا تو سکوں گا کہ وزیر اعلیٰ سے ملا تھا۔ میں نے کہا چلو ٹھیک ہے ملنا

دلچسپ واقعہ

صوبہ سندھ کے دورے پر کشمور میں عشا کے بعد جلسہ عام کا پروگرام تھا۔ بڑے چوک کے قریب کرسیاں بچھا کر جلسہ گاہ تیار کی گئی تھی۔ سندھ کی روایت کے مطابق اجرک اور ٹوپی پہنائی جا چکی تھی، تقریر شروع ہوئی تو سراج الحق نے دیکھا کہ دور سے ایک بیل گاڑی کو کچھ لوگ تیز رفتاری سے دوڑاتے ہوئے جلسہ گاہ کی طرف لا رہے ہیں۔ قریب آئے تو پتا چلا کہ جئے سندھ کے لوگ ہیں اور جلسہ خراب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بیل گاڑی کے لیے جلسہ گاہ کے بیچوں بیچ سے راستہ مانگ رہے تھے۔ کارکنان بڑی تعداد میں جمع تھے اور مزاحمت کر رہے تھے۔ قریب تھا کہ تصادم تک نوبت پہنچ جاتی کہ سراج الحق کی آواز گونجی۔ یہ آپ کے صبر کو آزمانے آئے ہیں۔ ان کے ساتھ لڑائی نہیں کرنی۔ ان کا منصوبہ ناکام بنانا ہے۔ یہ آپ کے جلسۂ عام کو خراب کرنے کا سوچ کے آئے ہیں۔ آپ انھیں گزرنے دیں۔ جلسہ روک دیا گیا۔ ساری کرسیاں اکٹھی کر کے ایک طرف رکھی گئیں تب بیل گاڑی کے گزرنے کے لیے جگہ بنی۔ بیل گاڑی فاتحانہ شان سے گزر گئی مگر لوگوں نے جماعت کی قیادت پر فائز راہنما کی معاملہ فہمی کی داد دی جس نے یقینی تصادم سے اپنے کارکنان کو بچا لیا تھا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

چاہیے۔ وزیر اعلیٰ صاحب سے ہوجائے ملاقات تو ٹھیک ہے۔ تب مجھے احساس ہوا چونکہ میں بہت آسانی سے اس کو مل گیا تھا جیسے گھر کا چوکیدار...... تو اس کو اطمینان نہیں ہوا کہ میں کسی منسٹر سے ملا ہوں۔ لوگوں کی سائیکی یہ ہے کہ میں بیٹھوں، کسی جگہ میں انتظار کروں اور دروازے کی طرف دیکھتا رہوں، پھر کوئی دروازہ کھولے اور مجھے اندر لے کے جائے۔ پھر اُس کو اطمینان ہوجائے گا کہ اس نے کسی حکمران سے ملاقات کی ہے۔ پھر میں نے اُسے مشورہ دیا کہ آپ جا کر درخواست دے دیں کہ یہی طریقہ اور اصول ہوتا ہے۔ پھر آپ گھر واپس چلے جائیں اپنا موبائل نمبر دے کے۔ انھوں نے اگر مناسب سمجھا تو آپ کو واپس فون کریں گے اور اگر مناسب نہیں سمجھا تو پھرنہیں بلائیں گے۔ لوگ خود ہی حکمرانوں تک مشکل رسائی کا تصور سنبھالے ہوئے ہیں۔ عام ہی نہیں خاص لوگوں کے ساتھ بھی یہ معاملہ ہے۔

پرویز مشرف جب صدر تھے اور شوکت عزیز وزیراعظم تو ہم گئے تھے اسلام آباد۔ اُن دنوں ورلڈ بینک کی ایک نائب صدر تھی۔ ''میکوشیومزی'' اُن کا نام تھا۔ تو شوکت عزیز صاحب نے ہمیں خاصا ڈرایا کہ یہ بہت پاور فُل خاتون ہے ورلڈ بینک کی۔ اکرم خان دُرانی وزیر اعلیٰ تھے، وزیر صحت تھے عنایت اللہ اور فضل علی وزیر تعلیم تھے۔ بتایا گیا کہ ان کے سامنے بڑی احتیاط سے ہمیں بات کرنا ہوگی۔ اس لیے اگر وہ ناراض ہو تو سمجھیں ہمارا کام آگے نہیں چلے گا۔ ہم بڑے دباؤ میں آکر سہمے ہوئے وہاں بیٹھ گئے۔

خیر جب وہ مجلس میں آئی تو وہ چھوٹی سی تھی جیسے وہ ہوتی ہے نا! گڑیا، بس وہ گڑیا ہی لگتی تھی۔ تو بیٹھ گئے، ہم سب جمیعت کے عادی تھے کہ میٹنگ سے پہلے ذرا تعارف ہوجائے۔ تو اس نے کہا کہ میں جاپان کی ہوں۔ میں نے کہا جاپان میں کہاں سے۔ اس نے کہا ''سکاور'' ایک صوبہ ہے۔ میں نے کہا سکاور میں کس علاقے سے ہیں۔ اُس نے کہا کہ میں یونیورسٹی کے پاس رہتی ہوں۔ اس نے کہا آپ جانتے ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں وہ علاقہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ میرا علاقہ بھی آپ کے صوبے کی طرح ہے فرق صرف یہ ہے کہ آپ لوگوں نے ترقی کی ہے ہم ترقی نہیں کر پائے۔ جبکہ میرا علاقہ اُس سے زیادہ خوب صورت ہے اور لوگ بھی وہ مسکرا دی۔ شاید اسے یہ سب بہت اچھا لگا تھا۔ سرکاری میٹنگوں میں ایسے بات نہیں کرتے۔

اُس نے ایجنڈا کی جو فائل تھی وہ بند کر دی اور کہا کہ پتا ہے آپ لوگوں کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ اصل مسئلہ آپ لوگوں کا وسائل کی کمی نہیں ہے بلکہ جو آپ کے حکمران ہیں وہ رہتے ہیں عرش پر اور عوام رہتے ہیں فرش پر۔ یوں عوام اور آپ کے حکمرانوں کے درمیان

مجھے شوکت عزیز نے کہا مولوی صاحب! آپ نے اسے کس چکر میں پھنسا دیا ہے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

عرش اور فرش کے فاصلے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب حکومت ختم ہوتی ہے تو لوگ خوش ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ فاصلے کم کریں۔ دوسری بات اس نے یہ بتائی کہ آپ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ورلڈ بینک آپ لوگوں کو ترقی دے گا۔ یہ نہیں ہوتا ہے۔ کوئی دوسرے کو اتنا ہی مضبوط رکھنا چاہتا ہے کہ اس کے کام آتا رہے۔ کوئی بھی اپنے کسی ملازم کو باپ بنانا نہیں چاہتا۔ سر پر نہیں بٹھانا چاہتا جس طرح آپ لوگوں کا خیال ہے کہ ورلڈ بینک آپ کے ہر دکھ کی دوا ہے اور مدد کے لیے آئے گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا ہے، تو آپ کی عبادت کا وقت ہوگیا ہے، میٹنگ کے دوران ہم تو شوکت عزیز صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمارے ٹیم لیڈر دُرانی صاحب تھے، اسی احترام میں سب بیٹھے رہے اذان ختم ہوگئی تو اُس نے خود ہی کہہ دیا کہ آپ جا کر نماز پڑھیں۔ آپ کے مذہب کا بلاوا آگیا۔ ہم نے نماز عجیب شرمندگی کی حالت میں پڑھی، دل میں بہر حال ہم بہت افسردہ تھے کہ ہمیں خود اُٹھنا چاہیے تھا۔

واپس آئے تو انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں کی مقدس کتاب میں یہ چیز موجود ہے کہ خدا کسی کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ اپنی حالت بدلے، ہم نے کہا ہاں یہ آیت تو ہے۔ اس نے کہا کہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر آپ خود نہیں بدلتے تو دنیا کا کوئی آدمی باہر سے آکر آپ کو طاقت کا کوئی انجکشن نہیں دے سکتا۔ مجھے شوکت عزیز نے کہا کہ ''مولوی صاحب آپ نے کس چکر میں اس کو پھنسایا ہے۔ یہ ہمارا ایجنڈا نہیں ہے۔ مگر وہ جو ہم نے 20 منٹ کی باتیں کیں وہ بہت ساری کتابوں کا خلاصہ تھیں۔ اور میں اسی سوچ پہ اب بھی قائم ہوں کہ حکمرانوں اور عوام کے درمیان فاصلے نہ ہوں تو یہ زیادہ اچھا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہمارا زور اس پر ہو کہ ایک جیسا پروٹوکول ہو، دفتروں میں بند ہوں اور لوگوں سے دور تو اس سے نفرت اور حسد میں کمی نہیں آتی بلکہ اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نے تو اب تک اپنا نظام Approachable رکھا ہے۔

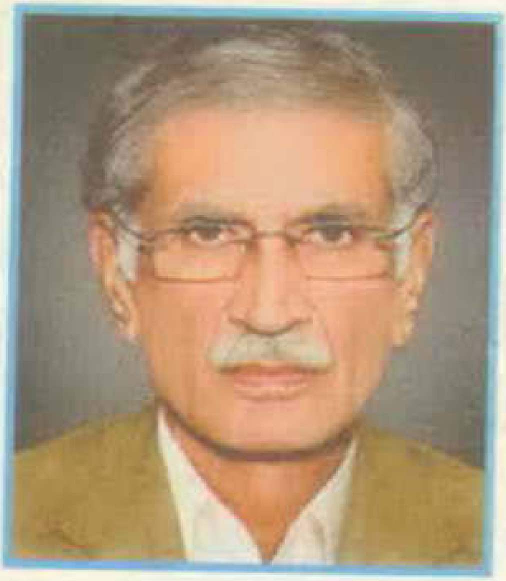

ایڈیٹر: گزشتہ جو دور تھا آپ کا ایم ایم اے کی وزارت کا، اُس میں جتنا Approachable تھا کیا اب بھی اُتنا ہی Approachable ہے؟

مہمان: اب بھی اُتنا ہی Approachable ہے۔

ایڈیٹر: جو باقی وزرا ہیں جماعت کے اُن کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے؟

مہمان: بالکل جماعت کے سارے ساتھیوں کا ایسا ہی ہے۔ الحمدللہ۔ ہم لوگ وزارت کی خاطر اپنا رویہ تبدیل نہیں کرتے۔

ایڈیٹر: آپ کے ساتھ پروٹوکول کی وہ گاڑیاں واڑیاں تو ہوتی ہیں ناں آخر آپ سینئر وزیر ہیں؟

جماعت کے وزراء آج بھی عام لوگوں کے لیے کیوں اپروچ ایبل ہیں؟

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مہمان: میرے ساتھ ایک پولیس والا ہوتا ہے۔

ایڈیٹر: ایک آدمی یا ایک گاڑی؟

مہمان: نہیں نہیں ایک پولیس والا۔ مجھ سے آگے سیٹ پہ بیٹھتا ہے۔

ایڈیٹر: وہ جو آگے گاڑی چلتی ہوتی ہے وہ آپ نہیں رکھتے؟

مہمان: نہیں وہ میں نہیں رکھتا۔

ایڈیٹر: جان بوجھ کے؟

مہمان: ایک بات تو یہ ہے کہ ہمارے جو اُٹھنے بیٹھنے کی جگہ ہے وہ عام کارکنوں کی ہوتی ہیں۔ تو ان چھوٹے لوگوں میں اونچے لوگوں کی جگہ نہیں ہوتی۔ بمشکل ہمیں جگہ ملتی ہے۔ تو جب وہ آپ کے ساتھ ہوں گے ناجی تو پھر ہر آدمی آپ کا میزبان نہیں بن سکتا، ناں ہر آدمی آپ سے مل سکتا ہے۔ اس لیے میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ پروٹوکول والے نہ ہوں۔

ایڈیٹر: جب دوسرے صوبے میں جاتے ہوں گے تو وہاں تو لازمی پروٹوکول کے تقاضے کے مطابق جاتے ہوں گے؟

مہمان: کبھی بھی نہیں کہا، ورنہ اگر ہم اپنا پروگرام بھیجیں شیڈول تو یہ پابند ہیں کرنے کے لیے لیکن میں کبھی نہیں کرتا۔

ایڈیٹر: اچھا سراج صاحب پچھلے دنوں تحریکِ انصاف نے شیر پاؤ کی قومی وطن پارٹی کے بارے میں کافی سخت الفاظ کہے ہیں اُن کے وزرا کے بارے میں کافی الزامات تھے جب کہ آپ لوگوں کے بارے میں اچھے سافٹ اور باعزت الفاظ کہے۔

مہمان: ہر پارٹی کا اپنا ایک ایجنڈا ہے۔ جماعت اسلامی کا تو ایک کلیئر ایجنڈا ہے کہ ملک میں شریعت کا نظام ہو۔ مدینہ منورہ کی حکومت ماڈل ہے۔ خلافت ہمارے لیے ایک Critical نمونہ ہے۔ اس طرح پی ٹی آئی نے بھی وعدے کیے تھے کہ کرپشن کا خاتمہ کریں گے۔ تو آفتاب شیر پاؤ صاحب کے جو وزرا تھے وہ ذرا پرانے مزاج کے لوگ تھے اُن کا یہ خیال تھا کہ شاید ہم اس طرح چلیں گے اور اُن کی بھی شاید مجبوریاں ہوں گی کہ الیکشن میں لوگ کچھ زیادہ خرچ کر لیتے ہیں تو پھر وہ اخراجات دوبارہ سرکار سے اور ادھر اُدھر سے جمع کیے جاتے ہیں۔ مسلسل اس طرح کی اطلاعات کے باعث بالآخر یہ ہمت والا کام بھی عمران نے کر دیا اور جہاں تک جماعت اسلامی کی

ڈیڈی گھر آن گھسا ہے

ایک چیز میں نے سنی بہت تھی۔ دیکھی نہیں تھی۔ برطانیہ گیا تو برمنگھم میں واقع بہت بڑے قلعے کے اندر قائم ''اولڈ پیپلز ہوم'' دیکھنے گیا۔ وہاں 60 بوڑھیاں اور 70 بوڑھے تھے۔ سبھی ہم عمر تھے۔ انھوں نے بتایا کہ جب کوئی پچاس سال سے زیادہ ہو جاتا ہے تو اس کے بچے انھیں اپنے ساتھ نہیں رکھتے یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ انہی دنوں ایک بوڑھا وہاں سے بھاگ کر اپنے بچوں سے ملنے گھر چلا گیا۔ اس کے گھر والوں نے فون کیا کہ ''بوڑھا گھر آن گھسا ہے آکر فوراً لے جاؤ۔'' جب بوڑھے کو پکڑ کر لائے تو وہ کہہ رہا تھا کہ میں تو سال بعد اپنے بچوں کو دیکھنے ان کی محبت میں گھر گیا تھا۔ مادہ پرستی، خود غرضی اور رشتوں کی اس بے حرمتی نے مجھے بہت افسردہ کر دیا تھا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بات ہے تو وہ ہر مجلس میں یہ بات کرتے ہیں۔ بلکہ ہم نہ بھی ہوں تو بھی اپنی مجالس میں اس پہ فخر کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی والے پورے اخلاص کے ساتھ ہمارے ساتھ ہیں۔ دینی اور منظم لوگ ہیں۔ پوری ذمہ داری اور ایمان داری کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں اور مناصب کو وقت دے رہے ہیں۔ اصل میں الیکشن میں زیادہ خرچ کرنا یہ بذاتِ خود فساد کی جڑ ہے۔

ایڈیٹر: آپ کو لگتا ہے یہ فساد روکا جا سکتا ہے یا یہ کم ہو سکتا ہے؟

مہمان: میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ روکا جا سکتا ہے۔

ایڈیٹر: کیسے؟

مہمان: ایک تو ٹی وی پر جس طرح یہ اشتہار بازی پر کروڑوں روپے بہا دیتے ہیں یہ بند ہو جائیں پھر ہم جیسے عام لوگوں کو بھی کام کا موقع ملے گا۔ اب اس الیکشن مہم میں تو ہم اس طرح تھے کہ ایک جہاز پہ جا رہا ہو اور دوسرا پیدل جا رہا ہو۔ اب میں نے اپنے حلقے میں الیکشن لڑ لیا نہ قرض کے نیچے آیا نہ کوئی حد توڑی۔ گزشتہ الیکشن میں بھی اور اس میں بھی کم از کم میں نے اپنی جیب سے خرچ نہیں کیا۔ ہمارے الیکشن میں داخلے کے وقت بھی جو فیس تھی جب وہ دینے کا وقت آیا تو ہمارے ثمر باغ کے ایک عام مخلص کارکن جو ایک لاری اڈے میں کام کرتا ہے، نے شدت سے خواہش کا اظہار کیا کہ وہ جمع کرائے گا تو وہ فیس اس نے جمع کروا دی۔

ایڈیٹر: آپ نے محسوس نہیں کیا کہ آپ کو خود جمع کرانا چاہیے تھی؟

مہمان: ایک تو مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں جاؤں گا تو فیس بھی مانگیں گے۔ میرا تو خیال تھا کہ بس دستخط کرنے ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ فیس بھی جمع کرائیں اور پھر کارکنوں کے اندر ایک جذبہ، خواہش اور شوق تھا کہ وہ خود فیس جمع کرائیں۔ تو اُس میں Choice کرنا بھی مشکل ہو گیا کہ کون جمع کرائے۔ پھر انھوں نے زیادہ اصرار کیا کہ ہمارا پیسا آپ قبول کر لیں اس کام میں کیونکہ وہ بھی جانتے ہیں کہ ہم انھی کے نمایندے ہیں۔ انھی کے لیے کام کریں گے۔ اپنے لیے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الیکشن مہم شروع ہوئی تو ہر طرف نوجوان تھے۔ کارکن بھی اور نئے جذبے کے ساتھ آنے والے مخلص ساتھی۔ بعض تو پارٹی کے بھی نہیں تھے۔ سب نے مل کر دو تحصیلوں میں اپنے طور پر فنڈ جمع کیے تو ایک جگہ پر

تم تقریر کیوں نہیں کرتے!

مالاکنڈ اسکول میں پروگرام کے لیے گیا ہوا تھا۔ اسکول کا ناظم اسٹیج پر کھڑا ہوا اور ایک ہی سانس میں اعلان کرنے لگا کہ فلاں صاحب تلاوت، فلاں صاحب نعت، فلاں صاحب تقریر پھر سوال و جواب اور آخر میں دعا ہوگی۔ وہ اعلان کر کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا۔ تلاوت و نعت ہوگئی۔ اسٹیج پر خاموشی تھی اس نے بیٹھے بیٹھے مجھے بہت اشارے کیے مگر میں یہ سوچ کر نہیں اُٹھا کہ آ کر اعلان تو کرے۔ وہ وہیں کھڑے ہو کر زور سے بولا۔ تم تقریر کیوں نہیں کرتے۔ اعلان کر تو دیا ہے میں نے کہا بھائی یہاں آ کر اعلان کرو۔ وہ بادل نخواستہ آیا اور غصے سے بولا۔ اب ناظم ڈویژن سراج الحق کی تقریر ہوگی۔ سوال و جواب ہوگا اور اس کے بعد دعا بھی یہ خود ہی کروائے گا۔"

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کارکنان نے کوئی 22 لاکھ روپے جمع کیے تھے اور دوسری تحصیل میں 16 لاکھ۔ اس میں بعض کارکنان ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنی اکلوتی گائے بیچ کر حصہ ڈالا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق حصہ لیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ Compaign کے بعد جو بچ گئے تو واپس کر آئے۔

ایڈیٹر: مطلب انہی لوگوں کو واپس کر دیے؟

مہمان: مطلب جو پیسے بچ گئے۔ یعنی سارے پیسے خرچ بھی نہیں ہوئے تھے۔

ایڈیٹر: جن لوگوں نے جمع کرائے ہوں گے اُن کو واپس کیسے کر دیے؟

مہمان: ظاہر ہے اُن کی لسٹ ہم نے بنائی تھی اُن کو رسید دی تھی۔ بعض ایسے کارکن تھے جنھوں نے اپنی اوقات سے زیادہ الیکشن فنڈ میں جمع کروایا تھا، وہ انتہائی غریب تھے، ہم نے اس لیے اُن کو واپس کر دیے۔

ایڈیٹر: انھیں آپ نے جذباتی کر دیا تھا یا وہ خود جذباتی ہوئے تھے فنڈ جمع کرانے کے موقع پر؟

مہمان: نہیں وہ خود جذباتی ہوئے تھے۔ ایک تو متحدہ مجلس عمل کی حکومت میں ہم نے اپنے حلقے میں عوامی کام زیادہ کیے تھے۔ تو اُن کا ایک جذبہ اور شوق ہی نہیں یقین بھی تھا کہ یہ اپنے عوام کو فائدہ پہنچائیں گے اگر یہ منتخب ہو گئے تو۔

ایڈیٹر: سراج صاحب آپ ایم ایم اے کی حکومت میں بھی سینئر وزیر تھے اور اب تحریکِ انصاف کے ساتھ شراکت میں بنی حکومت میں بھی یہی منصب آپ کے پاس ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ پچھلی حکومت کے بعد آپ لوگ Deffensive تھے جبکہ ابھی Deffensive نہیں ہیں یعنی وہ حکومت جب ختم ہونے والی تھی تو وزرا اور باقی لوگ یہ نہیں بتا پاتے تھے کہ ہم نے یہ کیا، ابھی وقت بہت تھوڑا گزرا ہے لیکن آپ کے سارے وزرا کے چہروں پہ اطمینان ہے۔ جب بات کرتے ہیں تو بڑے اعتماد سے کرتے ہیں۔ اور اُس سے زیادہ مختلف اور عجیب بات یہ ہے کہ جب لوگ اکیلے میں ہوتے ہیں تو اپنی اتحادی پارٹی کے خلاف بات نہیں کرتے۔ یہ کوئی پالیسی ہے، وقت کا جبر ہے یا آپ لوگوں نے اتحادیوں کے ساتھ اچھا وقت گزارنا سیکھ لیا ہے؟

مہمان: ایک تو آدمی سیکھتا ہے۔ پھر حکومت میں ہمارا خیال تھا کہ نیکی کر دریا میں ڈال، بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اب یہ بھی نہیں ہے کہ دوسروں کو بتائیں تو ہی پتا چلے۔ اس سے دوسرے بھی سبق لے لیتے ہیں۔ اس میں اور پہلی حکومت میں فرق تو ہے۔ وہ ہماری حکومت تھی، اس میں ہم شریک تھے۔ اُس میں ہماری

یہ پالیسی ہے، وقت کا جبر ہے یا آپ نے اتحادیوں کے ساتھ اچھا وقت گزارنا سیکھ لیا ہے؟

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تعداد زیادہ تھی 26 ممبران تھے۔ اب ہم آٹھ ہیں۔ اُس میں ہمارے ساتھ 8 وزرا تھے اب تین ہیں۔ لیکن ہم اس لیے بھی ایزی Easy ہیں، اس حکومت کے ساتھ کہ ان کا جو ایجنڈا ہے ریفارمز Reforms کا، وہی چیزیں ہیں جو ہمارے پروگرام میں پہلے سے شامل تھیں۔

ہمارے وزرا کی جو ٹیم ہے وہ ذاتی مال جمع کرنے کی فکر میں نہیں ہے۔ بلکہ اسے ہر لمحہ Deliver کرنے کی فکر ہے۔ ممبران بھی چاہتے ہیں کہ خیبر پختونخواہ میں اچھی کارکردگی دکھائیں تاکہ باقی ملک میں اُس کو مثال بناسکیں۔

ایڈیٹر: میں پچھلے دنوں پشاور گیا تو وہاں عام لوگوں سے آپ لوگوں کے بارے میں پوچھتا رہا تو اُن کا خیال تھا کہ اس دفعہ دونوں پارٹیوں کی لائن ایک ہے یعنی Aligned چل رہے ہیں اور لوگوں نے حیرت کا اظہار بھی کیا کہ جماعت اسلامی کے وزرا الگ سے گروپ بنا کر نہیں چل رہے بلکہ ٹیم کی طرح چل رہے ہیں اس وجہ سے ان کی رفتار اور سمت ٹھیک ہے کیا درست ہے عام لوگوں کا یہ تجزیہ؟

مہمان: ابھی تک ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں آیا۔ چھوٹی موٹی بات تو ہر جگہ ہوتی ہے۔ اگر ایک پارٹی کی حکومت ہو تو اس میں بھی مسائل تو ہوتے ہیں۔ اس طرح مخلوط حکومت چلانا یا اس میں چلنا بہت مشکل کام ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم سموتھ (Smooth) جارہے ہیں ایک دوسرے کو فتح کرنا بالکل کسی کے مدنظر نہیں ہے۔

اس کا ایک اضافی فائدہ ہم دونوں کو یہ ہوا ہے کہ ہمارے کام کو پی ٹی آئی والا ورکر اپنے میڈیا کے ذریعے پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی وہ ہمیں اپنا سمجھتے ہیں کہ انھوں نے پہلے دن سے ڈنڈی نہیں ماری، ہر مشکل وقت میں ڈٹ کر ساتھ کھڑے ہوئے ہیں۔ میں لندن کے بازار میں جا رہا تھا پیدل، تو پی ٹی آئی کا ایک نوجوان ملا اور ''ہاتھ ملایا اور بولا ہم آپ سے محبت کرتے ہیں، آپ پہ ہم فخر کرتے ہیں۔'' اس طرح کراچی ایئرپورٹ پر میں اُترا تو کرسیاں کم اور لوگ کافی تھے اور ایک خاتون اُٹھی اور میرے لیے جگہ خالی کر دی میرا خیال تھا کہ جماعت کے کسی گھرانے سے ہوں گی۔ انھوں نے کہا نہیں میں پی ٹی آئی کی ہوں۔ ہم آپ پر فخر کرتے ہیں اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ انھوں نے ہمیں دل سے قبول

لاش کو گھر سے نکالو

زندگی کا پہلا غیر ملکی دورہ نیپال کا کیا۔ میرے ساتھ امیر العظیم بھی تھے جو جمعیت میں مجھ سے پہلے ناظم اعلیٰ تھے۔ وہاں ہم شیخ تجمل الاسلام کے گھر ٹھہرے جو مقبوضہ کشمیر، جمعیت کے ناظم اعلیٰ رہے تھے اور ان دنوں بڑے مشکل حالات سے دوچار تھے۔ نیپال دنیا کی واحد ہندو ریاست ہے۔ شیخ تجمل کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ ان کا مالک مکان ہندو تھا۔ اس نے عورت کی لاش کو بدشگونی سمجھ کر تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس کا کہنا تھا ''فوراً لاش کو گھر سے باہر نکالو۔'' اس نے اس قدر پریشان کر دیا کہ مجبوراً چند ساتھیوں نے جنازہ پڑھا اور فوراً دفن کرنا پڑا۔ اپنا ملک، آزادی خودمختاری اور یہاں کی خوشی غمی کی سماجی اقدار بہت یاد آئیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کیا ہے۔ کسی طرح کی مجبوری نہیں ہے۔ نہ اُن کی مجبوری ہے نہ ہماری مجبوری ہے۔

ایڈیٹر: میرا مشاہدہ ہے کہ راہنما تنہائی کی محفلوں میں بات کرتے ہیں تو کارکن تک وہی بات جاتی ہے۔ یعنی آپ نے اگر کسی کے بارے میں اچھا کہا ہو تو نیچے تک وہی بات ٹرانسلیٹ ہوتی ہے اور وہی بات ٹرانسمٹ ہوتی ہے؟

مہمان: جی یہ ٹھیک بات ہے۔ ہم اپنی نجی محفلوں میں بھی پی ٹی آئی اور ان کے ساتھیوں کے حوالے سے Loose talk نہیں کرتے۔ وہ سب بھی محنت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ایڈیٹر: آپ جماعت کے وہاں تین وزرا ہیں اگر آپ لوگوں نے اپنی لائن لینی ہو یعنی اچانک کوئی الگ صورت حال پیدا ہوتی ہے، میٹنگ میں وزیراعلیٰ کے ساتھ یا کسی اور جگہ تو پہلے سے اپنا مائنڈ بنایا ہوتا ہے یا آپ نے جو کہا باقی دونوں آمنا وصدقنا کہتے ہیں اور مان لیتے ہیں؟

مہمان: ہم ایک دوسرے کے ساتھ تو مشاورت کرتے ہی ہیں لیکن پی ٹی آئی کے جو منسٹر ہیں اُن کے ساتھ بھی بہت کھل کر مشورہ کرتے ہیں۔

ایڈیٹر: وزیراعلیٰ سے کیسے تعلقات ہیں؟ ورکنگ ریلیشن شپ کیسی ہے؟

مہمان: ورکنگ ریلیشن بہت اچھا ہے۔ اب تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس کو ہم بوجھ محسوس کریں یا وہ بوجھ محسوس کریں۔

مہمان: پی ٹی آئی کے لوگ عمران خان صاحب یا وزیراعلیٰ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے ساتھ بات کرتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ ہمارے ان کے ساتھ تعلقات بہت اچھے ہیں، اُن کا اعتماد ہے۔ اس لیے ان کی بات پہنچ جائے گی۔ ہم بھی اس اعتماد کا مان رکھتے ہیں۔ خیال کرتے ہیں۔

ایڈیٹر: عمران خان سے آپ کی بڑی قربت ہے الیکشن سے پہلے بھی آپ اور پروفیسر ابراہیم صاحب ان سے ملتے رہے ہیں تو آپ نے کیسا پایا اُنھیں۔ جو عام ایک عوامی امیج ہے اس سے کتنا مختلف۔ لوگوں کا خیال ہے کہ جذباتی ہیں

شین ق کا مسئلہ

ضلع جھنگ کے قصبہ چیلا کے دورے کے دوران کارکنان نے بتایا کہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب بیمار ہیں۔ فوراً عیادت کا فیصلہ ہوا۔ ان کے گھر پہنچے انھوں نے منہ پھیر لیا۔ جو بات کریں وہ خاموش۔ مقامی حلقہ کے ناظم نے بالآخر ان سے پوچھ لیا کہ آپ جواب کیوں نہیں دے رہے۔ انھوں نے معصومیت سے کہا ''مقامی لوگوں کے ساتھ اُردو بولنا تو ٹھیک ہے۔ تمھارا ناظم تو اہل زبان ہوگا۔ اس کے ساتھ اُردو کیسے بولوں۔''

وہاں قہقہہ پڑا۔ سراج الحق بولے ''ہیڈ ماسٹر صاحب ہر منہ کی ایک زبان تو ضرور ہوتی ہے مگر میں وہ اہل زبان نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں کہ کراچی سے آیا ہوں۔ میں تو آپ کا سرحدی پہاڑوں سے آیا ہوا بیٹا ہوں اور میری شین ق بھی آج تک درست نہیں ہوئی۔ مذکر مونث کا مسئلہ الگ بنا رہتا ہے۔''

جمعیت نے تشدد کے حوالے سے 180 ڈگری کا یوٹرن کیوں لیا؟

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اُن کو Depth میں چیزوں کی سمجھ نہیں ہے؟

مہمان: بغیر جذبہ کے تو کوئی کام نہیں ہوتا ہے اور بڑے کام کے لیے جتنی خوبیاں اور Depth ہونی چاہیے اس کے بغیر بڑا کام ممکن نہیں ہوتا۔ میں نے تو عمران کو بڑا اچھا پایا۔ بات سنتا ہے۔ سمجھتا ہے۔ اسے تبدیلی کا درد بھی ہے اور عوام کی تربیت نہ ہونے کا بھی علم ہے۔ اسے بھی اپنے لوگوں سے توقعات ہیں، جو کبھی پوری ہوتی ہیں کبھی کمی رہ جاتی ہے۔

جماعت اسلامی پاکستان کے حوالے سے بہت سے سوال تھے۔ مگر سراج الحق صاحب طرح دے گئے۔ یقیناً اس کی وجہ آنے والے دنوں میں مرکزی امیر کا انتخاب ہے۔ اس لیے ہم نے بھی اصرار کیے بنا موضوع بدل لیا اور جمعیت میں ان کے تین سالہ نظامتِ اعلیٰ کے دور کے حوالے سے کچھ یادیں تازہ کیں۔ وہ جنوری 1980ء میں جمعیت کے رکن بنے تھے۔ مالاکنڈ ڈویژن اور پشاور کے ناظم رہنے کے بعد 3 سال صوبہ سرحد کے ناظم رہے۔ 1988ء میں جمعیت کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے جہاں انھوں نے تنظیمی ڈھانچے میں بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں کیں اور پہلی بار جمعیت مخالف طلبہ تنظیموں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے پروگراموں میں جانے لگی۔ خود سراج الحق کو ایم اے او کالج میں ایم ایس ایف نے بلایا۔

خاموش رہنے سے کلمہ شریف کا ذکر۔ درود شریف اور استغفار پڑھنا بہتر ہے

ہم نیک بنیں نیکی پھیلائیں

ہم انسانیت پسند اچھے مسلمان بنیں

درود و سلام کا حسین مجموعہ | پاکیٹ سائز
رابعہ بک لاہور 042-37123555

کتاب: نسیم ہدایت کے جھونکے
نومسلم بھائیوں بہنوں کے انٹرویوز
محترم مولانا کلیم صدیقی صاحب
مکتبہ خلیل لاہور 042-37321118

کتاب: ہمارا اسلام قبول کرنا
نومسلم بھائیوں بہنوں کے انٹرویوز
منشورات منصورہ لاہور 042-35434909

تبلیغی جماعت بیانات fb.com/QuranIlslam

طالب دُعا | شیخ محمد عاطف پوری اوکاڑہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ایڈیٹر: سراج صاحب! آپ کی نظامت اعلیٰ کے زمانے (91-1988ء) میں جمعیت کی شوریٰ نے تشدد کے حوالے سے 180 ڈگری یوٹرن کی پالیسی اپنائی تھی۔ اس کی اصل وجوہات کیا تھیں؟

مہمان: میں جاپان کے دورے پر گیا' تو 18 پی ایچ ڈی سکالرز سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے 14 وہ تھے جو کسی نہ کسی جگہ جمعیت کے ہاتھوں پٹے تھے۔ مجھے بہت دُکھ ہوا۔ خیال بھی آیا کہ کل یہ بڑے بڑے عہدوں پر جائیں گے اور عمر بھر اس تکلیف کو جو انھیں پہنچی یاد رکھیں گے۔ واپس آ کر میں نے شوریٰ

جماعت کے اندرونی نظام کی سختی

سراج الحق کی جماعت کے اندرونی حلقوں میں بھی اچھی پذیرائی ہے۔ چار سال قبل ہونے والے امیر کے انتخاب میں شوریٰ کی طرف سے دی گئی فہرست میں ان کا تیسرا نمبر تھا۔ ووٹوں کی گنتی میں البتہ دوسرے نمبر پر رہے۔ ووٹوں کے اس بہت تھوڑے فرق کا اس سال ہونے والے انتخاب پر کیا فرق پڑنے والا ہے۔ سیاسی مبصرین اور ناقدین بہت اشتیاق سے منتظر ہیں۔ کہا جاتا ہے جماعت کے اراکین میں حلقہ خواتین اور نوجوان بطور خاص سراج الحق کو امیرِ جماعت دیکھنے کے متمنی ہیں۔ حیرت انگیز طور پر انھیں پنجاب اور کراچی سے زیادہ ووٹ ملنے کی پیش گوئی کی جا رہی ہے۔ واقفانِ حال تو ان کے جماعت اسلامی پاکستان کے امیر بننے کا ذکر اس قدر یقین سے کرتے ہیں کہ سندھ سے تعلق رکھنے والے دو نوجوانوں کے قیم جماعت کے طور پر نام تک لیے جا رہے ہیں۔

ایک رائے موجودہ امیر سید منور حسن کے دوبارہ منتخب ہونے کے حوالے سے بھی سامنے آئی ہے مگر یہ رائے روایتی طور پر ووٹ ڈالنے والے جماعت کے بزرگ اراکین کی ہے جو ووٹ دیتے ہوئے زیادہ تردد نہیں کرتے اور روایات کو ہی بہتر پاتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے اندرونی نظام کی سختی کے باعث عام طور پر اندرونی انتخابات کے نتائج اور شخصیات کے نام آزادانہ طور پر زیر بحث نہیں لائے جاتے، کسی کے حق میں مہم چلانے کی تو سختی سے ممانعت ہے، مگر انتخابات کے نتائج میں جماعت کی شکست کے باعث تبدیلیٔ قیادت کے لیے ایک ردعمل بھی آہستہ آہستہ اُبھر رہا ہے۔ جماعت اسلامی کا ابتدائی حوالہ بھی خالص دینی جماعت کا نہیں ہے۔ اول روز سے اس کی دعوت میں زمام کار صالحین کے ہاتھ میں دینے کی پرزور بات کی گئی تھی۔ جماعت اسلامی کے نظام اور روایات کی اصل محافظ مرکزی مجلس شوریٰ رہی ہے۔ امیر جماعت کے کسی بھی فیصلے کو رد کرنے، روکنے یا بدلوانے تک کا اختیار عملی طور پر شوریٰ کو حاصل رہا ہے۔ یہاں تک کہ چار سال قبل جناب سید منور حسن نے امیر جماعت منتخب ہونے کے بعد جب اپنے قیم یا سیکریٹری کے لیے لاہور سے تعلق رکھنے والے ایک نسبتاً نوجوان سابق ناظم اعلیٰ کو پسند کر لیا تو شوریٰ نے اس پر صاد نہیں کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس موضوع پر طویل بحث کے بعد بھی شوریٰ قائل نہ ہو سکی تو پھر موجودہ قیم کا نام سامنے آیا جو اس وقت صوبہ پنجاب کے امیر تھے۔ روایت یہی رہی ہے کہ امیر جس صوبے سے ہو، قیم دوسرے صوبے سے ہوگا۔ ظاہر ہے اس کی کوئی شرعی وجہ تو نہیں ہوگی مگر مختلف حصوں سے قیادت کو آن بورڈ کرنے کے لیے یہ حکیمانہ طریقہ اختیار کیا گیا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کے ساتھیوں سے ذکر کیا۔ اسی دوران تعلیمی اداروں کی لڑائیاں کراچی، لاہور، ملتان، گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور بہاولپور جیسے شہروں میں کالجوں سے نکل کر گھروں اور محلوں تک پہنچ گئیں۔ ہمارے کارکنوں کے گھروں پر حملوں میں بہنیں بھی محفوظ نہ رہیں۔ کتنے ہی قیمتی ساتھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اخبارات بھی روز چیختی چلاتی سرخیاں لگاتے۔ لاہور میں ایم ایس ایف کے لوگوں نے ڈاکے، ہوٹلوں پر، مفت کھانا اور بھتہ لینے جیسے کام شروع کر دیے تھے۔ لڑائی جھگڑے کی صورت مخالفین کے نام جھوٹی ایف آئی آر کٹوائی جانے کا تو ایک مقابلہ شروع تھا۔ تین دن شوریٰ ہوتی رہی۔ ایک ایک ساتھی کو منایا۔ قائل کیا اور پھر طے ہوا کہ جمعیت پہل کرے گی، قربانی دے گی اور تمام غلط FIR رپورٹس واپس لے لی جائیں گی۔ بعض کیسز ایسے تھے کہ واقعات ہوئے تھے عینی شاہد اصل نہیں تھے۔

جب یہ فیصلہ ہوگیا تو ہر طرف سے سوالات اور اعتراضات شروع ہو گئے کہ ہمارا فلاں ساتھی شہید ہوا۔ فلاں کے گھر پہ حملہ ہوا۔ فلاں کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور ہم کیس واپس کیوں لے رہے ہیں۔ کراچی میں پورے ملک کا اجتماع ارکان بلوایا گیا تمام چیزیں ڈسکس ہوئیں۔ کچھ نے دل پر پتھر رکھ کر مان لیا۔ کچھ نے خوشی سے مان لیا۔ کئی معطلیاں اور اخراج بھی ہوئے۔ 5 ماہ لگے پھر رفتہ رفتہ حالات پر قابو پالیا گیا۔ غلط بیانی اور جھوٹ کے لیے دوسروں کی زیادتی وجہ جواز نہیں بن سکتی۔ جمعیت کے اس فیصلے کی برکت یہ ہوئی کہ لڑائیاں رُک گئیں۔ قتل و غارت کا سلسلہ بھی ختم گیا۔ جمعیت کا فوکس پھر دعوت پر ہوگیا۔

س: سراج صاحب آپ نے ''عرس'' جیسے موقع کو بھی دعوت پھیلانے کے لیے استعمال کر ڈالا تھا؟

ج: ہم نے دعوت کے لیے یہ غیر روایتی طریقہ اختیار کیا اور عرس کے مواقع پر اسٹال لگائے، نمائش، کیسٹس، سٹکرز، لٹریچر، آڈیو، وڈیو اسی طرح بلوچستان میں بی بی میلہ اور دوسرے مواقع کو استعمال کیا۔

ایڈیٹر: سراج صاحب سنا ہے ایک بار دبئی گئے ہوئے تھے۔ آپ کے ماموں میزبان تھے۔ انھوں نے خوب آؤ بھگت کی۔ کھانے کھلائے۔ سیر کرائی، ملاقاتیں کروائیں۔ ان کی ناراضی کا کیا قصہ ہے؟

مہمان: سراج الحق مسکرائے۔ بس وہ ایسے ہی ناراض ہوگئے جب وہ پشاور آئے تو ان کا خیال تھا میں سینئر وزیر ہوں، خوب آؤ بھگت ہوگی۔ جو خدمت میں ذاتی طور پر کرسکتا تھا۔ وہ تو کی مگر انھوں نے کہا وہ چترال جانا چاہتے ہیں۔ گاڑی کا انتظام کرو میں نے بتایا کہ میرے پاس ذاتی گاڑی نہیں ہے جو آپ کے ساتھ جائے۔ وہ بولے تم کس چیز کے وزیر ہو جو دو روز کے لیے گاڑی کا ارینج نہیں کروا سکتے۔ محکمے والے کو کہو گاڑیوں کی لائنیں لگ جائیں گی۔ میں نے معذرت کی کہ میں خزانے کا وزیر ہوں۔ گاڑیوں کا نہیں۔ پھر میں نے کبھی اپنے لیے نہیں مانگی آپ کے لیے کیسے مانگوں۔ اس پر وہ سخت ناراض ہوگئے۔ دوستوں کو پتا چلا تو ایک نے گاڑی بھجوا دی۔ یوں وقتی طور پر یہ مسئلہ حل ہوگیا مگر انھیں آج تک یہ سمجھنا مشکل ہے کہ یہ کیسا وزیر ہے جو سرکاری گاڑیاں اپنے لیے اور دوستوں عزیزوں کے لیے استعمال نہیں کرسکتا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

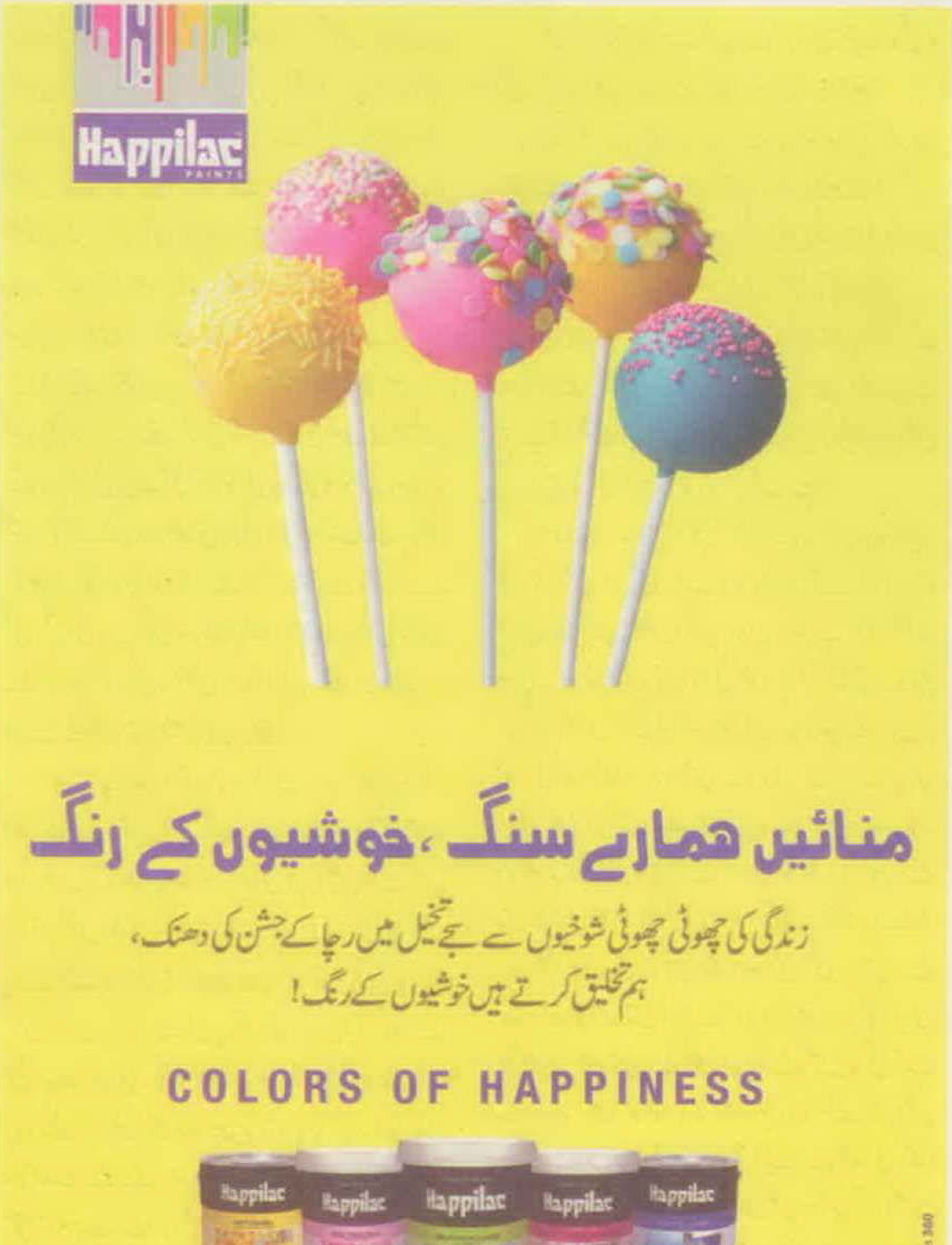

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

129

ذرا خبر لگوا دینا
عطاء الحق قاسمی کی سوانح عمری

187

نمک پارے
100 لفظوں سے مکمل ہونے والی گدگداتی کہانیاں

169

کرکٹ کے میدانوں میں پھوٹنے والی ہنسی

اُردو ڈائجسٹ کی ڈالی پر کھلا ہے
طنز و مزاح نمبر کا خوب صورت پھول

خاص نمبروں کے موسم بہار میں اس ماہ طنز و مزاح نمبر کا خوب صورت پھول کھلا ہے۔ اُردو ڈائجسٹ کی ڈالی پر بیسے ملک کے نامور مزاح نگاروں، شاعروں اور مزاحیہ نثر پاروں نے اسے واقعی خاص بنا دیا ہے۔ اس میں جہاں مزاح کی پہچان بننے والی بہترین تحریروں سے اقتباس اور انتخاب پڑھ سکیں گے وہاں بالکل نئی تحریریں بھی آپ کو لبھائیں گی۔ جناب چراغ حسن حسرت کا خیال تھا کہ ہنسی کا مرکز پیٹ ہے۔ پیٹ کو ذرا گدگداؤ، ہنسی پیٹ سے کولہوں کی طرف بڑھے گی پھر منہ کا رخ کرے گی۔ کیونکہ ہر شخص کے پیٹ میں قہقہے بھرے پڑے ہیں جو تلی کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہیں۔ جتنا بڑا پیٹ ہو، اتنے ہی زیادہ قہقہے اس میں سما سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن کی توند بڑھ جاتی ہے وہ خوب ہنستے ہیں۔ اس کے برعکس ایک خیال یہ بھی ہے کہ ہنسی اور مسکراہٹ کا تعلق پڑھنے والے کی دلی کیفیت سے ہوتا ہے جو کبھی بے معنی لفظوں پہ قہقہے لگوا دیتی ہے اور کبھی ہنسی کا گول گپا دیکھ کر بھی مسکرانے پر آمادہ نہیں ہونے دیتی۔

ہم اپنے قارئین کے دل کی خوشی ہی نہیں پیٹ کی سلامتی کے بھی متمنی ہیں، اسی لیے ایک متوازن طنز و مزاح نمبر پیش ہے۔ آپ صرف مسکرانا چاہیں یا کھل کر قہقہے لگانے پہ آمادہ ہوں یہ آپ کا استحقاق ہے۔ آئیے اب ایک نظر ڈالتے ہیں کہ اس شمارے میں کیا کیا ہے اور کس کس کی تحریروں سے اسے ہم نے سجایا ہے۔

(اختر عباس۔ ایڈیٹر)

دیکھنا تقریر کی دہشت 180
ذکر معروف لوگوں کی اداکاری کا جو وہ اپنی تقریروں کے دوران کرتے رہے

ہار ن دے کر پاس کریں 113
ایک اکاؤنٹس آفیسر کی رخصتی کا مسکراتا حجر

بے چارے سرکاری ملازمین 184
کام روڑی ڈالنے کے ماہرین اور ان کے بہانے

اور بستہ کھل گیا 97
ایک معصوم بچے کی شرارتوں کا احوال

ملہوترا کے کتے 145
ایک مزاحیہ شاعر کی زندگی سے جڑے دلچسپ واقعات

بشریٰ رحمن کی سنگھار کانفرنس 257
وہاں دس خوبصورت ساڑیاں مدعو تھیں

اُردو کی آخری کتاب 177
اسے ابن انشاء نے لکھا تھا

آپریشن پلان خروس 135
ایئرفورس کے چار جوانوں کا مشن آپ کو مسکرانے پر مجبور کر دے گا

اُردو کی پہلی کتاب (جدید) 117
اسے ناظم یوسف نے لکھا ہے

گھوڑا اور کار بوریٹر 133
انسانوں میں بے خبر سفید گھوڑوں کا دلچسپ ماجرا

انجم انصار کی چٹ پٹی تحریریں 266
ملک کے مایہ ناز مزاح نگاروں، شاعروں اور مزاحیہ نثر پاروں سے سجا ہوا

کھلکھلاتی، گدگداتی اور مسکراتی تحریروں سے سجا

طنز و مزاح نمبر

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کاروان علم فاؤنڈیشن پاکستان

رجسٹرڈ
قائم شدہ 2004

بے وسیلہ جوہر قابل کو اپنائیے
قوم کا مستقبل تابناک بنائیے

الحمدللہ

ہر سال سینکڑوں کم وسیلہ پاکستانی طلباء و طالبات مختلف شعبہ جات میں اعلیٰ پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں

آپ ایک بے وسیلہ، باصلاحیت طالب علم کے اخراجات اپنے ذمے لے کر زندگی سازی کے اس عظیم قومی منصوبے میں شریک ہو سکتے ہیں

268 مزید کم وسیلہ باصلاحیت طلباء و طالبات کی درخواستیں سال 2013-14 کے لئے مندرجہ ذیل شعبوں میں زیر غور ہیں

ایم بی بی ایس	69	بی ایس انجینئرنگ	110	بی ایس سی آنرز (اینمل سائنس)	3	ایم اے	2	ایف ایس سی	8
ڈاکٹر آف فارمیسی	2	ڈپلومہ انجینئرنگ	1	بی ایس سی (ڈیری ٹیکنالوجی)	11	ایم کام	2	بی بی اے	1
ڈاکٹر آف فزیوتھراپی	2	بی ایس آنرز	32	بی کام	2	سی اے	1	بی اے	1
ڈاکٹر آف ویٹرنری سائنسز	10	بی ایس سی آنرز (ہوم سائنس)	7	بی کام آنرز	2	ایم بی اے	1	اے سی سی اے	1

کم وسیلہ باصلاحیت پاکستانی طلبہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے عطیات، صدقات اور زکوٰۃ کی فراہمی

- مذہبی فرض کی ادائیگی
- صدقہ جاریہ
- قومی ترقی میں اہم کردار

Meezan Bank
BOP
THE BANK OF PUNJAB

میزان بنک سمن آباد، لاہور پاکستان اکاؤنٹ نمبر 0240 0100882859
بنک آف پنجاب سمن آباد، لاہور پاکستان اکاؤنٹ نمبر 0110 002 000424 0003
بنک آف پنجاب شاہراہ فیصل کراچی پاکستان اکاؤنٹ نمبر 0247 002 000827 0003

گھر سے عطیات کی وصولی کے لئے رابطہ
لاہور: محمد حسن
0322-4664519
اسلام آباد: کلیم اللہ چوہدری
0321-5587250

usa account: 'karwan-e-ilm foundation' a/c # 601215082 habib American bank
1585 oak tree road, islin nj 08830

لاہور 19/21 بلاک ایکسٹینشن، ایوان اردو ڈائجسٹ سمن آباد، لاہور فون: 042-37522741-42 فیکس: 042-37552576
آفس موبائل: 0345-8461122، 0333-8461122، 0321-8461122 ای میل: info@kif.com.pk
کراچی آفس: 3/1 سی، بلاک 6، پی ای سی ایچ ایس، کراچی فون: 021-34382303 فیکس: 021-34532420 موبائل: 0300-9280487
اسلام آباد آفس: کمرہ نمبر 5، فرسٹ فلور، مسرت آرکیڈ G-11 مرکز، اسلام آباد فون: 051-2220933 موبائل: 0321-5587250، 0300-8187044

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

یہ ہیں ملک کے مایہ ناز مزاح نگار اور شاعر
جن کی تحریریں، نثر پاروں اور اشعار سے یہ خاص نمبر بنا ہے

مشتاق احمد یوسفی: 4 ستمبر 1923ء میں ٹونک (راجستھان) بھارت میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے فلاسفی اور ایل ایل بی کیا۔ ایم سی بی، الائیڈ بینک اور یونائیٹڈ بینک میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ستارہ امتیاز، ہلال امتیاز اور قائداعظم یادگاری میڈل پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز ایوارڈ اور ہجری ایوارڈ پا چکے ہیں۔ منفرد مزاح نگار ہیں۔ بقول ابن انشاء ہم مزاح نگاری کے عہد یوسفی میں جی رہے ہیں۔''

ابن انشاء: (پیدائش جالندھر 1927ء۔ وفات کراچی 12 جنوری 1978) جامعہ پنجاب سے بی۔اے اور جامعہ کراچی سے ایم اے کیا۔ سنجیدہ شاعری اور مزاحیہ نثر نگاری میں نام پیدا کیا۔ مختلف قلمی ناموں سے دس سال تک روزنامہ امروز لاہور، جنگ کراچی اور ہفت روزہ اخبار جہاں میں فکاہیہ کالم لکھتے رہے۔ کئی سفرنامے، اور شعری مجموعے ان کی یادگار ہیں۔

سید احمد شاہ پطرس بخاری: یکم اکتوبر 1898 کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ کالج پشاور سے حاصل کرنے کے بعد 1916 میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔ آپ عظیم اردو مزاح نگار، ماہر تعلیم اور سیاستدان تھے۔ اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب رہے۔ ڈی جی آل انڈیا ریڈیو اور گورنمنٹ کالج لاہور میں انگلش کے پروفیسر بھی رہے۔ مرزا محمد سعید ان کے استاد تھے۔ فیض اور ن م راشد شاگرد تھے۔ دسمبر 1958 میں امریکہ میں فوت ہوئے اور نیویارک میں دفن ہوئے۔

عطاء الحق قاسمی: پیدائش فروری 1943 ۔شاعر، ادیب، مزاح نگار، پروفیسر، سابق سفیر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ خواجہ اینڈ سن اور شب دیگ جیسے مقبول ٹی وی ڈراموں کے خالق اور ستارۂ امتیاز یافتہ ہیں۔ الحمرا آرٹس کونسل کے چیئرمین ہیں۔ جنگ میں کالم 'روزن دیوار سے' لکھتے ہیں۔ جس محفل میں موجود ہوں مرکز نگاہ اور ان کی گفتگو فردوس گوش ہوتی ہے۔

بریگیڈئر محمد صدیق سالک: 6 ستمبر 1935 میں منگلیاں کھاؤں گجرات میں پیدا ہوئے۔ اور 17 اگست 1988 کو فضائی حادثے میں جاں بحق ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے انگلش میں ایم اے، انٹرنیشنل ریلشنز کی ڈگری حاصل کی۔ ڈھاکہ فال کے بعد بھارتی قیدی بنے اور آگرہ جیل میں رہے۔ 3 انگریزی اور 6 اردو تصانیف ہیں جن میں 'میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'، ہمہ یاراں دوزخ، شامل ہیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بشریٰ رحمٰن: 24 اگست 1944ء کو پیدا ہوئیں۔ گورنمنٹ کالج ملتان سے بی اے اور جامعۂ پنجاب لاہور سے جرنلزم میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ مشہور ناول نگار، افسانہ نگار اور سفرنامہ نگار ہیں۔ حکومتِ پاکستان نے ستارۂ امتیاز کا اعزاز عطا کیا اس کے علاوہ مختلف اداروں اور انجمنوں کی طرف سے 12 سے زائد ایوارڈ حاصل کرچکی ہیں۔ ذائقہ بدلنے کے لیے مزاحیہ شاعری بھی کرلیتی ہیں۔

انور مسعود: 8 نومبر 1935ء گجرات میں پیدا ہوئے۔ زمیندار کالج گجرات سے بی۔اے کیا۔ 1961ء میں اورینٹل کالج لاہور سے فارسی میں ایم اے کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اسلامیہ ہائی اسکول کنجا میں مدرس رہے پھر پنجاب کے مختلف کالجوں میں تدریس کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ اردو پنجابی میں آپ کی شاعری عوام میں بہت مقبول ہے۔

سید ضمیر جعفری: (21 جنوری 1916ء۔ 12 مئی 1999ء) سنجیدہ اور مزاح گو شاعر، نظم و نثر میں 78 کتب کے مصنف، تمغۂ قائداعظم اور پرائیڈ آف پرفارمنس کے حامل، پاکستان آرمی کے علاوہ مختلف حکومتی اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ انہیں اردو زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ دنیا بھر میں مشاعروں میں شرکت کی۔

سرفراز شاہد: 29 اکتوبر کو پیدا ہوئے۔ حصولِ تعلیم کے بعد ماہر موسمیات کی حیثیت سے سرکاری ملازمت کی۔ پاکستان جرنل آف میٹریالوجی اسلام آباد کے ایڈیٹر، بزم اکبرالٰہ آبادی کے اعزازی سیکرٹری جنرل اور سہ ماہی خوش نما اسلام آباد کے ایڈیٹر ہیں۔ بلاتکلف، ہیراپھیری، کچھ تو کہیے، گفتہ شگفتہ، چوکے چھکے، ڈش انٹینا مشہور تصانیف ہیں۔

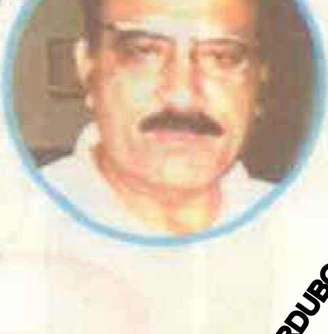

ضیاء الحق قاسمی: (5 فروری 1935ء۔ 26 اکتوبر 2006) اردو لٹریچر میں ایم۔اے پاس کیا۔ بہت سے ٹی وی پروگرام پیش کیے۔ 40 سال کی عمر میں مزاحیہ شاعری شروع کی اور جلد ہی مزاح گو شاعر کے طور پر مشہور ہوگئے۔ آپ ''ظرافت'' کے ایڈیٹر تھے، مزاحیہ شاعری پر کئی کتب رنگِ ظرافت، ضیا پاشیاں، چھیڑ خانیاں کے علاوہ سنجیدہ شاعری کی کتاب ہرے بھرے زخم بہت مشہور ہیں۔ عطاء الحق قاسمی آپ کے چھوٹے بھائی ہیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.COM

ضروری التماس!

معزز خواتین وحضرات!

www.aiourdubooks.net کو پسند کرنے کے لئے آپ سب کا بہت بہت شکریہ! ہماری ویب سائیٹ کا مقصد علم وادب کی ترقی وترویج ہے۔ جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ کتابیں پڑھنے کا شوق دن بدن کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے۔ اس امر کی کئی وجوہات ہیں لیکن سب سے بنیادی وجہ کتابوں کی بڑھتی ہوئی قیمتیں ہیں۔ ہمارا اولین مقصد عوام الناس کو اعلیٰ کتابیں اور وہ بھی مفت فراہم کرنا ہے۔ امید ہے آپ سب ہمارے اس عظیم مقصد کی تائید کرتے ہیں۔ ہم (www.aiourdubooks.net) آپ کو نیٹ کی وسیع دنیا سے ہر قسم کی کتابیں فراہم کرتے ہیں۔ ہم بلا معاوضہ آپ کی اور علم وادب کی یہ خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ اس کے جواب میں ہم آپ سے درج ذیل باتوں کی توقع کرتے ہیں۔

۱۔ برائے مہربانی www.aiourdubooks.net کا نام اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ تاکہ اگر کسی وجہ سے سائیٹ گوگل میں نہ بھی ملے تو باآسانی ہماری سائیٹ تک پہنچ سکیں۔

۲۔ اگر کوئی کتاب پسند آئے تو اسے Share ضرور کریں تاکہ اور دوست احباب بھی اس سے مستفید ہوسکیں۔

۳۔ اس کے علاوہ آپ ہماری سائیٹ چھوڑنے سے پہلے شکریہ ادا کرتے جائیں تو ہم اس کے لئے شکرگزار ہوں گے۔

منجانب:۔

انتظامیہ:www.aiourdubooks.net

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

وہ سیاست کے ''میاں'' ہیں اور اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں، اس سے انھوں نے اپنا ''لوہا'' منوایا ہے۔ وہ پاکستان کے واحد سیاست دان ہیں جن کا نام جو بھی لیتا ہے، انھیں شریف ضرور کہتا ہے۔ مہاتما گاندھی جب تک بولنے نہ لگتے، سیاست دان نہ لگتے۔ یہ بھی جب تک بولنے نہ لگیں ''شریف'' کے بیٹے لگتے ہیں، سیاست دان نہیں لگتے۔ چپ ہوں، تو لوگوں کو شُبہ ہوتا ہے کہ انھیں سیاست کا کچھ پتا نہیں، بولیں تو یہ شُبہ دور ہو جاتا ہے۔

سٹیل مین

پاکستانی سیاست کی سب سے اہم شخصیت کا مسکراتا خاکہ
جسے آج کے نمایاں ترین مزاح نگار نے لکھا ہے

ڈاکٹر محمد یونس بٹ

شکل وصورت ایسی کہ جب وہ کچھ بھی نہیں تھے، تب بھی کچھ تھے۔ کالج کے زمانے میں پروفیسر مشکور حسین یاد انھیں کلاس میں کھڑا کر کے کہتے ''مسٹر تم ہنس کیوں رہے ہو؟'' تو یہ جواب دیتے ''سر میں ہنس تو نہیں رہا، میری شکل ہی ایسی ہے۔'' اپنے پہلے ہی الیکشن میں اخباروں اور اشتہاروں میں ایسی رنگین تصویریں چھپوائیں کہ انھیں حکومت نہ ملتی، تو فلمیں ضرور مل جاتیں۔ اتنے اچھے ماحول میں پرورش پائی کہ ان کے بڑے ہو کر سیاست دان بننے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس گھرانے میں تو پارٹی سے مراد بھی کھانے کی پارٹی لیا جاتا۔ وہ صنعت سے سیاست میں آئے اور سیاست صنعت میں آ گئی، ایسی صنعت جس میں لاکھ لگاؤ اور ساکھ کماؤ، ساکھ لگاؤ اور لاکھ بناؤ۔ سیاست کے لیے دولت ماں کا دودھ ہے۔ سمرسٹ ماہم نے کہا تھا ''دولت چھٹی حس ہے لیکن اس کے بغیر آپ دوسری پانچ حسوں کو بھی استعمال نہیں کر سکتے۔'' میاں صاحب بڑے سے بڑا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

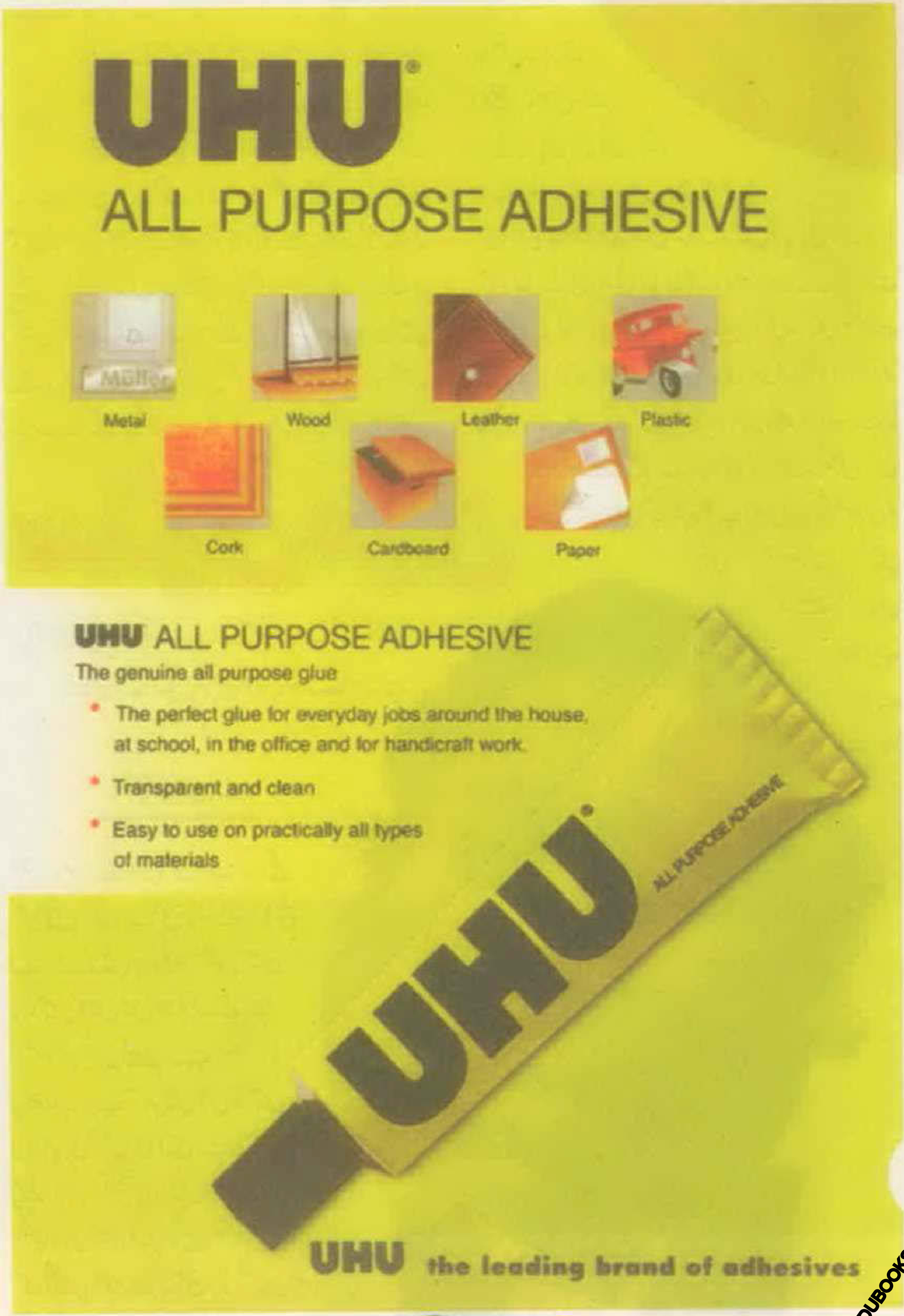

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کیس بھی "بریف کیس" بنا دیتے ہیں۔ بقول ایما ڈنکن "نواز شریف تحریک استقلال میں بینک کی حیثیت رکھتے تھے، ضیاء الحق نے اسے قومیا دیا۔" پہلے "فدا مسلم لیگ" پر فدا رہے پھر مسلم لیگ ان پر فدا ہوگئی۔ بقول پیر پگاڑا "ضیاء الحق نے مارشل لا دور میں جو وزیراعلیٰ تخلیق کیے، ان میں سے ایک ہیں۔"

پنجاب میں کبھی ٹوانہ خاندان سیاست میں اہم تھا، پھر ایسے جاگیردار روپے میں ٹو۔ آنہ ہی رہ گئے۔ میاں صاحب صنعت کار ہیں، یوں صنعت اور کار پر روانی سے بولتے ہیں۔ بقول ٹائم "وہ خارجہ پالیسی کے بجائے مرسیڈیز کاروں پر زیادہ روانی سے گفتگو کرتے ہیں۔" خدا نے انھیں بہت کچھ دیا اور یہ بتانے کے لیے خدا نے انھیں کیا کیا دیا ہے، مشیر دیے۔ یہ سب "اتفاق" کی برکت ہے۔ بھٹو مرحوم نے تو "اتفاق" کو ختم کرنا چاہا اور وہ ملک سے اتفاق ختم کرنے میں کامیاب بھی ہوئے مگر اتفاق سے ضیاء الحق آگئے۔ تب سے ملک میں ہر طرف "اتفاق" ہی نظر آتا ہے۔

پنجاب کی دوستی، سندھ کی سادگی، سرحد کی دشمنی اور بلوچستان کی ویرانی مشہور ہے۔ لیکن اگر کوئی سیاست کی دوستی کی تعریف کر رہا ہو، تو یقین کر لیں وہ میاں صاحب کی تعریف کر رہا ہوگا۔ دوستوں کے ساتھ ملتے ہوئے دوست، تاجروں کو ملتے ہوئے تاجر، بچوں کو ملتے ہوئے بچہ اور حکمرانوں کو ملتے ہوئے حکمران ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہاں تو سکندر مرزا جیسے حکمران بھی گزرے ہیں جو بیوی سے ملتے ہوئے بیوی ہوتے تھے۔

وہ بات کھلے دل، منہ اور جیب سے سنتے ہیں۔ پہلے تقریر یاد کر رہے ہوتے، تو لگتا ان کا امتحان ہے مگر جب وہ تقریر کرتے، تو لگتا امتحان سننے والے کا ہے۔ لکھی تقریر یوں کرتے جیسے فی البدیہہ کر رہے ہوں یعنی بے ربط۔ اب وہ تقریر یاد کر کے نہیں کرتے، تقریر وہ کرتے ہیں، یاد لوگ کرتے ہیں۔ ان کی انگریزی سمجھنے کے لیے بندے کے لیے اُردو جاننا ضروری ہے۔ کہتے ہیں گورنر میاں اظہر صاحب بی۔اے ہیں مگر لگتے نہیں، غلام حیدر وائیں میٹرک پاس ہیں اور لگتے بھی ہیں جبکہ میاں صاحب ایم۔اے پاس نہیں ہیں مگر لگتے ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں بھی رہے، جی ہاں چند گھنٹے وہاں رہے۔ وہ پاکستان کے سب سے مہنگے لیڈر ہیں، جلسوں میں ان کی تقریروں کا ایک ایک لفظ لاکھ لاکھ کا ہوتا ہے کبھی تو جلسوں پر اتنا خرچہ آتا ہے کہ ایک ایک لفظ کئی کئی لاکھ کا پڑتا ہے۔ ہمارے بوڑھے سیاست دان تو جوڑ توڑ اور جوڑ درد میں مبتلا رہتے ہیں لیکن میاں صاحب نوجوانی میں مبتلا ہیں۔ بندہ ان کے پاس جس مسئلے کے ساتھ جائے جب واپس آتا ہے، تو وہ مسئلہ نہیں ہوتا اگر مسئلہ وہی ہو تو بندہ وہ نہیں ہوتا۔ مخالفوں کی ہر بات کا جواب ترکی بہ ترکی ہی نہیں دیتے ترقی بہ ترقی بھی دیتے ہیں۔

رنجیت سنگھ کے بعد پنجاب پر سب سے زیادہ حکومت کرنے والے حکمران ہیں۔ جیسے کہتے ہیں سکھ خالصتان ابھی تک اس لیے نہیں بنا سکے کہ ان کے لیڈر بڑے سکھ ہیں۔ لیکن میاں صاحب اَن سکھ سیاست دان ہیں، رنجیت سنگھ تو ہر کسی کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتے، یہ تو ہر کسی کے لیے الگ آنکھ رکھتے ہیں۔ اپنی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے کام کرتے ہیں۔ وہ متاثر کرنے کی کوشش نہیں کرتے شاید اسی لیے متاثر کرتے ہیں۔ اپنے دُھن اور دَھن کے پکے ہیں۔

وزیر اعلیٰ پنجاب تھے تو لوگ انھیں لاٹ صاحب نہ کہتے اَلاٹ صاحب کہتے۔ وزیر اعلیٰ تھے تو

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پلاٹ یوں دیتے جیسے وزیراعظم بن کر پیلی ٹیکسیاں دیں۔ دوستوں کو دیکھ کر بے اختیار ان کی طرف نہیں لپکتے، بااختیار لپکتے ہیں۔

ہر وہ کام کرتے ہیں جس میں فائدہ ہو۔ وہ تو ہر کسی سے مسکرا کر بھی شاید اس لیے ملتے ہیں کہ انھیں پتا ہوگا کہ مسکرانے پر 15 مسلز کو کام کرنا پڑتا ہے جبکہ تیوریاں چڑھانے میں 65 مسلز کام پر لگتے ہیں۔ والد صاحب انھیں سخت سزا دینا چاہتے تو کتاب دیتے۔ ان کی پسندیدہ بک، چیک بک ہے۔ غلطی کرنا انسان کا کام ہے اور اسے دوسروں کے کھاتے میں ڈالنا سیاست دان کا۔ صفائی کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ جس کام کے پیچھے پڑتے ہیں ہاتھ دھو کر پڑتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں ان کے بارے میں بُری رائے رکھیں، تو انھیں کبھی نہ ملیں اور اگر آپ چاہتے ہیں ہمارے بارے میں اچھی رائے رکھیں تو ہمیں کبھی نہ ملیں۔

کرکٹ پسند ہے، ہمیں یہ اس لیے ناپسند ہے کہ اس میں کئی ''اوور'' ہوتے ہیں۔ کرکٹ میں کوئی ''نوبال'' کہہ دے تو بُرا مان جاتے ہیں کہ کھیل میں ذاتیات پر نہیں اُترنا چاہیے۔ بچپن میں کرکٹ کھیلتے، محلے کی ٹیمیں ٹاس کرتیں جو جیت جاتی یہ اس کی طرف سے کھیلتے حالانکہ ہمارے بچپن میں دونوں ٹیمیں ٹاس کرتیں، جو ہار جاتی اُسے ہمیں اپنی ٹیم میں شامل کرنا پڑتا۔ عوامی سوٹ انھیں سوٹ کرتا ہے۔ دن میں کئی بار لباس بدلنے کی عادت ہے، یہ تب سے ہے جب ابھی وہ چند ماہ کے تھے۔

وہ پیاس سے مرے جا رہے ہوں تب بھی ان کے ہونٹ سوکھے نظر نہیں آئیں گے اور اگر ان کے ہونٹ خشک ہیں، تو وہ پیاسے نہیں ہیں۔ خوب صورتی میں وہاں تک چلے جاتے ہیں جہاں تک خوب صورتی جاتی ہے۔ بُرے کو ہی اس کے گھر تک چھوڑ کر نہیں آتے، اچھے کو بھی اُس کے گھر تک چھوڑنے جاتے ہیں۔ سیاست میں صحت مندانہ رجحان لانے کے لیے صحت کو بہتر بنانے کا رجحان ہے۔ اگر وہ اپنے سُسرال میں ایک قدم رکھیں تو دوسرا قدم اکھاڑے میں پڑتا ہے۔ ویسے کُشتی اور سیاست میں یہی فرق ہے کہ کُشتی لڑنے والا اپنے کپڑے خود اُتارتا ہے۔ نوجوانی میں وہ دوستوں سے یوں گھل مل جاتے، لگتا مل نہیں رہے ''گھل'' رہے ہیں۔

اقتدار نے انھیں پروان چڑھایا اب وہ اقتدار کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ ایسی شخصیت ہیں کہ جس کاندھے پر ہاتھ رکھ دیں وہ ان کو کاندھا دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بڑے حتمی اور حاتمی فیصلے کرتے ہیں۔ ان پارٹیوں کو ملا کر حکومت کی جو مل کر گھوڑا بناتے تو جو بنتا وہ اونٹ ہوتا۔ انھیں گالی دی جائے، تو وہ لوٹاتے نہیں جس کی وجہ پیپلز پارٹی یہ بتاتی ہے کہ بزنس مین ہیں جو ملے گا واپس نہیں کریں گے۔

انھوں نے کئی بندوں کو سیاست دان بنایا اور کئی سیاست دانوں کو بندہ بنایا۔ ویسے بھی اقتدار کی سیڑھی پر چڑھنے کے لیے اپنے سے اوپر والے کے پاؤں کو سر سے اور نیچے والے کے سر کو پاؤں سے ٹھوکر مارنا پڑتی ہے۔ بہرحال میاں صاحب وہ خاص آدمی ہیں جو کبھی کبھی عام آدمی بن کر وہی محسوس کرتے ہیں جو عام آدمی کبھی کبھی خاص بن کر محسوس کرتا ہے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

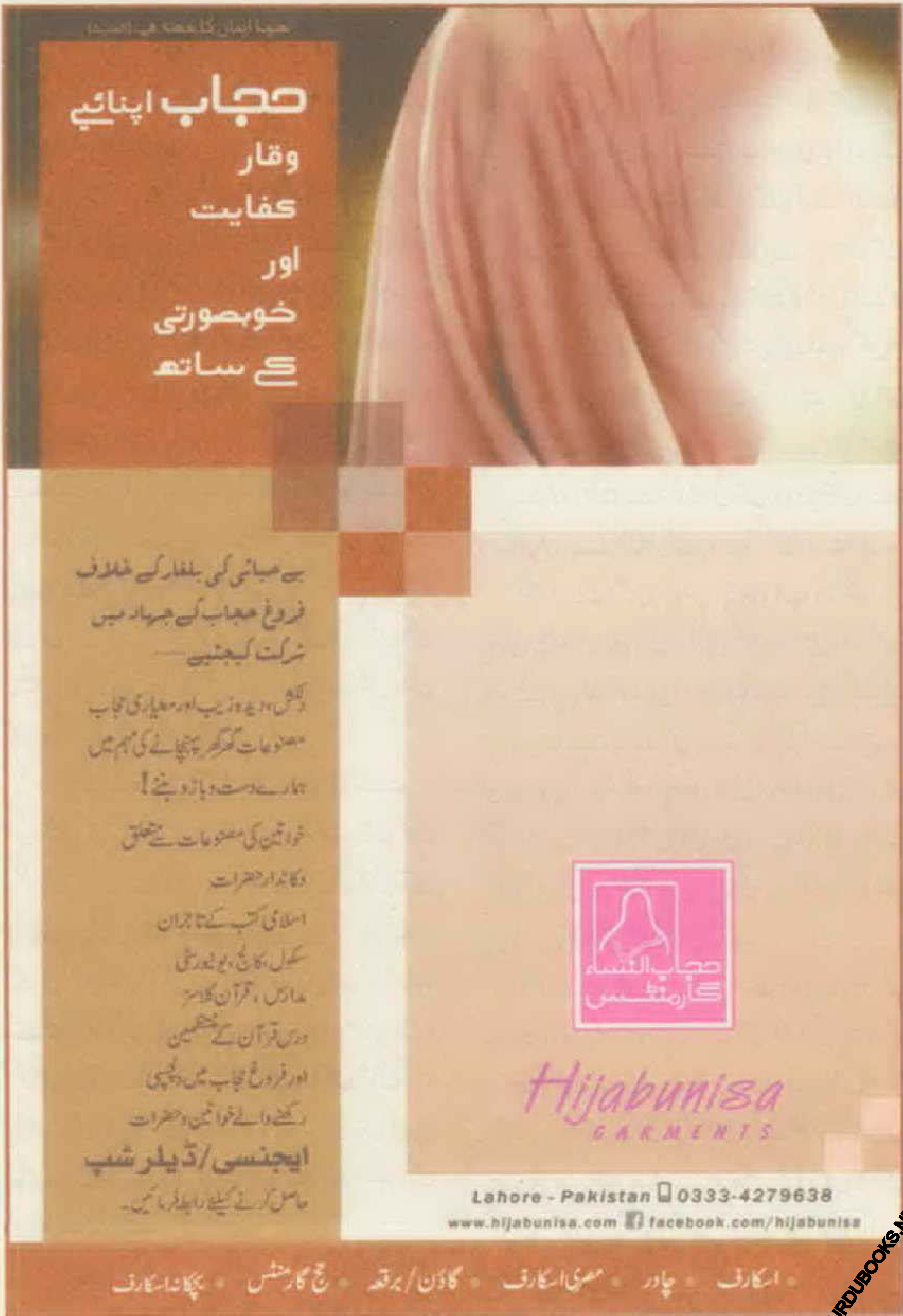

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اتفاق میں برکت

ایک بڑے میاں کی زندگی کے آخری لمحات کی کہانی انھیں اپنے بیٹوں کو سبق سکھانے کی بہت جلدی تھی
ابن انشاء سے بہتر منظر کشی بھلا کون کر سکتا ہے

ابن انشاء

بڑے میاں جنھوں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کمایا بنایا تھا آخر بیمار ہوئے، مرض الموت میں گرفتار ہوئے۔ ان کو اور تو کچھ نہیں، کوئی فکر تھی تو یہ کہ ان کے پانچوں بیٹوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ گاڑھی کیا پتلی بھی نہیں چھنتی تھی۔ لڑتے رہتے تھے۔ کبھی کسی بات پر اتفاق نہ ہوتا تھا حالانکہ اتفاق میں بڑی برکت ہے۔ آخر انھوں نے بیٹوں پر اتحاد اور اتفاق کی خوبیاں واضح کرنے کے لیے ایک ترکیب سوچی۔ اُن کو اپنے پاس بلایا اور کہا: دیکھو اب میں کوئی دم کا مہمان ہوں۔ سب جا کر ایک ایک لکڑی لاؤ۔

ایک نے کہا: لکڑی؟ آپ لکڑیوں کا کیا کریں گے؟ دوسرے نے آہستہ سے کہا۔ بڑے میاں کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ لکڑی نہیں۔ شاید ککڑی کہہ رہے ہیں۔ ککڑی کھانے کو جی چاہتا ہوگا۔ تیسرے نے کہا۔ نہیں کچھ سردی ہے شاید آگ جلانے کو لکڑیاں منگاتے ہوں گے۔ چوتھے نے کہا، بابو جی کوئلے لائیں؟

پانچویں نے کہا نہیں اُپلے لاتا ہوں۔ وہ زیادہ اچھے رہیں گے۔

باپ نے کراہتے ہوئے کہا: ”ارے نالائقو۔ میں جو کہتا ہوں وہ کرو۔ کہیں سے لکڑیاں لاؤ جنگل سے۔“

ایک بیٹے نے کہا: یہ بھی اچھی رہی۔ جنگل یہاں کہاں؟ اور محکمہ جنگلات والے لکڑی کہاں کاٹنے دیتے ہیں۔

دوسرے نے کہا: اپنے آپے میں نہیں ہیں، بابو جی۔ بک رہے ہیں جنوں میں کیا کیا کچھ۔

تیسرے نے کہا: بھئی لکڑیوں والی بات اپن کی تو سمجھ میں نہیں آئی۔

چوتھے نے کہا: بڑے میاں نے عمر بھر میں ایک ہی تو خواہش کی ہے اُسے پورا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کرنے میں کیا ہرج ہے؟

پانچویں نے کہا: اچھا میں جاتا ہوں۔ ٹال پر سے لکڑیاں لاتا ہوں۔

چناں چہ وہ ٹال پر گیا۔ ٹال والے سے کہا: خان صاحب ذرا پانچ لکڑیاں تو دینا۔ اچھی مضبوط ہوں۔

ٹال والے نے لکڑیاں دیں۔ ہر ایک خاصی موٹی اور مضبوط۔ باپ نے دیکھا، تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ یہ بتانا بھی خلاف مصلحت تھا کہ لکڑیاں کیوں منگائی ہیں اور اس سے کیا اخلاقی نتیجہ نکالنا مقصود ہے۔ آخر بیٹوں سے کہا: اب ان لکڑیوں کا گٹھا باندھ دو۔

اب بیٹوں میں پھر چہ میگوئیاں ہوئیں، گٹھا؟ وہ کیوں؟ اب رسی کہاں سے لائیں بھئی بہت تنگ کیا اس بڈھے نے، آخر ایک نے اپنے پاجامے میں ازار بند نکالا اور گٹھا باندھا۔

بڑے میاں نے کہا: ''اب اس گٹھے کو توڑو۔''

بیٹوں نے کہا: ''لو بھئی یہ بھی اچھی رہی۔ کیسے توڑیں۔ کلھاڑا کہاں سے لائیں۔

باپ نے کہا: ''کلھاڑے سے نہیں۔ ہاتھوں سے توڑو گھٹنے سے توڑو۔''

حکم والد مرگ مفاجات۔ پہلے ایک نے کوشش کی۔ پھر دوسرے نے پھر تیسرے نے۔ پھر چوتھے نے۔ پھر پانچویں نے۔ لکڑیوں کا بال بیکا نہ ہوا۔ سب نے کہا ''باؤ جی ہم سے نہیں ٹوٹتا یہ لکڑیوں کا گٹھا۔''

باپ نے کہا ''اچھا۔ اب ان لکڑیوں کو الگ الگ کر دو۔ ان کی رسی کھول دو۔''

ایک نے جل کر کہا ''رسی کہاں ہے؟ میرا ازار بند ہے۔ اگر آپ کو کھلوانا تھا تو گٹھا بندھوایا ہی کیوں تھا۔ لاؤ بھئی کوئی پنسل دینا میں ازار بند ڈال لوں پاجامے میں۔''

باپ نے بزرگانہ شفقت سے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا: ''اچھا اب ان لکڑیوں کو ایک ایک کر کے توڑو۔''

لکڑیاں چونکہ موٹی موٹی اور مضبوط تھیں۔ بہت کوشش کی۔ کسی سے نہ ٹوٹیں۔ آخر میں بڑے بھائی کی باری تھی۔ اس نے ایک لکڑی پر گھٹنے کا پورا زور ڈالا اور تڑاق کی آواز آئی۔

باپ نے نصیحت کرنے کے لیے آنکھیں یک دم کھول دیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ بیٹا بے ہوش پڑا ہے۔ لکڑی سلامت پڑی ہے۔ آواز بیٹے کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹنے کی تھی۔

ایک لڑکے نے کہا: ''یہ بڈھا بہت جاہل ہے۔''

دوسرے نے کہا: ''اڑیل، ضدی۔''

تیسرے نے کہا: ''کھوسٹ، سنکی۔ عقل سے پیدل، گھامڑ۔''

چوتھے نے کہا: ''سارے بڈھے ایسے ہی ہوتے ہیں، کم بخت مرتا بھی نہیں۔''

بڈھے نے اطمینان کا سانس لیا کہ بیٹوں میں کم از کم ایک بات پر تو اتفاق رائے ہوا۔ اس کے بعد آنکھیں بند کیں اور نہایت سکون سے جان دے دی۔ (اردو کی آخری کتاب)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مائی ڈیئر مولوی مجّن!

واقعاتی مزاح کی ایسی خوب صورتی کم تحریروں کو نصیب ہوتی ہے۔
ایک مشاعرے کا دلپذیر تذکرہ منتظم کو ایک عجیب قانونی مخمصے کا سامنا تھا

مشتاق یوسفی

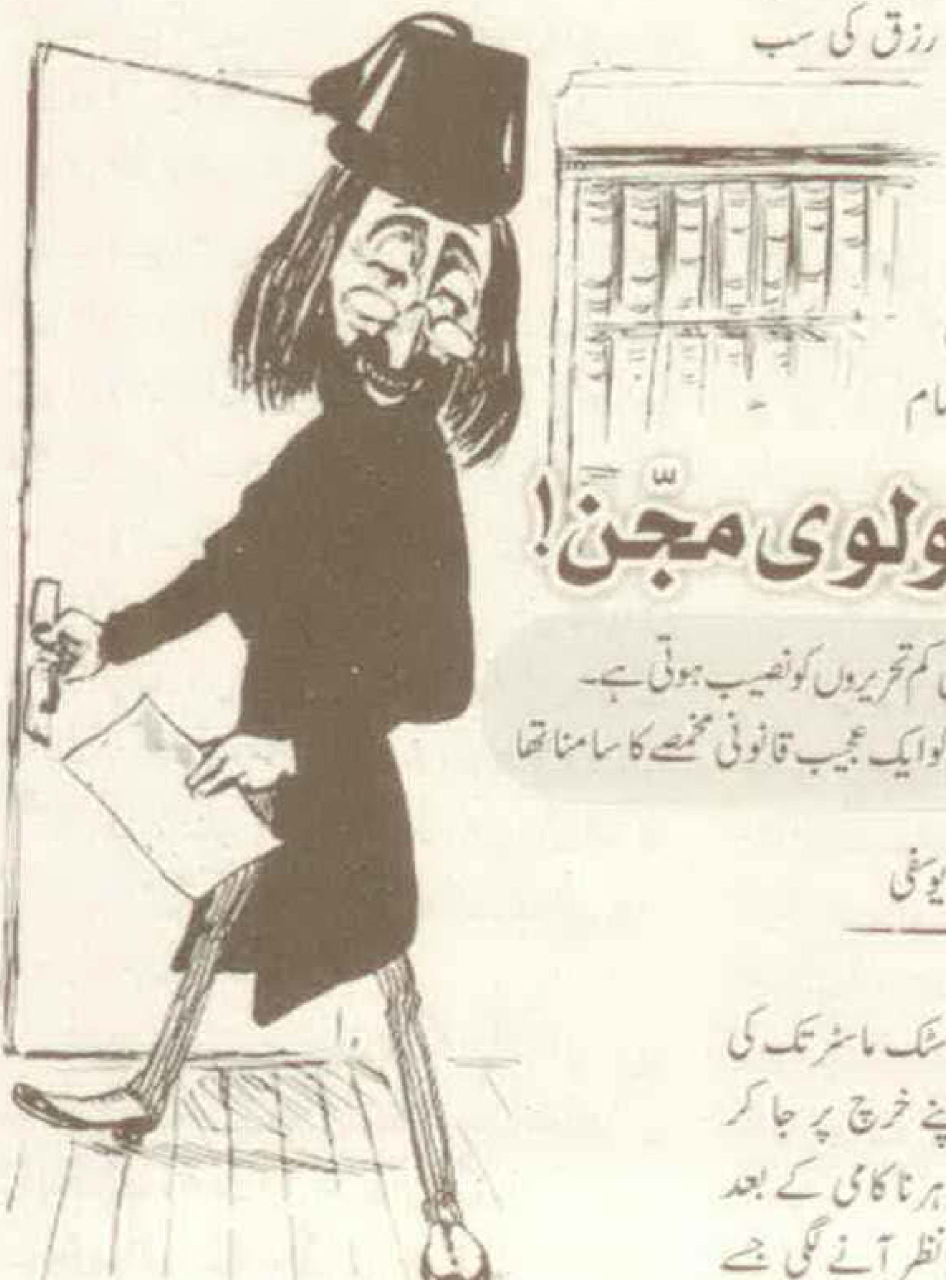

دن تو جوں توں کاٹا، لیکن شام پڑتے ہی بشارت ایک قریبی گاؤں سٹک گئے۔ وہاں اپنے ایک واقف کار کے ہاں (جس نے چند ماہ پیشتر ایک یتیم تلاش کرنے میں مدد دی تھی) انڈرگراؤنڈ چلے گئے۔ ابھی جوتوں کے تسمے بھی نہیں کھولے تھے کہ اپنے ہر جاننے والے کو مختلف ذرائع سے اپنے انتہائی خفیہ زیرِ زمین محلِ وقوع سے آگاہ کرنے کا انتظام کیا۔ انھوں نے دھیرج گنج میں سوا سال رو رو کے گزارا تھا۔ دیہات میں وقت بھی بیل گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے۔ انھیں اپنی قوتِ برداشت پر تعجب ہونے لگا۔ رزق کی سب راہیں مسدود نظر آئیں تو ناگوارا رفتہ رفتہ گوارا ہوجاتا ہے۔ شمالی ہندوستان کا کوئی اسکول ایسا نہیں بچا جس کا نام انھیں معلوم ہو اور جہاں انھوں نے درخواست نہ دی ہو۔ آسام کے ایک مسلم اسکول میں انھیں جمناسٹک ماسٹر تک کی ملازمت نہ ملی۔ چار پانچ جگہ اپنے خرچ پر جا کر انٹرویو میں بھی ناکام ہوچکے تھے۔ ہر ناکامی کے بعد انھیں معاشرے میں ایک نئی خرابی نظر آنے لگی جے صرف خونیں انقلاب سے دور کیا جاسکتا تھا، لیکن جب کچھ دن بعد ایک دوست کے توسط سے سندیلہ کے ہائی اسکول میں تقرر کا خط ملا، تو دل نے بے اختیار کہا کہ میاں!

ایسا کہاں خراب جہاں خراب ہے

دس بارہ مرتبہ خط پڑھنے اور ہر بار نئی مسرت کشید کرنے کے بعد انھوں نے چار لائن والے کاغذ پر خطِ شکست میں استعفیٰ لکھ کر مولوی مجن کو بھجوادیا۔ ایک ہی جھٹکے میں بیڑی اُتار پھینکی۔ اسے رقم کرتے ہوئے وہ آزادی کے ایک بھک سے اُڑا دینے والے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

نشے سے سرشار ہوگئے۔ چناں چہ ''عرض'' کی رکی دم رعونت سے بل کھا کر ض کی آنکھ میں گھس گئی اور ''استعفیٰ'' کی ی نے ہیکڑی سے پیر پسار دیے۔ بی۔اے کا نتیجہ نکلنے کے بعد وہ انگریزی میں اپنے دستخط کی جلیبی سی بنانے لگے تھے۔ آج فضلِ مولا سے وہ جلیبی، امرتی بن گئی مولی مجن کو خط کا مضمون پڑھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی کہ سوادِ خط کے ہر شوشے سے سرکشی، ہر مرکز سے تکبر اور ایک ایک دائرے سے استعفیٰ ٹپک رہا تھا۔ بشارت نے لفافے کو حقارت میں لعاب دہن ملا کر اس طرح بند کیا گویا مولی مجن کے منہ پر تھوک رہے ہوں۔ دستخط کرنے کے بعد سرکاری ہولڈر کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اپنے آقائے ولی نعمت مولوی سید محمد مظفر کو حضور فیض گنجور یا مکرمی و معظمی لکھنے کے بجائے جب انھوں نے اردو خط میں مائی ڈیئر مولوی مجن لکھا تو وہ کانٹا جو سوا سال میں ان کے تلوے کو چھیدتا ہوا تالو تک پہنچ چکا تھا، یکلخت نکل گیا اور اب انھیں اس پر تعجب ہو رہا تھا کہ ایسے پھٹیچر آدمی سے وہ سوا سال تک اس طرح اپنی اوقات خراب کرواتے رہے! انھیں ہو کیا گیا تھا؟ خود مولی مجن کو بھی غالباً اس کا احساس تھا۔ اس لیے کہ جب بشارت انھیں خدا کے حوالے کرنے لگے، مطلب یہ کہ خدا حافظ ہاتھ تو ملایا، آنکھیں نہ ملا سکے، جب کہ بشارت کا یہ حال تھا کہ ''آداب عرض'' بھی اس طرح کہا کہ لہجے میں ہزار گالیوں کا غبار بھرا تھا۔

بشارت نے بہت سوچا۔ نازو کو تحفے میں دینے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی تو نہ تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا، تو وقتِ رخصت اپنی سونے کی انگوٹھی اتار کر اسے دے دی۔ اس نے کہا، اللہ میں اس کا کیا کروں گی؟

پھر وہ اپنی کوٹھڑی میں گئی اور چند منٹ بعد واپس آئی۔ اس نے انگوٹھی میں اپنے گھنگھرالے بالوں کی ایک لٹ باندھ کر انھیں لوٹا دی۔ وہ دبی دبی سسکیوں سے رو رہی تھی۔

تم تو اتنے بھی نہیں جتنا ہے قد تلوار کا!

سندیلہ ہائی اسکول میں تو سب کچھ ٹھیک تھا، لیکن میٹرک میں تین چار پرابلم لڑکے عمر میں ان سے بھی تین چار برس بڑے نکلے۔ یہ لڑکے جو ہر کلاس میں دو دو تین تین سال دم لیتے میٹرک تک پہنچے تھے، اپنی عمر سے اتنے محجوب نہیں تھے جتنے کہ خود بشارت۔ جیسے ہی وہ گولا جو اس کلاس میں قدم رکھتے ہی ان کے حلق میں پھنس جاتا تھا، تحلیل ہوا اور اسکول میں ان کے پیر جمے۔ انھوں نے اپنے ایک دوست سے جو لکھنؤ سے تازہ تازہ ایل ایل بی کر کے آیا تھا، مولوی مظفر کو ایک قانونی نوٹس بھجوایا کہ میرے مؤکل کی دس مہینے کی چڑھی ہوئی تنخواہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کر دیجیے، ورنہ آپ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی جس سے اسکول کی جملہ بے ضابطگیوں اور بدعنوانیوں کا طشت ازبام ہونا ناگزیر ہو جائے گا۔

اس کے جواب میں دو ہفتے بعد مولوی مظفر کی جانب سے ان کے وکیل کا رجسٹرڈ نوٹس آیا کہ مشاعرے کے سلسلے میں جو ''رقومات'' آپ کو وقتاً فوقتاً علی الحساب دست گرداں دی گئیں، ان کا حساب دیے بغیر آپ فرار ہوگئے۔ آپ اس واجب الادا رقم میں سے اپنے واجبات وضع کر کے، بقیہ رقم فوراً بذریعہ منی آرڈر میرے مؤکل کو بھیج دیجیے۔ مشاعرے کے اخراجات کا گوشوارہ مع اصل رسیدات بواپسی ڈاک ارسال کریں۔ شاعروں کو جو معاوضہ، بھتا اور سفر خرچ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

دیا گیا اس کی رسیدات منسلک کریں۔ بصورتِ دیگر وجہ ظاہر کریں کہ کیوں نہ آپ کے خلاف عدالتِ مجاز میں چارہ جوئی کی جائے۔ ہرجہ خرچہ آپ کے ذمے ہوگا۔ نیز شاعروں کے استقبال کے دوران آپ نے یتیم خانے کے بینڈ سے اپنی ایک غزل بجوائی جس کے ایک سے زائد اشعار فحش تھے۔ مزید برآں، وزن سے گرے ہوئے مصرع طرح دینے سے اسکول کی تعلیمی شہرت اور اہالیان دھیرج گنج کی املاکِ منقولہ کو جو نقصان پہنچا اس کا ہرجانہ قرار واقعی وصول کرنے کا حق مجلسِ منتظمہ محفوظ رکھتی ہے۔ نوٹس میں دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر رقم واپس نہ کی گئی تو بدرجہ مجبوری خیانتِ مجرمانہ کے کیس کی پوری تفصیلات سے سندیلہ اسکول کے منتظمین اور گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیمات کو آگاہ کر دیا جائے گا۔

نوٹس سے تین دن پہلے مولی مجن نے ایک ٹیچر کی زبانی بشارت کو کہلا بھیجا کہ برخوردار! تم ابھی بچے ہو۔ گرو گھنٹال سے کاہے کو اُلجھتے ہو۔ ابھی تو نامِ خدا تمھارے گولیاں، گلی ڈنڈا کھیلنے اور ہماری گود میں بیٹھ کر عیدی مانگنے کے دن ہیں۔ اگر ٹکر لی تو پرخچے اُڑا دوں گا۔

سگِ مردم گزیدہ

بشارت کی رہی سہی مدافعت کا لڑکھڑاتا قلعہ ڈھانے کے لیے مولی مجن نے نوٹس کے آخری پیراگراف میں ایک ٹائم بم رکھوا دیا۔ لکھا تھا کہ جہاں آپ نے محکمۂ تعلیمات کو اپنے خط کی نقل ارسال کی، وہاں اس کے علم میں یہ بات بھی لانی چاہیے تھی کہ آپ نے اپنے کتے کا نام سرکار برطانیہ کے گورنر جنرل کی تذلیل وتحقیر کی نیت سے لارڈ ولز لی رکھا۔ آپ کو بارہا وارننگ دی گئی مگر آپ حکومت کے خلاف ایک لینڈی کتے کے ذریعے نفرت اور بغاوت کے جذبات کو ہوا دینے پر مُصر رہے جس کی شہادت قصبے کا بچہ بچہ دینے کو تیار ہے۔ نیز بغاوت اور انگریز دشمنی کے جنون میں آپ اپنے تئیں فخریہ اور علانیہ ٹیپو کہلواتے تھے!

بشارت سکتے میں آگئے۔ یا اللہ! اب کیا ہوگا؟

وہ دیر تک اُداس فکر مند بیٹھے رہے۔ ولز لی ان کے پیروں پر اپنا سر رکھے آنکھیں مُوندے پڑا تھا۔ وقفے وقفے سے آنکھ کھول کر انھیں دیکھ لیتا تھا۔ ان کا جی ذرا ہلکا ہوا تو وہ دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ پیار سے زیادہ احساسِ تشکر کے ساتھ۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں پتھر کی چوٹ کا نشان نہ ہو۔

لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ ونام ہے!"

مولی مجن نے اس نوٹس کی کاپی اطلاعاً ان تمام شعرا کو بھیجی جنھوں نے اس یادگار مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ تین چار کو چھوڑ کر سب شاعر بشارت کے پیچھے پڑ گئے کہ لاؤ ہمارے حصے کی رقم۔ ایک خستہ حال شاعر تو کوسنوں پر اُتر آیا۔ کہنے لگا، جو دوسرے شاعر بھائیوں کے گلے پہ چھری پھیر کے معاوضہ ہڑپ کر جائے، اللہ کرے اس کی قبر میں کیڑے اور شعر میں سکتے پڑیں۔ اب وہ کس کس کو سمجھانے جاتے کہ مشاعرے کی مد میں انھیں کل دس روپے دیے گئے تھے۔ ایک دل جلے نے تو حد کر دی۔ اسی زمین میں ان کی ہجو کہہ کر ان کے سابق خانساماں ساغر جالونوی کے پاس بغرضِ اصلاح بھیجی، جو اس نمک حلال نے یہ کہہ کر لوٹا دی کہ ہم تاجدار اودھ، جانِ عالم واجد علی شاہ پیا کے خاندانی رکاب دار ہیں۔ ہمارا اُصول ہے کہ ایک

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

دفعہ جس کا نمک کھالیا، اس کے خلاف کبھی ہماری زبان اور قلم سے ایک لفظ نہیں نکل سکتا، خواہ وہ کتنا ہی بڑا غبن کیوں نہ کرلے۔

تمش ڈبائیوں نے اُڑا دیا کہ بشارت کے والد نے اسی پیسے سے نیا ہارمونیم خریدا ہے، جس کی آواز دوسرے محلے تک سنائی دیتی ہے۔ اس ساز کے پردے میں غبن بول رہا ہے! بشارت کے اُستاد حضرت جوہراللہ آبادی نے کھل کر خیانتِ مجرمانہ کا الزام تو نہیں لگایا، لیکن انھیں ایک گھنٹے تک ایمان داری کی فضائل پر لیکچر دیتے رہے۔

نصیحت میں فضیحت!

سچ پوچھیے تو اُنھیں ایمان داری کا پہلا سبق، لغوی اور معنوی دونوں اعتبار سے، جوہراللہ آبادی نے ہی پڑھایا تھا۔ ہمارا اشارہ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی نظم ''ایمان دار لڑکا'' کی طرف ہے۔ یہ نظم دراصل ایک ایمان دار لڑکے کا قصیدہ ہے جو ہمیں بھی پڑھایا گیا تھا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک دن اس لڑکے نے پڑوسی کے خالی گھر میں تازہ تازہ بیر ڈلیا میں رکھے دیکھے۔ کھانے کو بے تحاشا جی چاہا لیکن بڑوں کی نصیحت اور ایمانداری کا جذبہ بیر چرا کر کھانے کی خواہش پر غالب آیا۔ بہادر لڑکے نے بیروں کو چھوا تک نہیں۔ نظم کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے:

واہ وا! شاباش لڑکے واہ وا!
تو جواں مَردوں سے بازی لے گیا!

ہائے! کیسے اچھے زمانے اور کیسے بھلے اور بھولے لوگ تھے کہ چوری اور بدنیتی کی مثال دینے کے لیے بیروں سے زیادہ قیمتی اور لذیذ شے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے! کھٹ مٹھے بیروں سے زیادہ بڑی اور بُری Temptation ہماری دُکھیاری نسل کے لڑکوں کو اس زمانے میں دستیاب بھی نہ تھی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے ہمیں یوں ہی خیال آیا کہ اگر اب ہمیں نئی پود کے لڑکوں کو نیک چلنی کی تلقین کرنی ہو تو چوری اور بدنیتی کی کون سی مثال دیں گے جس سے بات ان کے دل میں اُتر جائے۔ معاً ایک ماڈرن مثال ذہن میں آئی جس پر ہم یہ داستان ختم کرتے ہیں:

مثال: ایمان دار لڑکے نے ایک الماری میں بلوفلم اور Cannabis کے سگریٹ رکھے دیکھے۔ وہ انھیں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس لیے کہ کئی مرتبہ گریمر اسکول میں اپنی کلاس کے لڑکوں کے بستوں میں دیکھ چکا تھا۔ ان کی لذت کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ مگر وہ اس وقت نشۂ نصیحتِ پدری سے سرشار تھا۔ سونگھ کر چھوڑ دیے۔

وضاحت: درحقیقت اس کی تین وجہیں تھیں۔ اوّل، اس کے ڈیڈی کی نصیحت تھی کہ کبھی چوری نہ کرنا۔ دوم، ڈیڈی نے یہ بھی نصیحت کی تھی کہ بیٹا فسق و فجور کے قریب نہ جانا۔ نظر ہمیشہ نیچی رکھنا، سب سے باؤلا نشہ آنکھ کا نشہ ہوتا ہے اور سب سے گندا گنا آنکھ کا گناہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ واحد گناہ ہے جس میں بزدلی اور نامردی بھی شامل ہوتی ہے۔ کبھی کوئی برا خیال دل میں آبھی جائے تو اپنے پیرومرشد کا اور اگر تم بے پیرے ہو تو خاندان کے کسی بزرگ کی صورت کا تصور باندھ لینا، چناں چہ ایماندار لڑکے کی چشمِ تصور کے سامنے اس وقت اپنے ڈیڈی کی شبیہ تھی اور تیسری وجہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں ممنوعہ اشیا اس کے ڈیڈی کی الماری میں رکھی تھیں!

واہ وا! شاباش! لڑکا واہ وا!
تو بزرگوں سے بھی بازی لے گیا!

(انتخاب: سمیں کرن، فیصل آباد)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اس کے بعد انٹرویو کیا ہونا تھا

ایک حیرت انگیز انٹرویو کا ماجرا، ڈالر اور ریال اُس ایک انٹرویو کی دوری پر تھے اور بیچ میں حائل تھے انٹرویو بورڈ کے چند تھکے تھکے اراکین

کرنل اشفاق حُسین

سعودی عرب بھیجنے کے لیے جب افسروں کی سلیکشن ہو رہی تھی، تو ہمیں قطعاً اُمید نہیں تھی کہ ہمارا نام بھی کسی پینل میں شامل ہوسکتا ہے۔ وجہ اس ''نا اُمیدی'' کی (جس میں حسرت و یاس قطعاً شامل نہیں تھا) یہ تھی کہ ملٹری کالج جہلم میں تعیناتی سے پہلے ڈھائی سال تک نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگو یجز میں طالب علم بن کر ہم نے جوانی لٹائی تھی۔ عدم نے کہا تھا۔

؎ کہتے ہیں عمر رفتہ کبھی لوٹتی نہیں
جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا

عدم نے تو جانے کے حکم دیا تھا جوانی اُٹھا کے لانے کا، لیکن انداز بتاتا ہے کہ وہ خود وہیں کہیں جوانی کی سرحد کے اس پار کھڑے رہے۔ ہمارے ساتھ یہ ہوا کہ ملٹری سیکرٹری برانچ کے ایک حکم کے تحت ہم بنفس نفیس طالب علم بن کر ایک تعلیمی ادارے میں لوٹ آئے۔ اس سے پہلے تین سال تک کراچی میں مارشل لا حکام میں شامل رہے تھے۔ گویا عرصے بعد عسکری دھارے میں شامل ہوئے تھے۔

ایک روز ملٹری کالج جہلم میں سگنل آیا کہ سعودی عرب بھیجنے کے لیے ہمارا نام بھی زیر غور ہے۔ فلاں

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تاریخ کو جی ایچ کیو میں حاضر ہو جائیں۔ فوج کا قاعدہ یہ ہے کہ انٹرویو کے لیے جو بورڈ تشکیل دیا جاتا ہے اس کے سامنے مطلوبہ اہمیت اور تجربے کے افراد ایک اور تین کی نسبت سے پیش کیے جاتے ہیں یعنی اگر ایک فرد کو باہر بھیجنا ہو، تو تین افراد انٹرویو کے لیے آئیں گے۔ بورڈ انٹرویو کے ذریعے ایک شخص کا انتخاب کرتا ہے اور ایک کو ریزرو میں رکھتا ہے کہ خدانخواستہ پہلے کو کچھ ہو جائے، تو دوسرا اس کی جگہ چلا جائے۔ اس بے چارے کی حالت ٹیم کے بارھویں کھلاڑی کی سی ہوتی ہیں کہ پورے کھیل کے دوران اس کی دھڑکنیں زیرو زبر ہوتی رہتی ہیں، کھیل ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کی باری نہیں آتی۔ (اور آنی ہو تو آ بھی جاتی ہے اور مختصر سے وقت میں بھی وہ کوئی نہ کوئی کام دکھا جاتا ہے) تو ہمارا نام جب انٹرویو کے لیے آیا، تو یہی سمجھے کہ ہمیں تو پینل کی تعداد پوری کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔ بارھویں کیا، تیرھویں نمبر پر بھی نہ رکھے جائیں گے۔

جب ڈالر اور ریال صرف ایک انٹرویو کے فاصلے پر نظر آ رہے ہوں، تو انسان پر بڑی گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ انٹرویو سے پہلے ہی پیشانی پسینے سے عرق آلود ہو جاتی ہے چاہے موسم سرما ہی کیوں نہ ہو۔ بندہ آئینے میں بار بار خود کو چیک کرتا رہتا ہے کہ اس کی وردی میں کوئی سقم تو نہیں آ گیا۔ ہماری سوچ نے ہمیں باور کروا دیا تھا ''میاں! تم اترانے کی کوشش نہ کرو تمھیں کیا؟'' اس لیے ہم انتظار گاہ میں آتے، عرق آلود افسروں کو انتظار کی چلہ کشی کاٹتے دیکھتے اور یہ جان کر کہ ہماری باری ابھی دور ہے، جی ایچ کیو میں کسی سے ملنے چلے جاتے۔ بالکل آخر میں ہماری باری آئی۔ انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوئے، تو بورڈ کے معزز ارکان صاف تھکے تھکے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک آدھ نے تو جمائی بھی لی۔ سلوموشن میں انٹرویو شروع ہوا۔ ایک دو سوالوں کے بعد کسی نے ہمیں نظم و ضبط پر عربی میں تقریر کرنے کو کہا۔ تازہ تازہ عربی سیکھی تھی۔ ملٹری کالج میں پڑھا بھی رہے تھے۔ فرفر چند جملے کہہ ڈالے۔ ایک جنرل نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے، ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا:

''کل شام کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں۔''

انداز بتا رہا تھا کہ ان کا مطلب ہے اس بات کو عربی میں کہا جائے لیکن ہم نے جیب سے قلم نکالتے ہوئے کہا: ''سر کیوں نہیں۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ ذرا اپنے دولت کدہ کا پتا تو لکھوائیں۔''

ہمارا جواب ایسے آیا جیسے سوکھے دھانوں پر بارش کی پھوار۔ ایک قہقہہ لگا۔ بورڈ کے ارکان کھل اُٹھے اور وہ جو ماحول پر یبوست سی طاری تھی، یکدم کافور ہو گئی۔ بورڈ کے چیئرمین نے ہنستے ہوئے، جنرل سے کہا'' پرانی یاری لگتی ہے، تم پتا لکھاؤ پہلے، انٹرویو بعد میں ہوتا رہے گا۔''

ہم نے احتیاطاً فقرے کا عربی میں ترجمہ بھی کر دیا کہ کہیں جنرل صاحب ناراض ہی نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد انٹرویو کیا ہونا تھا۔ ہمیں رخصت عطا ہوئی۔ بورڈ کے ارکان کو مسکراتا چھوڑ کر ہم باہر چلے آئے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

خدا اس اونھ سے بچائے

اونھ

ایک اونھ کا ستاتا، کھلکھلاتا ماجرا
یہ کبھی دل توڑتی ہے اور کبھی دلی اجاڑتی ہے

فرحت اللہ بیگ

(خدا اس اُونھ سے بچائے جس کی زبان پر آیا اُس کو تباہ کیا جس گھر میں گھسا اس کو ستیاناس کیا اور جس ملک میں پھیلا اس میں گدھے کے ہل چلوادیے۔ ثبوت درکار ہو تو دنیا کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لو کہ اس اونھ نے زمانے کے کیا کیا رنگ بدلے ہیں۔ جرنیل گروش کو نپولین حکم دیتا ہے کہ انگریزوں کی فوج کے پیچھے پہنچ جاؤ اور پو پھٹنے سے پہلے پشت پر دباؤ ڈالو۔ میں سامنے سے حملہ کرتا ہوں۔ بلوشر کے آنے سے پہلے اس فوج کو رگڑ ڈالیں گے۔ جرنیل اوش اونھ کر دیتا ہے۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر روانہ ہوتا ہے۔ واٹر لو کی لڑائی نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کا نقشہ بدل دیتی ہے۔ ہندوستان میں اونھ کا

کچھ کم زور نہیں رہا ہے۔ نادر شاہ چڑھا چلا آرہا ہے۔ محمد شاہ بادشاہ رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ پرچہ لگتا ہے کہ نادر لاہور تک آگیا۔ بادشاہ سلامت اونھ کر دیتے ہیں۔ جس کا فارسی ترجمہ تاریخوں میں

ع ایں دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اُولی

کیا گیا ہے۔ لیجیے اُن کی ایک اونھ سے دلی لٹ جاتی ہے۔ خزانہ خالی ہوجاتا ہے، تختِ طاؤس اُڑ جاتا ہے۔ مرہٹے بڑھے آرہے ہیں۔ دہلی پر قبضہ کر کے گنج پورہ لوٹ لیتے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کو خبر ہوتی ہے۔ وہ بدلہ لینے چلتا ہے۔ ہلکر اور سندھیا دونوں مل کر بھاؤ کو سمجھاتے ہیں کہ توپ خانہ یہیں چھوڑو ہلکے پھلکے ہو کر مقابلہ کرو آمنے سامنے سے لڑائی ابدالی سے مشکل ہے۔ بھاؤ اونھ کر دیتا ہے۔ اس اونھ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سلطنت ہند کا جو خیال مرہٹوں کو تھا وہ پانی پت کی لڑائی سے خواب ہوجاتا ہے۔

پہلے تو جو کچھ تھا وہ تھا آج کل اس اونھ کا ہندوستان بھر میں بڑا دور دورہ ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں کے انتظام کا اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھتا۔ اِدھر رعایا کے مطالبات پر گورنمنٹ نے اونھ کی اور اُدھر اس اونھ کا جواب بم سے ملا۔ ذرا گورنمنٹ کے انتظام پر رعایا نے اونھ کی اور اس اونھ پر مشین گن کی گولیاں برس گئیں۔ رعایا کی حالت دیکھو تو یہاں بھی اس اونھ کے نتیجے موجود ہیں۔ مسلمان مسلمان میں جھگڑا، ہندو ہندو میں جھگڑا ہندو، مسلمان میں جھگڑا۔ شمال جنوب میں جھگڑا، مشرق مغرب میں جھگڑا، یہاں تک کہ زمین آسمان میں جھگڑا۔ اگر یہاں اونھ کا کچھ عرصہ یونہی زور رہا تو سوراج ملنا کی غلامی بھی ملنی نصیب ہونی مشکل ہے۔

ملک کے بعد اب جلسوں کی کیفیت دیکھو، تو وہاں

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بھی یہی رنگ نظر آئے گا۔ ممبر ہیں کہ بنے ٹھنے گدے دار کرسیوں پر رونق افروز ہیں۔ اسپیکر جوش میں بہ کر کہیں سے کہیں نکلے جا رہے ہیں۔ ممبروں نے تھوڑی دیر یہ بے سلسلہ گفتگو سنی اور اونگھ کہہ کے آنکھیں بند کر لیں، لیجیے ان کے لیے تو جلسہ کی کارروائی ختم ہوگئی جو ممبر ذرا آنکھیں کھولے بیٹھے ہیں۔ وہ پلاٹنگ پر پھول پتے یا گدھے اور آدمیوں کی تصویریں بنا رہے ہیں۔ کوئی ان بھلے آدمیوں سے پوچھے کہ حضرت یہاں آپ سونے اور تصویریں بنانے آئے ہیں یا ملک کے لیے کچھ کام کرنے۔ ووٹ لینے کا وقت آیا۔ انھوں نے بلا سوچے سمجھے مخالفت یا موافقت میں ہاتھ اُٹھائے۔ ان کو نہ یہ معلوم کرنے کی ضرورت کہ اس مضمون پر کیا بحث ہوئی اور نہ یہ جاننے کی حاجت کہ حالات کے لحاظ سے تردید کرنی چاہیے یا تائید۔ یہ تو صرف اونگھ کرنے اور ہاتھ اُٹھانے آئے تھے۔ اس فرض کو پورا کر دیا۔ اب جلسہ کرنے والے جانیں اور اُن کا کام جانے۔ جلسہ ختم ہونے پر ان لوگوں سے پوچھو تو ان شا اللہ نوے فی صد اونگھ سے جواب دیں گے جس کے یہ معنے ہوئے کہ جلسہ بیکار اسپیکر بیوقوف اور سننے والے گدھے۔ طالب علموں میں دیکھو اونگھ کا زور سب سے زیادہ انہی میں پاؤ گے۔ سال بھر گزار دیا۔ امتحان کا خیال آیا تو اونگھ کر دی یعنی کل سے پڑھیں گے...... آخر یہ اونگھ یہاں تک کھینچی کہ امتحان آ گیا۔ فیل ہوئے۔ اس فیل ہونے پر بھی اونگھ کر دی۔ بہت ہی بامعنی ہوتی ہے اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ باپ زندہ ہیں کھانے پینے اور اڑانے کو مفت ملتا ہے۔ اگر وہ بھی مر گئے تو جائداد موجود ہے۔ قرضہ دینے کو ساہوکار تیار ہیں۔ پھر پڑھ لکھ کر کیوں اپنا وقت ضائع کریں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے۔ صرف اٹھارہ برس ہی کی تو ہے۔ اگر مڈل کے امتحان میں دو چار بار فیل ہو چکے ہیں تو کیا حرج ہے۔ تیس سال کی عمر تک بھی انٹرنس پاس کر لیا تو سفارش کے بل پر کہیں نہ کہیں چپک ہی جائیں گے۔ یا کم از کم ولایت جانے کا قرضہ تو ضرور مل جائے گا اور ذرا کوشش کی تو بعد میں معاف ہو سکے گا۔ اس فیل ہونے پر ادھر انھوں نے اونگھ کی اُدھر ماں باپ نے اونگھ کی۔ اس صورت میں ابا اور اماں کی اونگھ کا دوسرا مطلب ہے یعنی یہ کہ بچہ ابھی فیل ہوا ہے کہ دل ٹوٹا ہوا ہے۔ ذرا کچھ کہا تو ایسا نہ ہو کہ رو رو کر اپنی جان ہلکان کرے یا کہیں جا کر ڈوب مرے۔ غرض اس اونگھ نے صاحبزادہ صاحب کی تعلیم کا خاتمہ بالخیر کیا۔

("بھئی میں تو شعر پڑھ کر مصیبت میں پھنس گیا۔ شعر کا پڑھنا تھا کہ یہ معلوم ہوا کہ کسی شیر نے آ کر مجھے دبوچ لیا ہے۔ اس میرے شیر کا کوئی سوا گز چوڑا سینہ، میں ٹھہرا چھوٹے قد کا آدمی، اس نے جو پکڑ کر بھینچا تو ہڈیاں پلپلی ہوگئیں ادھر دم گھٹنے لگا۔ اس کی گرفت سے نکلنے کی ہزار کوشش کرتا ہوں، جنبش تک نہیں ہوتی۔ قسم خدا کی اس وقت تک ہڈیوں میں درد ہو رہا ہے۔ بارے، خدا خدا کر کے گرفت ڈھیلی ہوئی، تو میں ذرا علیحدہ ہوا۔ ابھی پوری طرح سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال بوسے پر بوسہ لینا شروع کیا۔ بھلا مجھ بڈھے کو دیکھو اور امیر صاحب کی اس حرکت کو دیکھو، کچھ تعریف کا یہ طریقہ افغانستان ہی میں اچھا معلوم ہوتا ہوگا، مجھے تو مارے شرم کے پسینے چھوٹ گئے۔" (نذیر احمد کی کہانی)

(غرض خدا خدا کر کے ایک گھڑ دوڑ میں میری مالی حالت درست ہوگئی، لیکن اب یہ مصیبت آ پڑی کہ جو سہولتیں "ایجاد" کی گمنامی کی وجہ سے تھیں وہ جاتی رہیں اور اب لوگوں پر یہ ظاہر کرنا پڑا کہ یہ کھاتا پیتا ہگتا، موتتا ہوا گھوڑا ہے، یہ کام بظاہر مشکل تھا۔ مگر میری جدت طبع نے اس کو بھی آسان کر دیا۔ ایک اسی کے قد و قامت رنگ و ڈھنگ وضع قطع کا گھوڑا راتوں رات خرید لایا، اصلی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

گھوڑے کو تھان پر باندھ دیا اور نقلی کو ایک کمرا میں بند کر دیا، بڑے بڑے ماہران فن آتے اور گھوڑے کو دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ اس میں تو کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آتی جو اتنی بڑی گھڑ دوڑ اس کو جتوا سکے، نہ جوڑ ہی مضبوط ہیں اور نہ بناوٹ ایسی سبک ہے، پھر اس قیامت کی رفتار اس میں پیدا ہوگئی تو کہاں سے پیدا ہوگئی، غرض جتنے منہ اتنی باتیں، ہر شخص اپنی اپنی ہانکتا تھا۔ مگر اس عقد کو کوئی نہ کھول سکتا تھا۔ آخر ہوتے ہوتے دوسری گھڑ دوڑ کا دن آگیا۔ رات ہی کو نقلی اصطبل میں اور اصلی کمرا میں منتقل کر دیا گیا۔ اور میں اور مسٹر کل گھوڑے کو لے کر عین وقت پر میدان میں پہنچے، کیا دیکھتا ہوں کہ جتنے گھوڑے دوڑنے والے ہیں سب ایک قطار باندھے کھڑے ہیں اور بڑے بڑے حساب دان تقسیم وزن کا لحاظ کر کے ناپ ناپ کر ان کے پٹھوں پر زین بندھوا رہے ہیں، غرض یہ مشکل بھی آسان ہوئی اور گھنٹا بجتے ہی سب گھڑ دوڑ کے لیے ایک صف میں کھڑے ہوگئے، ادھر جھنڈی گری اور ادھر سواروں نے گھوڑوں کے چابک رسید کیے چابک مارنا تھا کہ قیامت بپا ہوگئی، مارے دولتیوں اور پشتکیوں کے گھوڑوں نے سواروں کی جانیں ہلا دیں۔ بعض تو ڈر کر کود گئے۔ بعض ہمت والے تھے وہ جھٹکے جھیلتے رہے لیکن تھوڑی ہی دیر میں تماشائیوں کے سروں اور کندھوں پر گٹھڑیوں کی شکل میں نظر آئے۔ ایک "ایجاد" تھا کہ وہ اول آخر سب ہی کچھ رہا۔ چونکہ اس دوڑ میں لوگوں نے ذرا بجھ بوجھ کر لگایا تھا اس لیے میری آمدنی بھی کچھ زیادہ نہ ہوئی پھر بھی ستر اسی ہزار میں نے بنا ہی لیے۔

(کل کا گھوڑا)

("رواج اور قدامت پسندی ہمیشہ سے مانع ترقی رہے ہیں لیکن بلحاظ اپنی قدامت کے کوئی ایسا رواج ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ جو گھوڑوں پر زین کسنے کے پرانے طریقہ کا مقابلہ کر سکے۔ تاریخ پر جہاں تک نظر ڈالی جاتی ہے اور پرانے کتبوں، تصویروں اور مجسموں کو جہاں تک دیکھا جاتا ہے، یہی پتا چلتا ہے کہ زین یا چار جامہ ہمیشہ گھوڑوں کی پیٹھ ہی پر ڈالا گیا ہے۔ لیکن اصول سائنس سے اگر اس طریقہ عمل کو دیکھا تو یقیناً پہلی ہی نظر میں یہ بالکل خلاف فطرت معلوم ہوگا۔ گھوڑے کی بناوٹ ظاہر کر رہی ہے کہ اس کے پچھلے پٹھے بوجھ سہارنے کے لیے بنائے گئے ہیں نہ اگلی ٹانگیں۔ اگر فطرت کا یہ تقاضا ہوتا کہ پیٹھ پر بوجھ قائم کیا جائے تو گھوڑے کے اگلے اور پچھلے پیر دونوں کی وضع ایک ہی ہوتی تاکہ بوجھ ان چاروں حصوں پر برابر تقسیم ہوجائے۔ لیکن گھوڑے کی ساخت زبان حال سے بتا رہی ہے کہ اس کے پچھلے پیروں پر بوجھ ڈالو اور اگلے پاؤں رفتار کے لیے چھوڑ دو۔

خود جو پاؤں کے بھاگنے کے طریقہ پر اگر سائنس کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے، تو یہ مسئلہ اور بھی آسانی سے حل ہوجاتا ہے۔ جانوروں کی چاروں ٹانگیں اگر آگے کو جھکیں گی تو ہمیشہ رفتار میں تیزی پیدا ہوگی۔ اس اصول کو اب واقعات سے منطبق کیجیے۔ جانور کی پیٹھ پر بوجھ رکھنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ اس کی پچھلی ٹانگیں تو ضرور آگے کو جھک آتی ہیں، لیکن اس نے ساتھ ہی اس کے اگلے پیر بجائے آگے جھکنے کے پیچھے کی طرف مائل ہوجاتے ہیں اور اس سے یقیناً رفتار پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ عرصہ سے ہمارے زیر غور تھا۔ لیکن ہم اس پر کچھ لکھنے کی ہرگز جرأت نہ کرتے اگر گزشتہ گھڑ دوڑ میں "ایجاد" نے اس اصول کو عملاً ثابت نہ کر دیا ہوتا۔ کیونکہ ایسے قدیم رواج کے خلاف ایک حرف بھی لکھنا مفت کی لڑائی مول لینا ہے، ہم کو امید ہے کہ اب قدامت پسند لوگوں کی آنکھیں سائنس کا عملی تجربہ دیکھنے کے بعد کھلیں گی اور آئندہ گھڑ دوڑ میں ہم رواج کے مقابلہ میں سائنس کی فتح کو اس شکل میں دیکھیں گے کہ بجائے پیٹھ کے سب گھوڑوں کے پٹھوں پر زین کسے ہوں گے۔

(مضامین فرحت)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

لوگ کہیں گے اس شخص کے کیسے بے ہودہ خیالات ہیں

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

سید سجاد حیدر یلدرم

دوستوں کی کثرت اور تعلق کی شدت کیسی کیسی مشکلوں سے دوچار کرتی ہے۔ یہی موضوع ہے اس تحریر کا

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساس ہوتا

ایک دن میں دلی کے چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا کہ میری نظر ایک فقیر پر پڑی جو بڑے موثر طریقے سے اپنی حالتِ زار لوگوں سے بیان کرتا جا رہا تھا دو تین منٹ کے وقفہ کے بعد یہ درد سے بھری اسپیچ انہی الفاظ اور اُسی پیرایہ میں دُہرا دی جاتی تھی۔ یہ طرز کچھ مجھے ایسا خاص معلوم ہوا کہ میں اُس شخص کو دیکھنے اور اس کے الفاظ سننے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس فقیر کا قد لمبا جسم خوب موٹا تازہ تھا۔ اور چہرہ ایک حد تک خوب صورت تھا۔ مگر بد معاشی اور بے حیائی نے صورت مسخ کر دی تھی۔ یہ تو اُس کی شکل تھی۔ رہی اس کی صدا، تو میں ایسا قسی القلب نہیں ہوں کہ صرف اس کا مختصر سا خلاصہ لکھ دوں۔ وہ اس قابل ہے کہ لفظ بہ لفظ لکھی جائے چناں چہ وہ اسپیچ یا صدا جو کچھ اس نے کہی یہ تھی:

"اے بھائی مسلمانو! خدا کے لیے مجھ بدنصیب کا حال سنو۔ میں آفت کا مارا، سات بچوں کا باپ ہوں۔ اب روٹیوں کو محتاج ہوں اور اپنی مصیبت ایک ایک سے کہتا ہوں۔ میں بھیک نہیں مانگتا، میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے وطن کو چلا جاؤں، مگر کوئی خدا کا پیارا مجھے گھر بھی نہیں پہنچاتا۔

بھائی مسلمانو! میں غریب الوطن ہوں، میرا کوئی دوست نہیں۔ ہائے میرا کوئی دوست نہیں، اے خدا کے بندو! میری سنو، میں غریب الوطن ہوں۔"

فقیر تو یہ کہتا ہوا اور جن پر اُس کے قصے کا اثر ہوا، ان کی خیرات لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لیکن میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے اور میں نے اپنی حالت کا مقابلہ اس سے کیا اور مجھے خود تعجب ہوا کہ اکثر امور میں' میں نے اسے اپنے سے اچھا پایا۔ یہ صحیح ہے کہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

میں کام کرتا ہوں اور وہ مفت خوری سے دن گزارتا ہے۔ نیز یہ کہ میں نے تعلیم پائی ہے اور وہ جاہل ہے۔ میں اچھے لباس میں رہتا ہوں، وہ پھٹے کپڑے پہنتا ہے۔ بس یہاں تک میں اُس سے بہتر ہوں۔ آگے بڑھ کے اُس کی حالت مجھ سے بدر جہا اچھی ہے۔ اُس کی صحت پر مجھے رشک کرنا چاہیے۔ میں رات دن فکر میں گزارتا ہوں اور وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے کہ باوجود بسورنے اور رونے کی صورت بنانے کے اُس کے چہرے سے بشاشت، نمایاں تھی۔ بڑی دیر تک غور کرتا رہا کہ اس کی یہ قابل رشک حالت کس وجہ سے ہے؟ اور آخر کار میں اس بظاہر عجیب نتیجے پر پہنچا کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے وہی اُس کے حق میں نعمت ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے کہ ''میرا کوئی دوست نہیں۔'' میں حسرت سے کہتا ہوں۔ ''میرے اتنے دوست ہیں۔'' اس کا کوئی دوست نہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو اُسے مبارک باد دینی چاہیے۔

میں اپنے دل یہ باتیں کرتا ہوا مکان پر آیا۔ کیسا خوش قسمت آدمی ہے۔ کہتا ہے، میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خوش نصیب شخص، یہیں تو تُو مجھ سے بڑھ گیا، لیکن کیا اُس کا یہ قول صحیح بھی ہے۔

یعنی کیا اصل میں اس کا کوئی دوست نہیں جو میرے دوستوں کی طرح اُسے دن میں پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دے۔ میں اپنے مکان پر ایک مضمون لکھنے جا رہا ہوں مگر خبر نہیں کہ مجھے ذرا سا بھی وقت ایسا ملے گا کہ میں تخلیے میں اپنے خیالات جمع کرسکوں اور انھیں اطمینان سے قلمبند کرسکوں یا جو اسپیچ مجھے کل دینی ہے اسے سوچ سکوں، کیا یہ فقیر دن دہاڑے اپنا روپیہ لے جاسکتا ہے اور اُس کا کوئی دوست راستہ میں نہ ملے گا اور یہ نہ کہے گا:

''بھائی جان! دیکھو پُرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں، مجھے اس وقت ضرورت ہے تھوڑا سا روپیہ قرض دو۔''

کیا اس کے احباب وقت بے وقت اسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے۔ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اُسے نیند کے جھونکے آ رہے ہوں۔ مگر یار دوستوں کا مجمع ہے جو قصے پر قصہ اور لطیفے پر لطیفہ کہہ رہے ہیں اور اُٹھنے کا نام نہیں لیتے؟ کیا اُسے دوستوں کے خطوط کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اُس کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں جو اُسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے اور ریویو لکھنا پڑے؟ کیا اُسے احباب کی وجہ سے شور مچانا اور ہُو حق کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں ملاقات کو اُسے جانا نہیں پڑتا اور اگر نہ جائے تو کوئی شکایت نہیں کرتا؟ اگر ان سب باتوں سے وہ آزاد ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ ہٹا کٹا ہے اور میں نحیف ونزار ہوں۔ یا اللہ کیا اس پر بھی وہ شکر ادا نہیں کرتا؟ خدا جانے وہ اور کون سی نعمت چاہتا ہے؟ لوگ کہیں گے کہ اس شخص کے کیسے بیہودہ خیالات ہیں! بغیر دوستوں کے زندگی دوبھر ہوتی ہے اور یہ اُن سے بھاگتا ہے۔ مگر میں دوستوں کو بُرا نہیں کہتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لیے میرے پاس آتے ہیں اور میرے خیر طلب ہیں مگر عملی نتیجہ یہ ہے کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے مجھے فائدہ پہنچانے کا اور ہو جاتا ہے مجھے نقصان۔ چاہے مجھ پر نفرین کی جائے مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج تک میرے سامنے کوئی یہ ثابت نہ کرسکا کہ احباب کا ایک جم غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو وسیع کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر دُنیا میں کچھ کام کرنا ہے اور باتوں ہی میں عمر نہیں گزارنی ہے، تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ چاہے اس سے میرے دل پر کیسا ہی صدمہ ہو۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

میرے دوست احمد مرزا ہیں، جنھیں میں بھڑ بھڑیا دوست کہتا ہوں، یہ نہایت معقول آدمی ہیں اور میری اُن کی دوستی نہایت پُرانی اور بے تکلفی کی ہے۔ مگر حضرت کی خلقت میں یہ داخل ہے کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ جب آئیں گے شور مچاتے ہوئے چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے۔ غرض کہ اُن کا آنا بھونچال کے آنے سے کم نہیں ہے۔ جب وہ آتے ہیں تو میں کہتا ہوں:

''کوئی آرہا ہے، قیامت نہیں ہے۔'' اُن کے آنے کی مجھے دور سے خبر ہو جاتی ہے۔ باوجود یہ کہ میرے لکھنے پڑھنے کا کمرا چھت پر ہے۔ اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ ''میاں! اس وقت کام میں بہت مشغول ہیں۔'' تو وہ فوراً چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ کم بخت کو اپنی صحت کا بھی تو کچھ خیال نہیں (نوکر کی طرف مخاطب ہو کر) خیراتی! کب سے کام کر رہے ہیں؟ بڑی دیر سے؟ توبہ توبہ! اچھا بس میں ایک منٹ اُن کے پاس بیٹھوں گا۔ مجھے خود جانا ہے۔ چھت پر ہوں گے نا؟ میں پہلے ہی سمجھتا تھا۔''

یہ کہتے ہوئے وہ اُوپر آتے ہیں اور دروازہ اس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی گولہ آ کے لگا (آج تک اُنھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں) اور آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں:

''آہاہاہا! آخر میں نے تمھیں پکڑ لیا، مگر دیکھو دیکھو میری وجہ سے اپنا لکھنا بند مت کرو۔ میں حرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ! کس قدر لکھ ڈالا ہے کہو، طبیعت تو اچھی ہے؟ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللہ مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ایسا ہے جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جاتا ہے تو اب جاتا ہوں، میں بیٹھوں گا نہیں۔ ایک منٹ نہیں ٹھہرنے کا، تمھاری خیریت دریافت کرنی تھی، خدا حافظ۔'' یہ کہہ کے وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اس قدر دبا دیتے ہیں کہ اُنگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور میں قلم نہیں پکڑ سکتا ہوں؟ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میری اور اُن کی دوستی بہت پرانی ہے اور مجھ سے بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ تاہم میں اُنھیں چھوڑ دوں گا، ہاں چھوڑ دوں گا۔ اگرچہ کلیجے پر پتھر رکھنا پڑے۔

☆

(اور لیجیے، دوسرے دوست محمد تحسین ہیں۔ یہ بال بچوں والے صاحب ہیں اور رات دن انھی کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے ہیں تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں، جب میں کام سے تو فارغ ہو چکتا ہوں لیکن اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں کہ دل یہی چاہتا ہے کہ ایک گھنٹا آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں مگر تحسین آئے ہیں اور اُن سے ملنا ضروری ہے اُن کے پاس باتیں کرنے کے لیے، سوائے اپنے بچوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں۔ میں کتنی ہی کوشش کروں مگر وہ اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر میں موسم کا ذکر کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں ہاں بڑا خراب موسم ہے، میرے چھوٹے بچے کو بخار آگیا، منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے۔ اگر پالی ٹیکس یا لٹریچر کے متعلق گفتگو شروع کرتا ہوں تو تحسین صاحب فوراً معذرت پیش کرتے ہیں کہ بھائی آج کل گھر بھر بیمار ہے، مجھ اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں۔ اگر کسی عام جلسے میں آتے ہیں تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لیے ہوتے ہیں اور ہر ایک سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ ''طبیعت تو نہیں گھبراتی؟ پیاس تو نہیں معلوم ہوتی؟'' کبھی کبھی نبض دیکھ لیتے ہیں اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی بیماری ہی کا ذکر کرتے ہیں۔

(مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

قائداعظم بھی شاعر تھے؟

کبھی کبھی چھوٹی سی غلطی، نہ ماننے کی صورت میں کیسا رخ اختیار کرتی ہے، ذرا ملاحظہ فرمایئے

کرنل اشفاق حسین

مختلف رسالوں میں متن کے ساتھ ساتھ جا بجا چوکھٹوں میں دلچسپ واقعات، لطیفے یا اشعار دیے جاتے ہیں۔ پہلے تو صحافت کی زبان میں انھیں Filler کہتے تھے اور یہ صرف وہیں استعمال کیے جاتے تھے جہاں ایک مضمون مکمل ہونے کے بعد جگہ بچ جائے اور دوسرا مضمون شروع نہ کیا جاسکے۔ آج کل باکس آئٹم (Box Item) چوکھٹے کی شکل میں رنگا رنگی اور تنوع پیدا کرنے کے لیے دیے جاتے ہیں گویا قارئین کے لیے ایک ٹکٹ میں دو مزوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک اخبار میں دیکھا کہ صفحے کے ایک کونے پر علامہ اقبال کے چند اشعار درج ہیں لیکن نیچے علامہ اقبال کے نام کے بجائے لکھا تھا۔ ''قائداعظم''

ایڈیٹر سے تعلقات اچھے تھے۔ رگ ظرافت پھڑکی تو انھیں لکھ بھیجا ''قائداعظم شاعر بھی تھے؟ کم از کم مجھ پر اس کا انکشاف پہلی بار ہوا ہے۔ مزید انکشافات کی توقع رکھی جائے؟''

جواب میں خط نہیں بھونچال آیا، طوفان آیا، طوفان بادوباراں، تندوتیز۔ ہم نے آج تک اسے سنبھال رکھا ہے۔ پہلے تو انھوں نے اس بات پر گرفت کی کہ ہم نے غلطی کی نشان دہی کی تو کیوں؟ پھر لکھا:

''ایسا تو عموماً وہ لوگ کیا کرتے ہیں جو صحافت کے نشیب وفراز اور اس کے ''اندرونے'' سے واقف نہیں ہوتے لیکن آپ ان اسرار و رموز سے بے بہرہ نہیں۔ پھر پیشے کے حوالے سے آپ ہماری ہی برادری کے ایک معزز رکن شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ کی طرف سے تو ہمیں ایک ہلکی سی مسکراہٹ کافی ہوتی کہ اس میدان میں ایسے لطیفے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔''

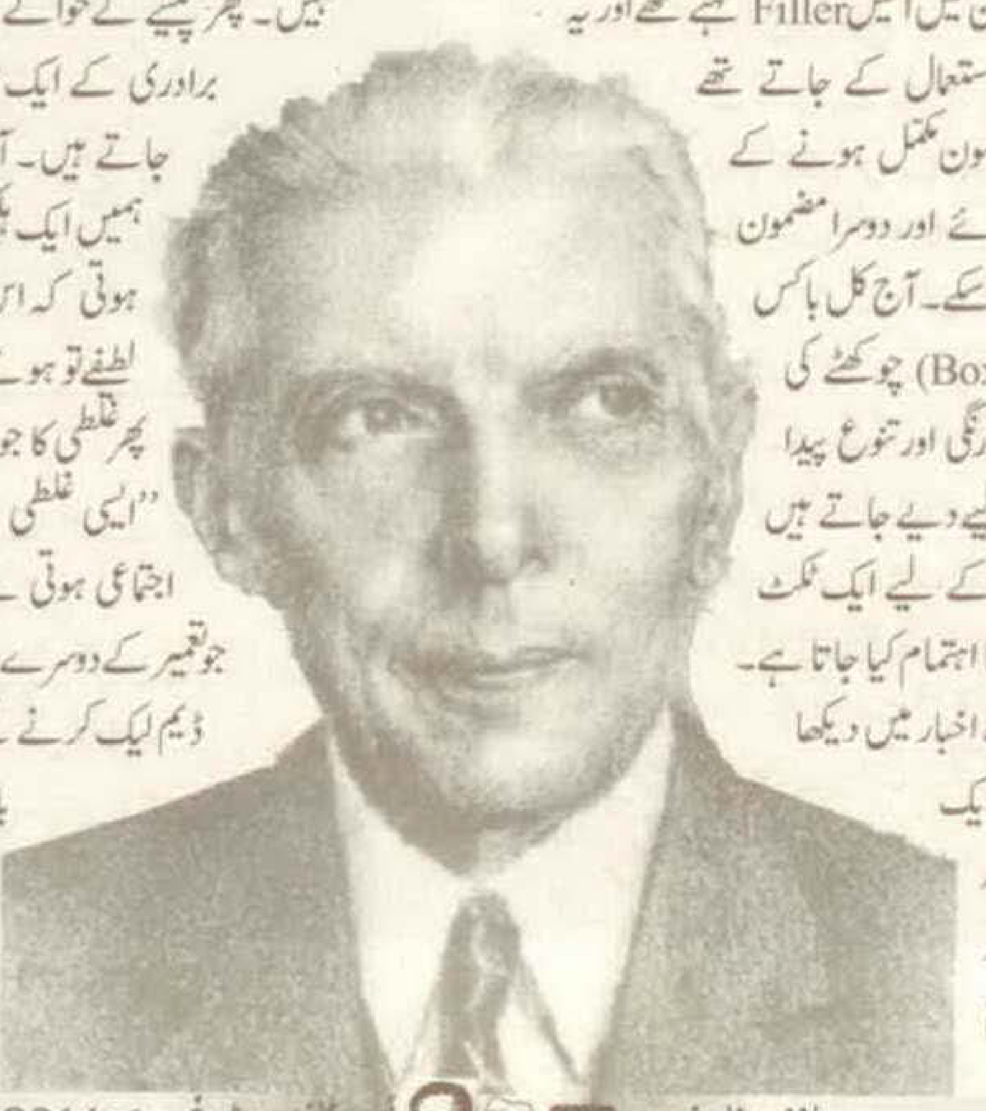

پھر غلطی کا جواز پیش فرمایا:

''ایسی غلطی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہوتی ہے۔ کئی منزلہ عمارت جو تعمیر کے دوسرے سال گر جائے، تربیلا ڈیم لیک کرنے لگے، پاکستان کا دستور بار بار معطل ہوجائے اور خود دولخت۔ غلطی صرف کسی چیف انجینئر یا لیڈر

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ابن انشاء

دیکھنا کیا جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہے۔ کیسے شوق سے چلا جاتا ہے کہ وہ وقت پر پہنچ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے۔ آج اسکول میں میٹنگ ہے۔ دل میں یہی دھیان ہے کہ آج ہم سبقوں کو کیا سبق پڑھائے کہ اسکول کچھ اور دن بند کرائے۔ پہلے سارے مطالبات تو پورے ہوگئے۔ اب کیا مطالبات پیش کیے جائیں۔ میٹنگ کے بعد جلوس نکلے گا۔ اسکول میں تالا ڈالے گا۔ ماں باپ بھی اس کی خوشی چاہتے ہیں۔ وقت پر ٹیلی ویژن دیکھنا بھی اچھا ہے۔ جی خوش ہوتا رہتا ہے۔ بے شک یہ لڑکا ہونہار نظر آتا ہے۔ بے پڑھے ڈگری لے گا، وزیر ہو جائے گا اور ہوتے ہوتے امیر ہو جائے گا ورنہ کسی کمپنی میں چپڑاسی ہو جائے گا۔ وردی مفت ملا کرے گی۔ بہرحال بھوکا نہیں مرے گا باپ دادا کا نام روشن کرے گا۔

کسی دانا نے کہا ہے کہ

؎ جو لکھو پڑھو گے تو ہو گے خراب
جو خالی پھرو گے بنو گے نواب

(مراسلہ: شیرزادہ، سوات)

کی نہیں ہوتی بلکہ اس میں بہت سے پردہ نشینوں کے نام شامل ہوتے ہیں۔

انفرادی غلطی کے مشاہدے آپ نے فوجی زندگی میں بار بار کیے ہوں گے۔

جب کوئی وردی پوش کبھی بیلٹ یا ٹوپی کے بغیر باہر نکل آتا ہے۔ کبھی ٹائٹل شولڈر، ربن یا سٹار الٹے لگ جاتے ہیں (بے تکلفی معاف) کبھی پتلون کے بٹن کھلے رہ جاتے ہیں۔ کانفرنس یا انٹرویو پر جاتے وقت ضروری کاغذ کہیں رہ جاتے ہیں۔ اصلی یا مشقی جنگ میں اسلحہ کہیں تو بارود کہیں پہنچ جاتا ہے۔

غلطی کہاں نہیں ہوتی، غلطی کون نہیں کرتا۔ جب انسان خطا و نسیان کا مرکب ہے تو وہ ان سے مبرا رہنے کا دعویٰ کیسے کرسکتا ہے۔ سب سے بڑی اور پہلی غلطی تو ابلیس سے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار میں ہوئی۔ پھر آدم سے جو نافرمانی سرزد ہوئی وہ بھی اسی کی ترغیب کا نتیجہ تھی۔ نوبت ہبوط آدم تک پہنچی اور اولاد آدم آج تک غلطیاں کرتی اور ان کی سزا بھگتتی چلی آ رہی ہے...... بندہ ہونے کی حیثیت سے انسان ہر روز نہ جانے کتنی ہی غلطیاں، بے انصافیاں، گناہ ہائے صغیرہ و کبیرہ، فرشتوں سے نامہ اعمال میں قلم بند کراتے چلا جا رہا ہے۔ جس کا حساب کتاب یوم الحساب ہونا ہے!''

اور آخر میں انھوں نے غلطی کو غلطی ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ لکھا ''حیرت ہے کہ آپ پر قائداعظم کے شاعر ہونے کا انکشاف پہلی مرتبہ کیوں ہوا؟ ہمیں ...... اور کم از کم مجھے تو ان کے شاعر ہونے میں مثقال بھر شبہ بھی نہیں وہ پاکستان ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے بہت بڑے شاعر بلکہ ملک الشعرا تھے...... قائداعظم کی کہی ہوئی ہر بات ایک شعر ہے جس میں صداقت ہی صداقت ہے، حسن ہی حسن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ قائد نے اپنی شاعری کے لیے میٹر، قوافی اور ردیف کا استعمال نہیں کیا۔ آزاد شاعری کی ہے اور اسی سے آزادی حاصل کی ہے اور یہ بھی انہی کی شاعری کا فیض ہے کہ آج ہم جو کچھ بھی ہیں، ہیں۔''

صاحبو! اس خط کے بعد سے ہم قائداعظم کو شاعر بھی مانتے چلے آ رہے ہیں۔ واضح رہے کہ مدیر موصوف کا پورا خط نقل نہیں کیا گیا

؎ کہیں کہیں سے سنائے ہیں ہم نے افسانے
(قیامت کے نامے)

(انتخاب نذیر انبالوی)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سید احمد شاہ بخاری ادبی دنیا میں پطرس بخاری کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی شناخت تو ان کے مزاحیہ مضامین ہیں، لیکن فنی، تنقیدی، ادبی و شخصی مضامین کے علاوہ ان کے دیباچہ جات، مکتوبات، خطابات اور منظومات سے بھی صرف نظر نہیں۔ ذیل میں ان کے مزاحیہ نثری سرمائے سے چند ''کٹ پیس'' ملاحظہ ہوں:

یہ بجا سہی

لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے

پطرس بخاری

1۔ ہمارے ماموں کا قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو، جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔

2۔ ایک مثل مشہور ہے کہ بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے۔ یہ بجا سہی لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔

3۔ ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلو پر جانے کا اتفاق ہوا، خدا کی قسم ان کے کتوں میں وہ شائستگی دیکھی کہ عش عش کر کے لوٹ آئے۔

4۔ ایک تو کتا پھر بکری کی جسامت کا، گویا بہت ہی کتا۔

5۔ بیوی آپ بیٹھی کھانا پکا رہی ہے، ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔

6۔ اس انبار سے ضخیم کتابیں انتخاب کر لو اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن لو۔ پھر ان پر بیٹھ جاؤ، علم ہی تم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی تو لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

7۔ جن رقموں کے آگے صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں۔

8۔ بائیسکل ہے لیکن مکمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل، رہٹ اور چرخہ اس طرح کی جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہیں۔

9۔ لاہور لاہور ہی ہے، اگر اس پتا سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

10۔ اور جو نصف دریا ہے بہنے کے قابل نہیں رہا، اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔

11۔ لاہور کے چاروں طرف لاہور ہی لاہور واقع ہے۔

12۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا، جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔

13۔ یہ وہی سڑک ہے جو شیر شاہ سوری نے بنوائی تھی اور آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہے۔

14۔ دوسری قسم جلالی طلبا کی ہے ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے۔

15۔ بچوں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بلی کے بچے، فاختہ کے بچے وغیرہ۔

16۔ خدا جانے آج کل کے بچے کس قسم کے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم بقر عید کو تھوڑا سا رو لیا کرتے تھے اور کبھی کبھار کوئی مہمان آ نکلا تو نمونے کے طور پر تھوڑی سے ضد کر لی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

شوہر نامہ

زمانے میں جو چیز ہے سب سے سستی
وہ ہے ایک مظلوم شوہر کی ہستی
ترس سب کو آتا ہے اس کی شکل پر
تو رونا بھی آتا ہے اس کی عقل پر
چڑھی جس کو شادی کرانے کی مستی
وہ ہے ایک مظلوم شوہر کی ہستی
یہ شوہر بے چارہ تو ہے ایسی گاڑی
کرے جس پہ سارا ہی کنبہ سواری
یہ وہ دل ہے جس کی اجڑ گئی بستی
وہ ہے ایک مظلوم شوہر کی ہستی
جتا بیل کولھو میں ہو کوئی جیسے
عمر اس کی ساری گذرتی ہے ایسے
گرا ہے بلندی سے دیکھی یہ پستی
وہ ہے ایک مظلوم شوہر کی ہستی
لکھا ہے یہ اس کے مقدر میں بھیا
دن رات ناچے یہ تھا تھیا تھیا
صبح و شام جس پر ہے بیگم برستی
وہ ہے ایک مظلوم شوہر کی ہستی
نہیں جسکے بس اپنی مرضی سے جینا
کیا اس نے کھانا تو کیا اس نے پینا
ہر اک چیز کو جس کی روح ہے ترستی
وہ ہے ایک مظلوم شوہر کی ہستی
ٹکے کی بھی عزت نہیں اسکی رہتی
وہی جب نکما نکھٹو ہے کہتی
جسے لا کے دیتا ہے تنخواہ یہ دستی
وہ ہے ایک مظلوم شوہر کی ہستی

؎ آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز

بیوی نامہ

میری بیوی ہے اک دہکتا شرارہ
کہ ہو جیسے چنگاریوں کا فوارہ
نہ دیکھی کبھی اُس کے چہرے پہ ہنسی
چڑھا رہتا ہے اس کا ہر وقت پارہ
صبح شام اس کے گزرتے ہیں ایسے
کبھی گالیاں دیں کبھی مجھ کو مارا
جو بیتے ہے مجھ پہ وہ میں جانتا ہوں
کٹے جا رہا ہوں مگر میں گزارہ
سُنا تھا کہ گھر کو بناتی ہے بیوی
مگر میری بیوی نے گھر ہی اُجاڑا
گزرتی تھی کیا خوب شادی سے پہلے
اے کاش رہتا سدا میں کنوارہ
میری جان اک بار چھوڑے اگر وہ
کروں گا نہ شادی کبھی میں دوبارہ

(شاعر: چوہدری عبدالخالق)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ایک روز میری غیر موجودگی میں ہمارے گھر میں سارے ماموں سر جوڑ کر بیٹھے' سب نے اچانک اور ایک ساتھ ہی محسوس کیا تھا کہ میں اب بڑا ہو گیا تھا اور چونکہ سارا دن آوارہ گردی کرتا رہتا تھا لہٰذا اب مجھے اسکول میں داخل کروا دینا چاہیے۔ ماں نے دبے لفظوں میں کہا بھی کہ ابھی

زاد بھائی کے مقدر کا فیصلہ بھی ہو گیا اور اس کو بھی میرا ہمسفر بنانے کا عندیہ دے دیا گیا۔

یہ فیصلے چونکہ ہم سے بالا بالا ہی ہوئے تھے اس لیے

اور بستہ کُھل گیا

ایک معصوم بچے کی شرارتوں کا دلچسپ احوال

''ظالم'' ماموں کو بچوں کی آزادی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی

محمد سعید جاوید

بچہ ہے چار پانچ سال کی بھلا کوئی عمر ہوتی ہے اسکول جانے کی' لیکن ان کی آواز کو اکثریت اور مردانہ برتری کے بل بوتے پر دبا دیا گیا۔ نئے آئے ہوئے منجھلے ماموں نے ایک آدھ مثال دے کر تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی کہ ان کے گاؤں کا میرا ایک ہم عمر بچہ دوسری جماعت میں پڑھتا ہے۔ اس گھریلو پنچایت میں آخر کار یہ طے کر لیا گیا کہ پرسوں سے مجھے اسکول بھیجا جائے گا۔ اسی میٹنگ میں میرے ایک اور ماموں

اگلا دن حسب معمول ہم نے اپنی روزمرہ کی مصروفیات سے شروع کیا اور گھر میں میری ''بربادیوں'' کے مشورے ہوتے رہے۔ دوپہر کے وقت ماں نے مجھے یہ بریکنگ نیوز سنائی کہ ''میرا بچہ کل سے اسکول جائے گا۔''

اسکول کے بارے میں میرے اپنے ہی کچھ شکوک و شبہات اور خدشات تھے۔ شیشم کے درختوں میں گھرا ہوا ایک کچے کمرے پر مشتمل یہ اسکول دور سے بڑا بھلا لگتا تھا لیکن قریب سے گزرتے ہوئے وہاں سے بڑی ہی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

درد ناک فریادیں اور بچوں کے رونے کی آوازیں آتی تھیں۔ یہ سارا کچھ ایک دم ذہن میں آیا تو اسکول جانے سے صاف مُنکر ہو گیا۔ ماں پہلے تو چپ رہی پھر سمجھانے لگیں کہ پڑھو گے نہیں تو گڈیوں کے بابو کیسے بنو گے۔

ان بچاری سیدھی سادی گھریلو خواتین نے بہت قریب سے اگر کسی سرکاری آفیسر کو دیکھا تھا تو وہ کوئی آٹھ کلومیٹر دور چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کا اسٹیشن ماسٹر تھا یا پھر دودھ کی طرح دھلی ہوئی سفید وردی میں ملبوس ریلوے کا گارڈ جس کے ایک اشارے پر اتنی بڑی گاڑی چلنا شروع ہو جاتی تھی۔ سو اس وقت کی خواتین اپنے بچوں کو ڈاکٹر یا انجینئر بنانے کے بجائے ان ہی دونوں پیشوں میں بھیجنے کی خواہش رکھتی تھیں کیونکہ پہلی دو اقسام کو کسی نے اتنے قریب سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ جب میں چھوٹا تھا تو میری ماں کی رشتے کی بہن کو بطور مددگار بلایا گیا تھا وہ اس وقت کوئی پندرہ سال کی لڑکی تھی اور ریل گاڑی میں تازہ تازہ سفر کر کے خانپور سے یہاں آئی تھی۔ وہ بھی ہمارے گھر والوں کی طرح یکساں طور پر ریلوے حکام سے متاثر تھی۔ وہ سارا دن مجھے اٹھائے پھرتی اور جب میں منہ پھاڑ کر روتا تھا تو مجھے جھولے دیتی ہوئی کہتی تھی ”میرا گڈیاں دا بابو میرا اٹیشن بابو“۔ گویا سب کی ایک ہی خواہش تھی کہ مجھے اس عظیم محکمے میں نوکری مل جائے اور اگر ایسا ہو گیا تو سب کی عاقبت سنور جائے گی۔ صد افسوس! ایسا ہو نہ سکا اور میں کچھ اور ہی بن گیا۔ وہ سب تو اب دیکھنے کے لیے زندہ نہیں ہیں لیکن میں ابھی تک اپنے آپ کو شرمسار محسوس کرتا ہوں کہ میں ان سب کی اتنی معصوم اور ادنیٰ سی خواہش پوری نہ کر سکا۔

اگلی صبح نہلا دھلا کر میری ماں نے مجھے آسمانی رنگ کی تہ دھوتی بندھوائی اور حفظِ ماتقدم کے طور پر پیچھے گرہ بھی لگا دی تا کہ کہیں راستے یا اسکول میں کھل کر بچے کو نادم نہ کر دے۔ حالانکہ ہم ان دنوں اس تکلف کے بغیر ہی نہروں، کھالوں اور ٹوبے میں نہاتے پھرتے تھے۔ سفید کرتا پہنا کر انھوں نے سر پر ڈھیر سارا سرسوں کا تیل چپڑا جو سفر کرتا ہوا کنپٹیوں تک آ پہنچا تھا۔ سر کے عین وسط میں سے مانگ نکال دی گئی، آنکھوں میں لمبی دُم والا سرمہ لگایا کہ یہ اس زمانے کا چلن تھا۔ پھر اندر سے میرا مجوزہ بستہ اٹھا لائیں۔ کھول کر مجھے دکھایا، عام سے ملیشیا کپڑے کے ایک ٹکڑے کو بچھا کر اس پر ایک سلیٹ' ایک کاپی اور ایک قاعدہ ترتیب سے رکھا ہوا تھا اور اس کے اوپر شیشے کی کالی سیاہی سے بھری ہوئی ایک چوکور دوات رکھی ہوئی تھی۔ سیاہی کو گرنے سے بچانے کے لیے دوات میں پرانے کپڑوں کی چھوٹی چھوٹی ٹاکیاں ڈال دی گئی تھیں جسے عام زبان میں ”صوف“ کہتے تھے۔ دو تازے سرکنڈے کے قلم اور ایک مُتّی سی تختی کے علاوہ گاچنی خاص مٹی کا ٹکڑا اور تھوڑا سا پاتھا بھی جیب میں ڈال دیا گیا تا کہ وہاں تختی دھونے کے بعد اس پر مل کے اسے ملائم کر سکوں۔ چار پرتوں والا ایک پراٹھا اور اچار بھی ننھے سے رومال میں باندھ کر بطور زادِراہ ساتھ کر دیا۔ ساتھ والے گھر میں میرا ماموں زاد بھائی اشرف مَتّو رہتا تھا، اس کا پیٹ بچپن ہی سے بے تحاشا پھولا رہتا تھا اور فرمائش پر وہ اس کی فخریہ نمائش بھی کیا کرتا تھا، اسی لیے اس نے یہ خطاب پایا تھا۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی کیا گیا اور دونوں کو دولہا کے شہ بالوں کی طرح ساتھ ساتھ بٹھا کر ایک ایک چونی بطور رشوت اور حوصلہ افزائی نقدی کی شکل میں ادا کی گئی؛ جو اس وقت اتنی بڑی رقم تھی کہ حفاظت کے لیے ہر وقت اپنی آنکھیں کھلی رکھنا پڑتی تھیں۔ چھوٹے ماموں غلام باری کو جو غصے کے کچھ ہلکے اور تھوڑے سے شرارتی بھی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

واقع ہوئے تھے' ہمیں اسکول پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ گھر کی خواتین بھی رخصتی کے وقت کچھ دور تک ہمارے ساتھ چلیں۔ مونچھیں مروڑتا ہوا بنھل ماموں بھی کچھ دور کھڑا لال پیلی اور معنی خیز نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا اور ہمیں سنانے کے لیے اونچی آواز میں بولا کہ "اگر یہ کچھ نخرے کریں تو پھر مجھے بتانا میں خود ہی نپٹ لوں گا۔"

بہرحال ہم دونوں کو منشی شفیع کے حضور پیش کر دیا گیا جو اس پرائمری اسکول کے اکلوتے استاد تھے اور ہیڈ ماسٹر بھی' لیکن گاؤں کے لوگ اور بچے ان کو "منشی جی" ہی کہتے تھے۔ وہ بھی یہ کہلوا کر خوش تھے۔ وہ ہمیں اور ہماری سات پشتوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور ہمارے پڑوسی بھی تھے بلکہ ماموں کے گھر ہی میں رہائش کے لیے ان کو ایک کمرا دیا ہوا تھا۔ ہمیں بھی اسی ناتے ان سے کچھ اچھی توقعات تھیں کم از کم تشدّد کے حوالے سے جو بعد میں غلط ثابت ہوئیں۔

منشی جی' جو اس وقت مسواک کرنے میں مشغول تھے، ہمیں دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائے اور سر کے اشارے سے ہمیں قبول کیا اور بوری بچھا کر نیچے دوسرے بچوں کے ساتھ بیٹھ جانے کو کہا۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی بوریاں بچھالیں اور متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر ماحول میں مدغم ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی دوران منشی جی نے کچھ اچھی باتیں بھی کیں، کچھ بُرے وقت سے ڈرایا اور اپنی اس بات پر زور دینے کے لیے انھوں نے نہ صرف اپنے اسلحے کی نمائش کی بلکہ ایک بچے پر' جو بہت شور مچا رہا تھا' اس کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ ان کا یہ تشدّد کا ہتھیار ایک تازہ چھلی ہوئی شہتوت کی سوٹی تھی جس کی سُر تال میں توازن رکھنے کے لیے وہ اسے پاس ہی پڑے ہوئے تکیے پر مار کر اس کی ٹیوننگ کرتے تھے۔ بعد میں پتا لگا کہ وہ روزانہ اپنے مزاج اور موقعے کی مناسبت سے شجر کا انتخاب کرتے تھے کبھی شہتوت، کبھی شیشم اور کبھی نیم اس مقصد کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ہاں سردیوں میں ان کا یہ ہتھیار پتلے دیسی گنے کی شکل میں نمودار ہوتا تھا جسے وہ چوستے بھی جاتے تھے اور تشدد کے لیے استعمال بھی کر لیتے تھے۔

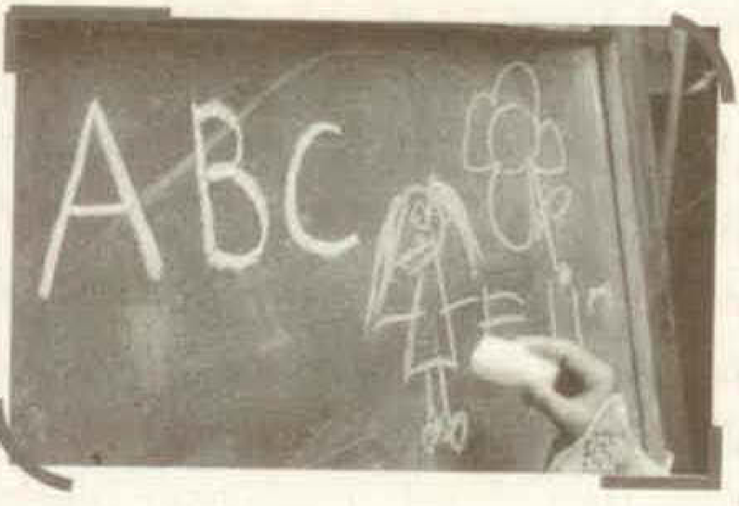

پہلے دن صبح کچھ وقت تو اسکول میں صحیح گزرا، ہم دونوں اپنی نئی نئی چیزوں سے کھیلتے رہے، تھوڑی دیر بعد کلاس کے دوران ہی ہم نے اپنی پوٹلیوں سے پراٹھے نکال کر اچار کے ساتھ کھائے' حالانکہ اس کا کوئی وقت تھا اور نہ ہی ضرورت۔ منشی جی نے دیکھا اور انجان بن گئے' شاید پہلا دن سمجھ کر معاف کر دیا تھا۔

اسی دوران اشرف متّو نے اپنی دوات کا ڈھکن کھولا اور کوئی تجربہ کرنے کے چکر میں، اس کے منہ پر اپنی چونی رکھ کر اسے بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد چونی کی موجودگی کا یقین کرنے کے لیے ڈھکن دوبارہ کھولا تو وہ غائب ہو چکی تھی۔ پتا چلا کہ ننھی سی چونی دوات کے اندر گر گئی تھی۔ پہلے تو اس نے اپنے طور پر انگلیاں اندر گھسیڑ کر نکالنے کی کوشش کی، جب نہیں نکلی تو مدد کے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

لیے مجھے پکارا، مجھ سے بھی کچھ نہ بن پڑا تو اس نے اپنا بڑا سا منہ کھول کر بھاں بھاں رونا شروع کر دیا جس سے سوئے ہوئے منشی جی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اچھے موڈ میں تھے، کچھ ابتدائی طریقے انھوں نے بھی آزمائے لیکن بات نہ بنی۔ اس دوران اشرف متو مسلسل روتا رہا۔ پہلے ہی دن اتنے بڑے مالی خسارے کا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا، آخر فیصلہ ہوا کہ دوات کو توڑ دیا جائے جو اس وقت شاید ایک آنے کی آتی تھی اور اتنی ہی رقم کی سیاہی اندر موجود تھی، گویا صافی خسارہ کم ہو کر دو آنے رہ گیا تھا۔ غرض دوات ٹوٹنے پر صوفے میں پھنسی ہوئی چونی برآمد ہوئی جسے اس نے اپنی قمیص کے دامن سے صاف کر کے سیاہی وہاں منتقل کی اور پھر بلاوجہ اِدھر اُدھر دیکھ کر دانت نکالنے لگا۔

پہلے دن منشی جی نے ہاتھ ہلکا رکھا اور جب ہمیں اپنی منشا کے مطابق اچھل کود کرنے پر کچھ نہ کہا تو اسکول ہمیں بالکل بھی برا نہ لگا تھا۔ ہاں اس دوران ہم اپنے مستقل ساتھیوں کی کمی ضرور محسوس کرتے رہے۔ چشم تصور سے انھیں اپنی روزمرہ کی سرگرمیوں میں مشغول دیکھا تو دل کو صدمہ سا ہوا۔ اسکول کے پاس سے گزرنے والوں سے سوالیہ نظروں سے پوچھتے تھے کہ ”کس حال میں ہیں یاران وطن۔“

گھر واپسی پر ماں نے تو پیار کیا، مگر میرا ساتھی اشرف متو اپنی نئی دوات توڑنے کے جرم میں ہلکا پھلکا پٹا بھی تھا۔ اگلی صبح ہم دونوں اپنے طور پر ہی اسکول چلے گئے۔ اس دن منشی صاحب اپنی آئی پر آ گئے اور سارے تعلقات کو پس پشت ڈال کر تھپڑوں سے آغاز کیا اور دوپہر تک باقاعدہ چھڑی کا استعمال شروع کر دیا۔ ہم دونوں آپس میں مستیاں کر رہے تھے اور ہمارا شور ان کے آرام میں مسلسل خلل ڈال رہا تھا۔ پہلے تو انھوں نے ”اوں ہوں“ کر کے فہمائش کی، جب باز نہیں آئے تو دونوں کو لائن حاضر کر کے شہتوت کی چھمک سے ہاتھوں اور کمر کی ٹکور کر دی، اتنی تکلیف ہوئی کہ آنسو نکل آئے۔ آج بھی جب اس کی یاد آتی ہے تو استاد اسد امانت علی خاں کا گایا ہوا پیر فرید کا کلام یاد آ جاتا ہے کہ ”ننگے پنڈے مینوں چھمکاں مارے تے میرے روندے نیں نین نمانے۔“ ہمارا پنڈا تو ننگا نہیں تھا لیکن اثرات کم و بیش ویسے ہی تھے جو پیر فرید صدیوں پہلے بیان کر گئے تھے۔

یہ وہ موقع تھا جب پہلی دفعہ دل و دماغ میں اسکول اور خاص طور پر منشی جی کے خلاف بغاوت کے جذبات ابھرے، لیکن اشرف متو سے مشورے کے بعد یہ طے پایا کہ فی الحال بھاگنے کے عمل کو کچھ دنوں کے لیے مؤخر کر دیتے ہیں، تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو۔ اس دوران گھر والے بھی مطمئن ہو گئے تھے کہ ان کا دل لگ گیا ہے اس لیے انھوں نے روزانہ کی بنیاد پر پوچھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ انھیں کیا پتا تھا کہ اندر ہی اندر کیا لاوا پک رہا تھا جس کو ایک دن پھٹنا ہی تھا۔

اور پھر وہ دن آ ہی گیا، اس دن ہم نے اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی بنا پر منشی جی کے ہاتھوں سخت ہزیمت اُٹھائی اور جسمانی اذیت کا شکار بھی ہوئے تھے۔ ہم دونوں کی ہنگامی مجلس ہوئی، حالات کی روشنی اور تازہ چوٹوں کی جلن کے پس منظر میں آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ ہم لوگ ہر صبح حسب معمول گھر سے اسکول کے لیے روانہ تو ہوں گے مگر منزل مقصود پر نہیں پہنچیں گے بلکہ راستے ہی میں کہیں گم ہو جایا کریں گے۔

اگلے دن گھر سے تیار ہو کر نکلے تو پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت ہم نے آک کے بڑے بڑے پودوں کے نیچے ریت تلے اپنے بستے دبائے، اپنا اپنا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پراٹھا ساتھ لے کر راہ گزر بدل لی اور اپنے بچھڑے ہوئے رفیقوں سے جا ملے، جو اپنی روزمرہ کی سرگرمیوں کے مطابق اس وقت نہر پر طوطوں کے بچے تلاش کرنے میں مگن تھے۔ انھوں نے ہم دونوں کو دیکھ کر نعرۂ مستانہ بلند کیا اور ہمارا شاندار استقبال کیا۔ بیچ میں ایک دو نے طنزیہ جملے بھی کسے کہ ”پرے پرے ہٹ جاؤ پڑھاکو آ گئے نیں۔“ پھر ہم اس شدت سے کھیلے کہ اسکول نام کی کسی چیز کے وجود سے ہی منکر ہو گئے۔ حالانکہ ہمارے قدرے صاف کپڑے کھلم کھلا چغلی کھا رہے تھے کہ ہم کسی اور ہی جہان کے باسی ہیں جو غلطی سے اس طرف نکل آئے ہیں۔

جب سورج عین سر پر آیا تو فکر ہوئی کہ واپس بھی جانا ہے۔ اسکول کی چھٹی کے وقت ٹھیک اسی انداز میں ہماری گھر واپسی ہوئی، جہاں گھر والے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ماں نے بلائیں لیں اور پاس بیٹھ کر کھانا کھلایا، حالانکہ شرم کے مارے میں ان سے نظر بھی نہیں ملا پا رہا تھا۔

یہ پروگرام بہت خوبصورتی اور کامیابی کے ساتھ جاری تھا، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ دوستوں نے بھی رازداری کا حلف دیا تھا۔ شکر ہے گھر میں ”علموں بس کریں او یار“ والا معاملہ تھا، کوئی پڑھا لکھا نہیں تھا اگر تھا بھی تو اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی ورنہ ایک دن بھی کوئی ہمیں پاس بٹھا کر سبق سن لیتا، تو سب کو ہماری بے پایاں مصروفیات کا ٹھیک ٹھاک علم ہو جاتا تھا۔

بُرا وقت کسی کو بتا کر نہیں آتا، اس نے آتے ہوئے ہمیں بھی نہیں بتایا اور بس یکدم آ گیا۔ ایک دن صبح صبح منشی جی اسکول جانے کے لیے نکلتے ہوئے ہمارے گھر آ دھمکے اور ماں کو کہنے لگے کہ ”بہن یہ بچے آج کل اسکول نہیں آ رہے خیریت تو ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا ان کی۔“

سب گھر والوں کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا اور سکتے میں آ گئے۔ میری ماں قسمیں کھا کھا کر منشی جی کو باور کرواتی رہیں کہ وہ باقاعدگی سے مجھے اسکول بھیجتی رہی ہیں۔ تقریباً ایسا ہی بیان اشرف مٹو کے گھر والوں نے بھی دیا۔ منشی جی تو چنگاری لگا کر چلے گئے، ان کے جانے کے بعد گھر میں وہ طوفان اٹھا کہ اللہ کی پناہ۔ ہر کوئی اپنی استطاعت کے مطابق جلی کٹی سنا رہا تھا، ماں روتی بھی جاتی تھیں اور ساتھ ساتھ ابا جان کو بھی کوستی جاتی تھیں کہ وہ انھیں کس مصیبت میں ڈال کر خود کراچی میں آرام سے بیٹھے ”عیاشیاں“ کر رہے ہیں۔

بات کافی آگے بڑھ گئی تھی۔ بنجھل ماموں کو بھی بھنک پڑی اور وہ اپنا فرض نبھانے فوراً ہی آ دھمکا، معاملہ گرم تھا اس نے ہمیں اسکول تک پہنچانے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں ساتھ ہی جتا بھی دیا کہ وہ اس بات کی ضمانت بھی دے گا کہ دوبارہ یہ کبھی اسکول سے نہیں بھاگیں گے۔ حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اس کی یہ پیش کش فوراً ہی قبول کر لی گئی۔ اس کو تو موقع چاہیے تھا پہلے تو اس نے وہیں ہم دونوں کو مجرموں کی طرح ساتھ ساتھ کھڑا کر کے تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کی، پھر کہنے لگا کہ "چلو آگے لگو۔"

ہم چونکہ ملزم بنے بغیر سیدھا سیدھا مجرم قرار پا چکے تھے اس لیے خاموشی سے حسب حکم آگے لگ گئے اور وہ پیچھے۔ ایک ہاتھ میں بیلوں کو ہنکانے والی سوٹی تھی جس میں لگی ہوئی چمڑے کی تیل پلائی ہوئی چابک دور سے ہی چمک رہی تھی۔ کچھ دور تک تو وہ خاموش رہا پھر ہی جیسے گھر والے نظروں سے اوجھل ہوئے تو وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد تیزی سے اچک کر آگے بڑھتا اور ہم پر پل پڑتا، ایسی ایسی جگہوں پر حملے کیے کہ اسکول میں بھی زیادہ وقت ہمیں کھڑے رہ کر ہی پڑھنا پڑا کیونکہ بیٹھنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔

ہمیں اس بیدردی سے پٹتا دیکھ کر گاؤں کے بچے سہم کر یا تو گھروں کے اندر بھاگ گئے یا ماؤں کے پیچھے دبک گئے۔ یہاں تک تو سب قابل قبول تھا لیکن جب ان لڑکوں کے سامنے ہماری چھترول ہوئی جن پر ہماری دہشت طاری رہتی تھی، تو ہمارے چہروں پر ندامت اور ان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

اسکول میں منشی جی کے سامنے ہمیں کھڑا کر کے بتھل ماموں نے فاتحانہ انداز سے دیکھا اور مستقبل میں مزید اسی قسم کے تشدد کی دھمکی دیتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ کہنا فضول ہے کہ بعد میں منشی جی نے بھی اپنا فرض خوب نبھایا، مارا تو نہیں، ہاں ہمیں مرغا بن جانے کو کہا جو ہمیں ابھی اچھی طرح بننا بھی نہیں آتا تھا۔ ہمارا "پیچھا" صبح سے لگاتار جوتے اور چابک کھانے کے بعد مسلسل کرب کی حالت میں مبتلا تھا۔ پھر بھی جیسے تیسے کر کے اچھی طور پر مرغا بننے کا کچھ اہتمام کیا جو ان کو پسند نہ آیا۔ دو لڑکوں کو بُلوا کر ہماری تربیت کا انتظام کروایا گیا جنھوں نے ہمیں اچھا مرغا بننے کے اسرار و رموز سکھائے۔ پھر کسی نہ کسی طرح بن ہی گئے اور یوں ساری کلاس کے سامنے رہی سہی عزت سادات بھی غارت ہو گئی۔ یہاں نہ تو ابا جان کی فوج میں بھرتی کام آئی اور نہ ہی منشی جی کو اتنا خیال آیا کہ میں ان لوگوں کے گھر میں رہتا ہوں کہیں مجھے نکال ہی نہ دیں۔ کوئی آسمان ٹوٹا، نہ زمین پھٹی، منشی جی نے حسب منشا اپنی ساری خواہشوں کی تکمیل کر لی تھی۔

چند روز بعد ہی شدت سے اندازہ ہو گیا کہ یہ سب کچھ فضول ہے۔ بہتر یہی ہے کہ شرافت سے تعلیم کی طرف توجہ دی جائے اور پھر میں اچھا بچہ بن گیا، آٹھ دس بچوں کی کلاس کا مانیٹر بھی بنا دیا گیا اور منشی جی کی طرف سے کلاس کے بچوں کو عزت اور ذلت دینے کے اختیارات بھی مجھے مل گئے تھے۔ لہٰذا جن بچوں سے ذرا بھی دشمنی ہوتی تھی میں ان کا ناک پکڑ کر پوری قوت سے ان کے رخسار پر طمانچہ لگاتا، ایک دن میں یہ سب کچھ کرتا ہوا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منشی جی نے تفویض کیے گئے اختیارات سے تجاوز کرنے پر اس لڑکے کو کہہ کر یہی سب کچھ میرے ساتھ بھی کروایا۔ وہ تازہ تازہ سزا یافتہ ہوا تھا، اس لیے کسر اس نے بھی نہیں چھوڑی، جیسے ہی طمانچے کی آواز گونجی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ بڑی مشکل سے آنسوؤں کو نکلنے سے روکا کیونکہ مانیٹر رویا نہیں کرتے تھے۔ ویسے بھی جنگل کا اور منشی جی کا قانون ایک ہی تھا ورنہ اس طرح بھلا کوئی کلاس مانیٹر کو سب کے سامنے ذلیل و خوار کرواتا ہے۔

ان دنوں آپس کی چھوٹی موٹی لڑائیاں تو گھونسوں اور تھپڑوں سے نپٹالی جاتی تھیں تاہم جب ہتھیاروں کا استعمال ناگزیر ہو جاتا تو اس وقت تختیوں سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے اور ماہر تلوار بازوں کی طرح

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ٹھیک ٹھیک نشانے لگاتے اور دشمنوں کو بھاری مالی و جسمانی نقصان پہنچاتے۔ اگلے دن ہارے ہوئے لشکر کے شکست خوردہ سپاہی لوہاروں کے پاس بیٹھے اپنی تختیوں پر ٹین کی پتریاں لگوا رہے ہوتے۔ جو یہ سب کچھ نہ کر سکتے تھے وہ اپنی بغیر دستی کی لنڈوری تختیاں لیے شرمائے شرمائے پھرا کرتے تھے۔

جیسا کہ شروع میں لکھا ہے کہ اسکول ماسٹر کو گاؤں میں منشی جی کہا جاتا تھا- یہ نام کیسے پڑا، کچھ معلوم نہیں، لیکن جب خود انھیں اعتراض نہیں تھا تو دوسرے کیوں ان تکلفات میں پڑتے۔ منشی جی دور کہیں کسی دوسرے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اصولی طور پر گاؤں میں دو تین لوگ ہی پڑھے ہوئے تھے جن میں سے منشی جی اعلیٰ تعلیم یافتہ یعنی مڈل پاس تھے۔ ڈاکیے اور گھڑی والے کو تو تعلیم صرف چھو کر ہی گزری تھی۔ باقی ہر طرف اللہ کا نام اور محمدؐ کا کلمہ تھا۔ اس لیے منشی جی کی شمولیت اور مشورے کے بغیر کوئی بڑا فیصلہ نہیں ہوتا تھا۔ بہت عزت کی جاتی تھی اور نائی کی طرح ان کے سامنے بھی بڑے بڑے چودھریوں کے سر جھک جاتے تھے اور اسکول نہ جانے والے بچے بھی ان کو دیکھ کر ادھر اُدھر ہو جاتے تھے۔ اس کی غالباً ایک وجہ اور بھی تھی کہ گاؤں میں آنے والے سارے خطوط وہ ہی پڑھ کر سنایا کرتے تھے اس لیے وہ تقریباً ہر گھر کے اندرون خانہ رازوں کے امین بھی تھے، گو انھوں نے کبھی اس کا فائدہ نہیں اٹھایا تھا لیکن پھر بھی لوگ انھیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ ویسے تو ان کی رہائش کا انتظام ہمارے ہی گھروں میں تھا لیکن وہ صبح سے شام تک اسکول میں ہی پائے جاتے تھے۔

منشی جی کا کھانا اور لسی صبح دس بجے کے قریب کسی طالب علم کے گھر سے آتی تھی، اس وقت تک وہ بہت فعال اور چست و چالاک رہتے تھے، تاہم جیسے ہی وہ کھانا کھا کر پوری منگی لسی کی پی لیتے ان پر غنودگی چھانے لگتی، چارپائی پر لیٹ جاتے، انجن کے پسٹن کی طرح ان کی مسلسل ہلتی ہوئی ٹانگ کی حرکت پہلے آہستہ ہوتی اور پھر رک جاتی۔ یہ مرحلہ آنے تک ہم لوگ منہ پھاڑ پھاڑ کر با آواز بلند سبق دُہراتے یا گا گا کر پہاڑے یاد کرتے رہتے تھے، کورس کی یہ آواز ان کے لیے لوری کا کام دیتی اور وہ پڑھایا جانے والا قاعدہ منہ پر رکھ کر نیند کی گہری وادیوں میں اتر جاتے جس کے بعد انھوں نے کم از کم ڈیڑھ گھنٹا قیلولہ کرنا ہوتا تھا۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔

ہم میں سے ایک جاسوس بچہ کسی بہانے ان کے قریب جا کر اس بات کی تسلی کر لیتا کہ وہ واقعی حالت نیند میں ہیں۔ اس کی طرف سے ''سب اچھا'' کا اشارہ ملتے ہی سارے بچے بستے وہیں چھوڑ کر آہستگی سے کھسک جاتے اور کوئی ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے نہر کی جھال پر جا کر خوب نہاتے، شور مچاتے اور ایک دوسرے کو گالیاں دیتے یا نہر میں دھکے دیتے تھے۔ جب اندازہ ہو جاتا کہ وقت رخصت آ گیا ہے تو کپڑے پہن کر اسکول کی طرف بھاگ نکلتے۔ منشی جی ابھی تک محو خواب ہی ہوتے تھے کہ ہم واپس بھی پہنچ جاتے اور ان کے ہوشیار ہونے سے پہلے اپنے اپنے مقام پر بیٹھے سبق یاد کر رہے ہوتے تھے۔ اس وقت ہمارے چہروں پر فرشتوں والا مقدس نور آ جاتا تھا۔

مگر یہ سلسلہ کچھ زیادہ دن جاری نہ رہ سکا۔ ایسے ہی ایک وقفے کے دوران گاؤں کا نائی منشی جی کی حجامت بنانے اسکول آ گیا اور ان کو جگایا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سارا اسکول بچوں سے خالی تھا۔ نائی نے کوئی پرانی دشمنی نبھائی اور ان کو بتایا کہ جب وہ اس طرف آ رہا تھا تو اُس نے دور نہر کی جھال پر کچھ ہلچل دیکھی تھی اور کچھ آوازیں بھی سنی تھیں۔ منشی جی نے اپنی عزت کی خاطر اس کے سامنے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

خاموشی اختیار کی کیونکہ یہ ان کی انتظامیہ کی ناکامی تصور ہوتی، تاہم اس کے جاتے ہی انھوں نے حسب عادت ایک ہاتھ میں شہتوت کی چھمک اٹھائی اور مسواک کرتے ہوئے نہر کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ ہم سب اپنی دھن میں مگن نہر کے ٹھنڈے پانی میں چھلانگیں لگا رہے تھے اور ساتھ ساتھ لوک گیتوں اور گالیوں کا سلسلہ بھی جاری تھا، کسی کو خبر ہی نہ ہوئی کہ منشی جی کب وہاں آ پہنچے۔ ایک ساتھی نے خبردار بھی کیا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی، نہر کی پلی سے نیچے چھلانگ مارتا ہوا ایک بچہ تو عین وسط میں ان کا شکار ہوا اور بیک وقت تین آوازیں سنائی دیں جن میں سے ایک ان کی چھمک کی، دوسری بچے کے چیخنے کی اور بعد ازاں پانی میں گرنے کی۔ ہر طرف ہاہا کار مچ گئی، مصیبت یہ تھی کہ منشی جی ٹھیک اس جگہ خزانے کا سانپ بن کر بیٹھ گئے تھے جہاں سے ہمیں اپنے کپڑے اٹھانا تھے۔ کپڑے بہت ضروری تھے اس لیے ہر ایک کو اپنے دکھوں کی صلیبیں خود ہی اٹھانا پڑیں اور اپنی اپنی کمر پر تکلیف دہ بے عزتی اور اذیت کے داغ لیے کپڑے اٹھا کر بھاگے۔ کچھ بڑے بچوں نے جانگیے پہنے ہوئے تھے۔ شلوار کا ابھی رواج ہی نہیں تھا ورنہ اس بھاگ دوڑ میں آدھے سے زیادہ تو پائنچوں میں پھنس کر گر گئے ہوتے یا ان کا ازار بند نکل جاتا۔ جیسے تیسے کر کے دھوتیاں لپیٹیں۔ منشی جی نے شاید محسوس کیا کہ افراتفری کے اس عالم میں کچھ بچے مار کھانے سے بچ نکلے ہیں لہٰذا انھوں نے اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا، ہاتھوں میں کپڑے لیے بھاگتے ہوئے بچوں کو روکا، تھوڑی بہت ستر پوشی کی اجازت دے دی اور وہاں قریب ہی کھیت میں با جماعت مرغا بنا دیا۔ بچے دھوتیوں کے لنگوٹے یا جانگیے پہن کر اس تلخ آزمائش سے گزر رہے تھے اور منشی جی سب سے بے نیاز نہر کے پل پر بیٹھے مسلسل مسواک کیے جا رہے تھے۔ بے عزتی اگر مکمل ہو جاتی تو اس وقت بچے سچ مچ کے چھلے چھلائے مرغے لگتے۔

معافی تلافی ہوئی تو جھکے سروں کے ساتھ سب اسکول کی طرف چلے۔ پیچھے پیچھے منشی جی فاتحانہ انداز میں گویا اس ریوڑ کی نگرانی کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ اس غیر متوقع مشقت، جس میں انھیں اتنی گرمی میں پیدل بھی چلنا پڑا تھا اور پھر سارے بچوں سے حساب بھی چکایا تھا، وہ کچھ تھک سے گئے تھے اس لیے آتے ہی خاموشی سے لیٹ گئے۔ اپنی باقی ماندہ نیند مکمل کرنے سے قبل انھوں نے ہمیں یہ خوش خبری سنائی کہ ہماری اس حرکت کی وجہ سے آج چھٹی دوپہر کو نہیں بلکہ شام ڈھلے ہوگی، جس پر عمل اس لیے نہ ہو سکا کہ جب مقررہ وقت پر بچے اسکول سے گھر نہیں پہنچے تو ان کی مائیں گھر سے اسکول پہنچ گئیں۔ اب منشی جی کو ہر بار سارا واقعہ نئے سرے سے سنانا پڑتا تھا اس لیے انھوں نے عافیت اسی میں ہی جانی کہ ان کو چھوڑ ہی دیا جائے۔ اس دن کے بعد ہماری یہ خوبصورت مصروفیت بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ منشی جی بھی چوکنا ہو گئے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد نیند سے چونک کر اٹھتے اور خوابیدہ نظر بچوں پر ڈال کر مطمئن ہو کر اپنے خوابوں کا تسلسل جاری رکھتے۔

تنخواہ ان کو غالباً چالیس پچاس روپے ملتی ہوگی جس میں سے وہ ہر مہینے کسی نہ کسی بہانے چار پانچ روپے بچوں کو دے دیا کرتے تھے۔ کبھی اچھی نعت یا نظم سنانے پر یا حساب کا کوئی مشکل سوال حل کرنے پر ایک دو آنے انعام دے دیا کرتے تھے۔ بسا اوقات کوئی میٹھی رنگ برنگی گولیاں بیچنے والا آ نکلتا تھا تو سب بچوں کو گولیاں، جسے "مچھیاں" کہتے تھے، کھلا دیتے۔ مہینے میں ایک آدھ دفعہ وہ سائیکل پر اپنے گاؤں بھی جاتے تھے جو وہاں سے کافی دور نہر کے دوسری سمت تھا۔ ایسے مواقع پر بچوں کا ایک کارواں ساتھ چلتا تھا جو ان کے سائیکل کو اٹھا کر نہر پار کروا دیتے۔ منشی جی دھوتی کا لنگوٹ بناتے اور چھلانگ مار کر

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اس پر سوار ہو جاتے اور اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔ واپسی کا سفر بھی ایسے ہی ہوتا تھا، مقررہ دن اور وقت پر بچے نہر پر پہنچے ہوتے تھے اور وہی سب کچھ الٹی ترتیب سے دہرا دیا جاتا۔

اس وقت کے استاد بڑے عظیم لوگ ہوتے تھے وہ بچوں کی صرف اسکول ہی میں تربیت نہیں کرتے تھے بلکہ عام زندگی میں بھی ان پر نظر رکھتے تھے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ایک صبح میں نے اپنے سے دس سال بڑی پھوپھی کو للکارا اور اس سے ٹھیک ٹھاک لڑائی مول لے لی، پھر ہم دونوں خوب لڑے۔ میں نے اسے چٹیا سے پکڑ کر کھینچا اور اس کے حال دہائی مچانے کے باوجود میں اسے سارے گھر میں گھسیٹتا پھرا۔ ماں ڈنڈا اٹھائے صلواتیں سناتی میرا پیچھا کر رہی تھیں، اور دور کھڑی میری نابینا دادی نے جو بیٹی کی یہ حالت دیکھ نہیں سکتی تھی، سن تو سکتی تھی، اپنا علیحدہ ہی بھونچال اٹھا رکھا تھا۔ بہر حال کچھ دیر بعد حالات معمول پر آ گئے۔ اس نیک کام سے فارغ ہو کر میں اسکول چلا گیا۔

سخت سردی کے دن تھے منشی جی نے مجھے دیکھا اور خواہش ظاہر کی کہ میں قریبی کھیت سے ان کے لیے ایک دو اچھے اور ''نروئے'' سے دیسی گنے لا دوں۔ مجھے اس فرمائش پر بڑی خوشگوار حیرت ہوئی، کیونکہ پہلے روزانہ کی بنیاد پر یہ کام ایک دوسرا لڑکا کیا کرتا تھا۔ میں بڑے جوش و جذبے سے کھیت میں گھس گیا اور وہاں سے صاف ستھرے رس بھرے سبزی مائل سرخ دو دیسی گنے اکھاڑے، جن کو مزید چمکانے کے لیے میں نے ہر گنے پر تولہ بھر تھوک پھینکا اور پھر اپنی قمیص کے دامن سے رگڑ رگڑ کر ان کو شیشے کی طرح چمکا کر منشی جی کی خدمت میں پیش کر دیا اور خود ایک طرف کھڑا ہو کر ان کے منہ سے اپنے لیے خراج تحسین اور ستائش کے الفاظ سننے کا انتظار کرنے لگا۔ انھوں نے گنوں کو دیکھ کر بظاہر اطمینان کا اظہار کیا اور ان میں سے ایک [illegible]انہ سار سیلا گنا اٹھا کر مجھے آگے آنے کو کہا، تب ہی میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ کہنے لگے ہاتھ آگے بڑھاؤ۔ میں یہ سب کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بے یقینی کی کیفیت میں احمقوں کی طرح ہاتھ آگے کر دیا پھر جیسے ہی پہلا گنا سردیوں کی ٹھٹھرتی صبح میرے ہاتھ پر پڑا تو قیامت ہی گزر گئی۔ میری چیخ نے بڑے بڑوں کا پتہ پانی کر دیا ہوگا۔ ان کا غصہ عروج پر تھا گرج کر کہا کہ ''تیری جرأت کیسے ہوئی کہ اپنے سے بڑوں پر ہاتھ اٹھائے۔'' تب ہی مجھے یاد آیا کہ صبح جب میں اپنی پھوپھی سے دو دو ہاتھ کرنے میں مشغول تھا تو شور سن کر انھوں نے دیوار کے اوپر سے جھانکا تھا اور یہ بات دل پر لے لی تھی، اب یہ اسی کا شاخسانہ تھا جو میں بھگت رہا تھا۔ غرض دونوں گنے میرے ہاتھوں اور جسم پر ٹوٹے۔ درد اتنا تھا کہ ابتدائی چیخ کے بعد رویا بھی نہ جا سکا۔ پھر انھوں نے ایک لمبا چوڑا لیکچر دے کر چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب اچھی طرح دھوپ نکل آئی تو زخموں سے چور سارے جسم پر اللہ کی طرف سے ٹکور ہونے لگی اور بڑا سکون ملا۔ موسم سرما میں تو سنا ہے کہ پرانے زخموں میں بھی ٹیسیں اٹھتی ہیں یہ تو پھر تازہ ضربیں تقسیمیں تھیں جن کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو ماضی قریب میں ایسے حالات سے گزرا ہو۔

دن گزرتے گئے اور ایک دن اچانک ہمیں بتایا گیا کہ اب ہم کچی پہلی پاس کر کے دوسری جماعت میں چڑھ گئے ہیں۔ اس ترقی پر خوشی ہوئی اور غرور میں آ کر کچی پہلی جماعت کے ناک سڑکتے نئے بچوں کو حقارت سے بھی دیکھنا شروع کر دیا کیونکہ ہم بہر حال اب ان سے برتر اور کہیں زیادہ ''تعلیم یافتہ'' تھے۔ یہ اور بات ہے کہ تھوڑی دیر بعد انھی بچوں کے سامنے جب ہمیں روئی کی طرح دھنک دیا جاتا تو یہ وقتی غرور ادھر اُدھر ہو جاتا اور ہم اپنی اوقات میں واپس آ جاتے۔

(کتاب ''اچھی گزر گئی''...... سے ایک باب)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

شنگھائی

میں ہمارا جو عدیم المثال استقبال ہوا اگر وہ واقعی ہمارا تھا تو ہمیں چاہیے کہ ہر ماہ بس ایک بار شنگھائی ہو آیا کریں۔ وٹامن بی کمپلکس، کیلشیم اور ماء اللحم وغیرہ کے استعمال کی ضرورت نہیں، خون سیروں کے حساب سے خود بخود بڑھتا رہے گا۔ وہاں ہم ریل سے پہنچے تھے۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ دیکھا کہ ریلوے اسٹیشن کے صدر دروازے کے باہر قطار در قطار ہزاروں آدمی ہاتھوں میں ہار گلدستے اور غبارے لیے کھڑے ہیں۔ ہماری صورت دیکھتے ہی سب نے نعرۂ حیدری بلند کیا۔ پہلے تو خلقت کے اس اژدھام کو دیکھ کر ہم حیران و پریشان ہوئے پھر ہمت کر کے خود بھی نی ہاؤ...... نی ہاؤ...... یعنی بخیر بخیر کا آوازہ لگایا۔ ہم لوگ کاروں میں بیٹھے تو یہ ہجوم اور بے قابو ہو گیا۔ ہر شخص ہماری دست بوسی پر مصر تھا۔ ہمارے ساتھیوں نے اپنے کالے کالے پنجے باہر نکال دیے کہ لو ان کو چوم لو، آنکھوں سے لگا لو، پھر جانے ہمارا چین آنا ہو کہ نہ ہو۔ نتیجہ اس والہانہ خیر سگالی کا یہ ہوا کہ ٹریفک رُکنے لگا۔ ہم سمجھے کہ ہنگامہ اسٹیشن کی حدود تک ہے، اس کے بعد میدان صاف ملے گا۔ لیکن اسٹیشن سے ہوٹل تک کئی میل تک یہی منظر تھا۔ لوگ یونہی صف آرا تھے اور دل و جگر ہماری راہ میں نچھاور کرنے کو بے تاب تھے۔ ہمارا اندازہ عموماً غلط ہوتا ہے تاہم قیاس ہے کہ کوئی دو تین لاکھ آدمی ہوں گے، اتنے نہیں تو پچیس تیس ہزار سے کم تو کسی صورت نہ تھے۔ زیادہ تر بچے اور نوجوان لڑکے لڑکیاں۔ پولیس کے سنتری ان کو روکنے کی برابر کوشش کر رہے تھے کہ ہماری کاروں کے لیے رستہ رہے لیکن بے کار۔ آخر ہم نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ بھائیو، بہت ہو چکا اب اپنے ہاتھ اندر کر لو اور بس دُور سے سلام کرو، ورنہ کوئی حادثہ ہو جائے گا۔ دو تین بار کسی زہرہ جبیں کو کہ چین میں بھی ہوتی ہیں، مصافحہ کی سعادت بخشنے کے لیے ہم نے ہاتھ نکالا تو وہ کسی اور بھلے مانس نے اُچک لیا۔

اب سنیے! ہمارے بھی دوستوں کی باچھیں تو اس طرح کھلی ہوتی تھیں کہ وہ کوشش بھی کرتے تو سمیٹ نہ سکتے لیکن ہمارے دل کو دُگدا تھی کہ یہ سب کسی غلط فہمی کا شاخسانہ ہے۔ خیر مقدم ہمارا سبھی شہروں میں ہوا تھا اور اچھا ہی ہوا تھا۔ صدر جانسن کا سا نہیں کہ جہاں جاتے ہیں لوگ انہیں کالی

ہمارا صحیح مقام شنگھائی والوں نے پہچانا

اصولی طور پر تو یہ کہنا ہی کافی ہے کہ یہ ابن انشا تحریر ہے۔ ان جیسا واقعی کوئی اور نہیں

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جھنڈیاں دکھاتے ہیں، لیکن ایسا جلوس کہیں نہ نکلا تھا۔ ہم نے اپنے دوستوں سے کہا کہ رفیقو! خدا جانے یہ حضرات کیا سمجھ کر آپ کو یہ عزت بخش رہے ہیں۔ ہم نے اخبار میں پڑھا تھا کہ آج شام البانیہ کا ایک وزیر شنگھائی پہنچنے والا ہے۔ ہو نہ ہو یہ اہتمام اسی کے لیے ہے، جب حقیقت کھلے گی، تو یہ لوگ بھی شرمسار ہوں گے اور ہمیں بھی شرمسار کریں گے۔ ہماری بات ایک آدھ ساتھی کے تو جی کو لگی باقی نے اسے ہمارے احساس کمتری پر محمول کیا اور کہا کہ تم اس بات سے اندازہ مت کرو کہ اندرون ملک ہماری یوں آؤ بھگت نہیں ہوتی۔ وہاں تو لوگ ہم سے جلتے ہیں۔ ہمارا صحیح مقام وہی ہے جو چینیوں نے پہچانا ہے۔ چونکہ چینی لوگ نہ اردو جانتے ہیں نہ بنگلہ لہٰذا ہمارے دوستوں کی اس توجیہہ میں کچھ وزن ضرور تھا لیکن ہم سوچ رہے تھے کہ جب اصل مہمان عزیز نہ جانے کیا کیا توقعات لے کر شنگھائی کی سرزمین پر قدم رکھے گا تو کیا سوچے گا۔ اس کے حصے کے ہار تو ہمارے گلے میں حمائل ہیں اور جو گلدستے اتنی محنت سے اس کے لیے بنائے گئے تھے، یہ رہے۔ اس دوران میں لوگ بھی اپنا فرض ادا کر کے گھروں کو جا چکے ہوں گے۔ ہم نے ازراہ تحقیق ترجمانوں سے پوچھا کہ صاحبو تم بھی بیچ اس مسئلے کے کچھ بولو۔ انھوں نے منڈیا ہلا کر کہا، جناب یہ خیر مقدم چاروں خانے آپ کا ہے۔

ع گر قبول افتد زہے عز و شرف

خیر ہم بھی ان کی جگہ ہوتے تو اب جب کہ چڑیاں کھیت چگ ہی گئی تھیں یہی کہتے اور مفت کا کریڈٹ لیتے کیونکہ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔ نوکری جائے گی، تو اُس کی جو اس استقبال کے ہنگامے کا انچارج تھا۔ ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ جہاں سے ہمارا جلوس گزر لیتا ہے بھیڑ چھٹنی شروع ہو جاتی ہے۔ یعنی لوگ اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے ہوٹل پہنچ کر ہم اس کھڑکی سے جھانکا جو بڑی سڑک پر کھلتی تھی، تو دو کاریں بصورت جلوس ایک دوسرے کے پیچھے آتی آئیں ان میں سے کچھ لوگ شرمندہ اور پریشان، گر نکال نکال کر سڑک کے دو رویہ جانے کیا دیکھ رہے غالباً استقبال کرنے والوں کو تلاش کر رہے تھے۔ ہما خیال میں ہوا یوں کہ معزز مہمان (اصلی) کی گاڑی ہما بعد آئی۔ تب تک مطلع صاف ہو چکا تھا۔ خیر مقدم کر والے اپنے فرض سے ادا ہوئے۔ الاعمال بالنیات۔

یہ تو خیر ہماری بے لاگ رائے ہے لیکن اگر ہما ساتھیوں کی رائے درست ہے اور وہ تحسین ناشناس ہمارے لیے تھی تو چینیوں کے حُسنِ اخلاق، معا پروری اور کج مج نوازی کی داد دینی پڑے گی۔ ہم بھی اپنے کسی ساتھی سے اس شبہے کا اظہار کرتے ہیں یہ سب غلط فہمی کا کارخانہ تھا، تو وہ سمجھاتے ہیں کہ یہ نہیں۔ انسان کی قدر ہمیشہ وطن کے باہر جا کر ہوتی جہاں اس کی اصلیت جاننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ وسیلۃ الظفر کے مقولے کا یہی مطلب تو ہے۔

ہمارا ہوٹل...... ہوٹل سائون، عین رودبار سامنے اس بند گارڈن کے پہلو میں واقع تھا جس انگریزوں کے زمانے میں یہ تختی لگی رہتی تھی ”کتوں اور چینیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔“ دریا کے جتنی بھی عالی شان عمارتیں تھیں، انگریزوں اور دوسر غیر ملکیوں کی تجارتی کوٹھیاں اور بینک وغیرہ ۔ بعضوں کے سامنے پیتل کے بڑے بڑے شیر...... م شیر برطانیہ کی نشانی، اب تک ایستادہ تھے (اب سنا سُرخ محافظوں نے ان کی دم میں بھی نمدا باندھ ہے...... یعنی ان کی زیارت کرنے والے ہم آخری ا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تھے) ہوٹل ساسون، ایک یہودی ساسون نامی نے اس صدی کے اوائل میں بنایا تھا اور شنگھائی کا چوٹی کا ہوٹل تھا۔ اس کی طویل و عریض خواب گاہوں میں اب تک انگریزوں کی روحیں منڈلاتی ہوں گی۔ دروازوں، غسل خانوں کے ساز و سامان، بھاری صوفوں، شاہانہ پلنگوں، مجلا آئینوں اور منقش میزوں پر لندن یا مانچسٹر کی کسی نہ کسی کمپنی کا نام پیتل کی پلیٹ پر نقش ہے۔ برنارڈ شا جب 1934ء میں شنگھائی آیا، تو اسی ہوٹل میں فروکش ہوا تھا اور اسی کے عالی شان دروازے پر چین کے ادیب اعظم لوہسون کو اندر جانے سے روک دیا گیا تھا کیونکہ وہ چینی پاجاما کرتا پہنے تھا، جیسے کراچی کے اونچے ہوٹلوں اور کلبوں میں اب بھی ٹائی اور مغربی لباس کے بغیر جانے والوں کو روکتے ہیں۔ برنارڈ شا کو اس سے ملنے کے لیے ہوٹل کے باہر آنا پڑا۔

اب ایک عجیب اور آسیبی اتفاق کی بات سنیے یا پھر یہ زمان و مکان کے اسرار ہیں کہ جب ہم نے 1949ء میں اپنی نظم شنگھائی لکھی، تو اس کے دوسرے بند میں فرودگاہ کی منظرکشی یوں کی تھی:

بائیں باغ کے گرجا کے گھڑیال میں گیارہ بج بھی چکے ہیں
بازاروں کا شور و شغب بھی لحہ بہ لحہ تھمتا جائے
دریا کی پہنائی میں اک اسٹیمر کی سیٹی گونجے
کس کو خبر ہے کس منزل کو جائے ہے اور کس کو بلائے
چاند نے بھی پورب کے جھروکے میں اپنا مکھ دکھلایا ہے
چاند سے باتیں کون کرے جب درد ہی دل میں امڈا آئے

اوپر ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتے اور باتیں کرتے ہمیں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ نیچے پانچویں منزل پر اتر کر ہم نے اپنی خواب گاہ کے دریچے سے باہر جھانکا تو تمتماتا ہوا پورا چاند نیلے آسمان میں معلق تھا۔ یکایک سامنے دریا سے ایک اسٹیمر کی سیٹی گونجی اور پھر ہوٹل کے گھڑیال نے ٹن ٹن وقت کے گزرنے کی منادی دی۔ گنا تو پورے گیارہ بج رہے تھے۔

شنگھائی میں دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ چند قدم پر دریا کا وہ پل تھا جہاں شنگھائی کے لیے چیانگ کائی شیک اور ماؤزے تنگ کے سپاہیوں میں خوفناک اور فیصلہ کن جنگ لڑی گئی۔ سیکڑوں آدمی اس چھوٹے سے قطعہ زمین پر کھیت رہے اور دریا کا پانی خونا خون ہو گیا۔ کومن تانگ والوں نے اردگرد کی تمام عمارتوں میں ہمارے ہوٹل کی کھڑکیوں میں بھی، مورچے بنا رکھے تھے یعنی خود وار کر سکتے تھے۔ لیکن انقلابیوں کی زد سے محفوظ تھے۔ ادھر تاریخ کا فیصلہ سب پر روشن تھا۔ شنگھائی کو انقلابیوں کی آغوش میں آنا ہی تھا۔ اس لیے ان کی کوشش تھی کہ کسی عمارت کو گزند نہ پہنچے۔ ہر چیز صحیح سالم رہے اور وہ یوں ہوا کہ بستی کے لوگوں نے جتھے بنا کر چیانگ کائی شیک کے سپاہیوں کو ان کمین گاہوں سے کھدیڑ باہر کیا۔ ساسون ہوٹل کے بیروں، خانساموں نے بلمتوں، بانسوں، چھریوں، کانٹوں، میزوں، کرسیوں اور اسٹولوں کے اسلحہ استعمال کیے اور ساری بستی......

"یہ فتح مبین، فتح مبیں، فتح مبیں ہے"
کے ترانوں سے گونج اٹھی۔

شنگھائی میں ہماری سیر کا آغاز بھاری اور ہلکی صنعتوں کی نمائش گاہ سے ہوا جو ہم نے صبح کو دیکھی اور شام ہماری لوہسون کے میوزیم میں گزری۔ نمائش گاہ کے راستے میں ایک بہت بڑا چوک آتا ہے، جب چھے ستمبر کو بھارتی فوجیں لاہور پر یکایک حملہ آور ہوئیں، تو اس چوک میں کوئی دس لاکھ آدمیوں کی ریلی ہوئی تھی جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ اس جارحیت کے خلاف ہم پاکستان کے دوش بدوش لڑنے کو تیار ہیں۔ ملکی اور بھاری صنعتوں کی نمائش گاہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ اس کے ہال کو جو شخص ایک بار

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

دیکھ لے وہ اس کی رفعت اور وسعت کو نہیں بھول سکتا۔ بڑے بڑے ستونوں کے برآمدے سے گزر کر اندر جائیں، تو سامنے ایک مہیب نیم قوس میں کہکشاں کی صورت ہال کا چہرہ جھم جھماتا نظر آتا ہے اس کے کئی خانے ہیں جن میں صنعتی مشینیں رکھی ہیں۔ افسوس ہم میں انجینئر کوئی نہ تھا۔ ہاں ایک خورد بین میں سب نے دلچسپی لی جو کسی چیز کو دو لاکھ گنا بڑا کر کے دکھا سکتی ہے۔ جاننے والے کہتے ہیں کہ ایسا لنز تیار کرنا معمولی بات نہیں۔

لوہسون کہ چین کا گورکی کہلاتا ہے، پیدا تو ہانگچو میں ہوا تھا لیکن رہا زیادہ تر شنگھائی میں، یہیں اس کا مکان تھا۔ اوائل جوانی میں یہ بھاگ کر جاپان چلا گیا تھا واپس آ کر

صحافت اور درس و تدریس میں مشغول ہو گیا اور نوجوانوں کی ذہنی تربیت کی طرف توجہ کی۔ یہ آزادی اور آزادئ رائے کا متوالا تھا۔ لہٰذا کومن تانگ کے جبر و تشدد کا شکار رہا۔ اس کی کہانیاں اردو میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں جن میں سب سے مشہور 'آہ کیو کی کہانی' ہے۔ تمنائی نے زندہ چین کے نام سے نئے چین کی کہانیوں کا جو مجموعہ شائع کیا تھا، اس میں تین کہانیاں لوہسون کی ہیں۔ اتفاق سے یہ مجموعہ ہمارے پاس تھا۔ جب ہم نے لوہسون کے میوزیم میں دیکھا کہ دنیا بھر کی زبانوں میں چھپے ہوئے لوہسون کے تراجم کے مجموعے وہاں رکھے ہیں، تو اردو کی نمائندگی کے لیے یہ بھی اس میوزیم کو نذر کیا۔

لوہسون میوزیم کے مختلف شعبوں میں لوہسون کی زندگی کے مختلف ادوار دکھائے گئے ہیں۔ اس کی تحریریں بھی ہیں تصویریں بھی۔ اس کے جوتے، کپڑے، چھڑی ٹوپی وغیرہ سبھی موجود ہیں۔ چیزوں سے زیادہ ان کے رکھنے کا سلیقہ دیکھنے کا تھا۔ ہم نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اگر ہمارا اسی طرح کا میوزیم بنا دیا جائے، تو ہم مرنے کو تیار ہیں۔ ایک دل جلے بولے تم نے کیا ہی کیا ہے؟ اور میوزیم بنانا ہے تو اقبال کا کیوں نہ بنایا جائے۔ "تم بڑے ہو یا اقبال؟" ہماری ذاتی رائے اس باب میں کچھ بھی ہو، اس وقت ہم خوف فساد خلق سے خاموش ہی رہے۔

کرنا تجویز ٹوسٹ کا

اردو میں کہتے ہیں جام صحت نوش کرنا۔ انگریزی میں کہتے ہیں ٹوسٹ تجویز کرنا۔ جام صحت کی مثال ہم نے یہ دیکھی کہ ہمارے ایک دوست بہت دن ہسپتال میں رہ کر آئے، تو ہم ان سے ملنے گئے۔ دیکھا کہ ایک طرف سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی۔ ایک پیگ ہمارے سامنے خالی کیا، دوسرا بھرا۔ ہم نے کہا عزیز من یہ کیا حرکات ہیں، بولے بیماری سے اٹھ کے آیا ہوں، جام صحت نوش کر رہا ہوں۔ دوسرے روز معلوم ہوا کہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

رہ پابدست دگرے دست بدست دگرے ہسپتال
، پہنچا دیے گئے۔ ان کی بیماری کا باعث ہی
صحت حد سے زیادہ نوش کرنا تھا۔ حق مغفرت کرے
ب آزادمرد ہیں (زندہ ہیں)

ٹوسٹ تجویز کرنا مغربی رسم ہے۔ جب پہلی بار
رے سامنے ایک دعوت میں کسی نے کھڑے ہو کر کہا
۔ میں ٹوسٹ تجویز کر رہا ہوں، تو ہم نے میز پر نظر
ڑائی اور سب کچھ تھا ایک ٹوسٹ ہی نہیں تھے۔ ہم
ے فوراً بیرے کو اشارہ کیا لیکن ایک تجربہ کار شخص نے
ں روک لیا کہ ہوش کی دوا کرو۔ خیر چین جانے تک
خود تجربہ کار ہو چکے تھے۔ وہاں کی دعوتیں ایسی مکلف
تی تھیں کہ کئی بار ہم نے اپنے چٹکی لی اور ساتھیوں
ے پوچھا کہ ہم نواب واجد علی شاہ تو نہیں ہیں؟
حوں پر قدے اور قابوں پر قابیں آ رہی ہیں۔ ہم نے
ازہ کیا کہ اگر کھانے والا تمام کھانوں کے ساتھ عدل
انگیری برتے اور ذرا آہستہ کھائے تو لنچ کے ڈانڈے
ے اور ڈنر کے ناشتے سے بخوبی ملا سکتے ہیں۔ ہم تو
پیٹ کے ہلکے ہیں، زیادہ کھانا تو کیا، بات تک ہضم
ں کر سکتے۔ لیکن ہمارے ایک رفیق نے چینیوں کا
نج قبول کیا اور ان کو چاروں خانے چت کیا۔ قابیں
ری آتی تھیں اور خالی چمکتی ہوئی اٹھتی تھیں۔ یہی
احب تو تھے کہ دن میں پانچوں وقت کے کھانے کے
اوہ تہجد کا ناشتا بھی کیا کرتے تھے یعنی آدھی رات کو اٹھ
ر چند انڈے ٹوسٹ پھل وغیرہ زہر مار کرتے تھے۔

ٹوسٹ میں یوں ہوتا ہے کہ ایک شخص گلاس اٹھا کر
ی چوڑی تقریر کرتا ہے، اس موقع پر ہمیں اقوام متحدہ کی
ک دعوت یاد آ گئی جس میں امریکی مندوب نے روسی
مندوب کے سامنے ٹوسٹ تجویز کرتے ہوئے کہا کہ

امریکا اور روس بھائی بھائی ہیں ان کی دوستی مخلصانہ اور گہری ہے لیکن اگر روس کی طرف سے کوئی ایسی ویسی حرکت ہوئی تو ہم ہائیڈروجن بم کے استعمال میں تامل نہیں کریں گے۔ روسی نمائندے نے اپنے جوابی ٹوسٹ میں اسی طرح کے خیرسگالی کے جذبات کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم بھی امریکا کو اپنا ایک گہرا مخلص اور بے ریا دوست جانتے ہیں لیکن اس کو اپنی طاقت کے بارے میں کسی دھوکے میں نہ رہنا چاہیے۔ اس نے ایٹم بم وغیرہ استعمال کرنے کی کوشش کی، تو ہم میزائلوں سے اس کا بھُرکس نکال دیں گے۔ خیر یہ مثال تو یونہی یاد آ گئی۔ کہنا یہ تھا کہ ٹوسٹ میں باہمی خیرسگالی کے جذبات کے بعد لوگ اپنے جام ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے ہیں اور پھر نوش کرتے ہیں۔ عام طور پر تو جرعہ جرعہ نوش کیا جاتا ہے لیکن چین میں جب میزبان یا ٹوسٹ تجویز کرنے والا انتہائے اخلاص میں 'کیمپے' کا نعرہ بلند کرتا ہے، تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ تمام تر حلق میں انڈیل جاؤ، جام ٹکرانے میں خاصی احتیاط درکار ہوتی ہے۔ ہم نے ایک بار میزبان کا جام زور کی ٹکر مار کر میز پر گرا دیا تھا۔ اور ایک بار خود اپنا گلاس توڑ لیا تھا۔ لوگ تو چھوٹے چھوٹے جام استعمال کرتے تھے لیکن ہمیں گلاس کے بغیر تسکین نہ ہوتی تھی جس کی وجہ بلانوشی نہیں بے توفیقی تھی۔ ہم شراب کی بجائے سنگترے کا رس پیتے تھے اور چونکہ ہر کیمپے کے بعد گلاس خالی کرنا ہوتا تھا لہٰذا جتنا سنگترہ ہم نے چین میں نوش کیا ہے عمر بھر نہ کیا ہوگا۔

کراچی واپس آنے کے چند دن بعد ہمیں اپنا خون کا گروپ معلوم کرنے کے لیے بلڈ ٹیسٹ کرانا پڑا، تو ہمارے دوست ڈاکٹر اکرم نے لیبارٹری سے واپس آ کر کہا کہ فی الحال تو آپ کے سنگترے کے رس کا گروپ بتا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سکتا ہوں۔ چند دن بعد جب آپ کی رگوں میں خون کی گنجائش پیدا ہوگی تو دوبارہ تشریف لائیے گا۔

شنگھائی کے ہوٹل میں ایک روز ہمارے دوست ڈاکٹر وحید قریشی پر ایک حادثہ گزر گیا۔ بیرے نے مینو پیش کیا تو ڈاکٹر صاحب نے جو مچھلی کھانے کے موڈ میں تھے۔ جیلی فش پسند کی یہ ایک لجلجا سا سمندری جانور ہوتا ہے۔ لہٰذا جیلی معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک دو لقمے کھائے تھے کہ ہمارے مخدوم پیر حسام الدین راشدی نے ذکر چھیڑ دیا کہ ہمارے ہاں خواہ مخواہ سانپ کے خلاف تعصب پایا جاتا ہے حالانکہ اس کے کھانے والوں کو جوڑوں کا درد کبھی نہیں ہوتا اور موٹاپا کم کرنے کے لیے بھی مفید ہے۔ ہاں ذائقے کا معلوم نہیں کیسا ہوتا ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا، کیوں ڈاکٹر صاحب آپ تو کھا رہے ہیں کیسا ذائقہ ہے اس کا؟'' ڈاکٹر صاحب یک لخت رک گئے اور کہا ''یہ سانپ ہے کیا؟ جی نہیں! یہ تو مچھلی ہے۔'' ہم سے گواہی لی گئی تو ہم نے وضاحت کی کہ ہر چند یہ مچھلی نہیں، سمندری سانپ ہی ہے لیکن اس کے کھانے میں مضائقہ نہیں۔ چینی اسے بہت اشتیاق سے کھاتے ہیں اس لیے متعدد بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔'' اب انھوں نے غور سے پلیٹ کو دیکھا، تو کھانے کی شکل دیکھ کر خود بھی گھبرائے کہ یہ لجلجی سی چیز ہے مشتبہ۔ پیر صاحب نے کہا، ڈاکٹر صاحب آپ تو تعلیم یافتہ آدمی ہیں، کیوں ایسے وہموں میں پڑتے ہیں اور یوں بھی خدانخواستہ یہ ایسا جانور تو نہیں کہ ممنوع ہو یا مضر ہو۔ ہانگ کانگ میں تو چینی لوگ آپ کے سامنے زندہ سانپ کاٹ کر اس کے

ہمارے ایک دوست ہم سے کچھ پہلے اپنی بیگم کے ہمراہ چین تشریف لے گئے تھے۔ ان کی آؤ بھگت ہم سے کچھ زیادہ ہی ہوئی۔ لہٰذا ٹوسٹ تجویز کرتے کرتے ہلکان ہو گئے۔ رسم کے تقاضے سے کبھی ان کی بیگم کو بھی یہ فرض ادا کرنا ہوتا تھا۔ ان کی بیگم ان رسمیات کو جانتی تو ہیں لیکن ان کی قائل نہیں۔ ان کے ساتھ ایک نستعلیق اُردو مترجم بھی ہوتا تھا۔ لیکن جب کبھی وہ غیر حاضر ہوتا تب ان کے ٹوسٹ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہوتے تھے۔ میاں کہتے بی بی اب تم ٹوسٹ تجویز کرو۔ ہم انگریزی میں اس کا ترجمہ کیے جاتے ہیں۔ بی بی فرماتیں ''اے نوج، یہ کیا کھڑاگ ہے مجھ سے تقریریں نہیں ہوتیں۔'' میاں اس کا ترجمہ کرتے کہ ہماری بی بی فرماتی ہیں کہ چین کی ترقی نے ان کو بہت متاثر کیا ہے اور آخر میں فتح حق کی ہوگی۔ کبھی کبھی بی بی جھلا کہ کہتیں ''میاں تمھی بولے جاؤ، مجھے تو پان کی طلب ہو رہی ہے۔ اے ہے کیسا ملک ہے جہاں پان بھی نہیں کھایا جاتا۔ انشاء اللہ، ماشاء اللہ کا قوام تک نہیں ملتا۔ ان کے میاں اس کا ترجمہ بھی فصیح انگریزی میں کرتے کہ یہاں کی عورتوں کے عزم و ہمت نے ہمیں بہت متاثر کیا ہے۔ اے ماؤں، بہنو، بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے۔'' بی بی انگریزی بھی جانتی ہیں اگرچہ بولتی نہیں، فرماتیں ''اے میاں یہ تم کیا کیا کہے جا رہے ہو؟'' اس پر وہ کہتے بی بی چپ رہو میں تمھارے دلی جذبات کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ تمھاری ظاہری گفتگو سے مجھے مطلب نہیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دوسروں کی طرف دیکھا بعضوں نے کہا یہ پیر صاحب آپ کو بنا رہے ہیں۔ یہ مچھلی ہی ہے۔ اندیشہ نہ کیجیے، کھائیے۔ ہم نے بھی یہ دیکھ کر ان کی طبیعت نے مالش کرنا شروع کر دیا ہے ان کی غلط فہمی دُور کرنے کو کہا کہ یہ نرا مذاق ہے۔ یہ مچھلی ہے شوق سے کھائیے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی طبیعت ان کے قابو سے گزر چکی تھی۔ سیدھے باتھ روم گئے اور اپنے سینے کا بار ہلکا کیا۔ اس کے بعد دو روز تک وہ صاحب فراش رہے اور کچھ نہ کھا سکے۔

شنگھائی کے پاس جو کمیون ہم نے دیکھا وہ کینٹن اور ہانکچو کے کمیونوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اس میں پانچ ہزار خاندان ہیں۔ 27 ہزار آبادی، گیارہ ہزار ان میں سے زراعت کا کام کرتے ہیں۔ کمیون کے حلقے میں پندرہ پرائمری اسکول ہیں۔ جن میں پانچ ہزار لڑکے پڑھتے ہیں۔ ایک مڈل اسکول ہے، گیارہ سو لڑکوں کا، 122 طلبا اس آبادی میں سے یونیورسٹی پڑھنے جاتے ہیں۔ زرعی رقبہ گیارہ سو ایکڑ ہے، ہمیں بتایا گیا کہ 1950ء میں فی ایکڑ پیداوار ساڑھے بائیس ٹن تھی۔ 1957ء میں اکاون ٹن ہو گئی اور 1965ء میں 103 ٹن فی ایکڑ کو پہنچ گئی۔ ایک سو نوے قسم کی سبزیاں یہاں پیدا ہوتی ہیں جو شنگھائی شہر کو مہیا کی جاتی ہیں اور اس کے لیے کمیون کی ملکیت میں ایک ٹرک ہے، 3 سائیکل رکشا اور 15 سو ریڑھیاں، یہ کمیون 1958ء میں قائم ہوا۔ آمدنی فی کس 1957ء میں 240 یوان سالانہ تھی (ایک یوان = دو روپے) 1965ء میں 382 یوان فی کس۔ یاد رہے کہ یہ فی کس آمدنی ہے فی خاندان نہیں۔ اشیائے ضرورت جیسی سستی چین میں ہیں اور کہیں نہیں۔ اس کمیون میں ایک کارخانہ چارہ کترنے کی مشینوں کا ہے اور ایک کھاد بنانے کا۔ یہ مصنوعات دوسرے کمیونوں کو بھی سپلائی ہوتی ہیں اور کمیون کی مشترکہ خوشحالی کی ضامن ہیں۔ حکومت کا اس کام میں کیا حصہ ہے؟ پانچ فی صد ٹیکس اور بس!

یہاں ہم کمیون کے گھروں میں گئے۔ چار چار گھر کا ایک دو منزلہ بلاک ہے اور اس کے ساتھ باغیچہ، پلنگ، چھپر کھٹ، میزیں کرسیاں سب اچھی قسم کی۔

نرسری پہنچے تو ننھے ننھے بچے بے تابی سے ہماری طرف لپکے۔ ترانہ گایا اور سب سے ہاتھ ملائے۔ دو تین استانیاں ان کی خبر گیری کے لیے تھیں اور چھوٹی چھوٹی کرسیاں، بنچیں جن پر تین سال، چار سال، پانچ سال کا بچہ بیٹھ سکے۔ یہاں ان کو ان کی استعداد کے مطابق کچھ حروف اور ہندسے بھی سکھائے جاتے ہیں۔ لیکن اصل تربیت عادات کی ہوتی ہے۔ صحت وصفائی کی خو ڈالی جاتی ہے۔ یہاں نہ ڈنڈا ہے، نہ چھڑی، جو استاد کی ضرورت ہی نہیں۔ بچے دن بھر کھیلتے ہیں خوش رہتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، گاتے ناچتے ہیں اور سہ پہر کو والدین کے کام سے آنے سے پہلے گھروں میں پہنچ جاتے ہیں۔ بہت سے گھروں میں بی بیوں کو ہم نے گھر پر ہی دیکھا۔ غالباً ہر روز ان کا کام پر جانا ضروری نہیں۔ معاوضہ کام کے یونٹوں کے حساب سے ملتا ہے۔

نرسری میں ہم لوگوں کو بھی انہی بچوں کے برابر انہی ننھی منی کرسیوں پر جگہ ملی۔ کوی جسیم الدین نے ایک بنگلہ گیت ان کو سنایا، کچھ گیت بچوں نے گائے اور اس کے بعد ناچ ہوا اور تو کبھی لوگ ثقہ تھے، ہاں ہم اور اعجاز بٹالوی اس ناچ میں بچوں کے ساتھ شریک ہوئے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

میں نے تو صدیقی صاحب سے یہ کہا تھا کہ میرے لیے آپ خود ہی تقریر لکھ کر دے دیجیے۔ کیونکہ ایک دفعہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک جگہ ایسی ہی الوداعی تقریب میرے لیے بھی منعقد کی گئی تھی، تو اپنی شان میں خطبۂ الوداعیہ میں نے خود

زیادہ...... جب بھی کسی شخص کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے، تو اس کا بیان اُس وقت سے شروع ہوتا ہے کہ جب اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن میں ذرا اس سے بھی پیچھے لوٹ رہا ہوں...... یعنی میں اُس وقت سے بات شروع کر رہا ہوں جب صدیقی صاحب سے میری پہلی ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی...... اس وقت تک صرف یہ سنا تھا کہ

ان کے ماتھے پر شکن آجائے تو آجائے پتلون پر نہیں آسکتی

ہارن دے کر پاس کریں

ایک اکاؤنٹس آفیسر کی رخصتی کا منظر

ڈیپارٹمنٹ میں واقعی ان کا متبادل نہ تھا

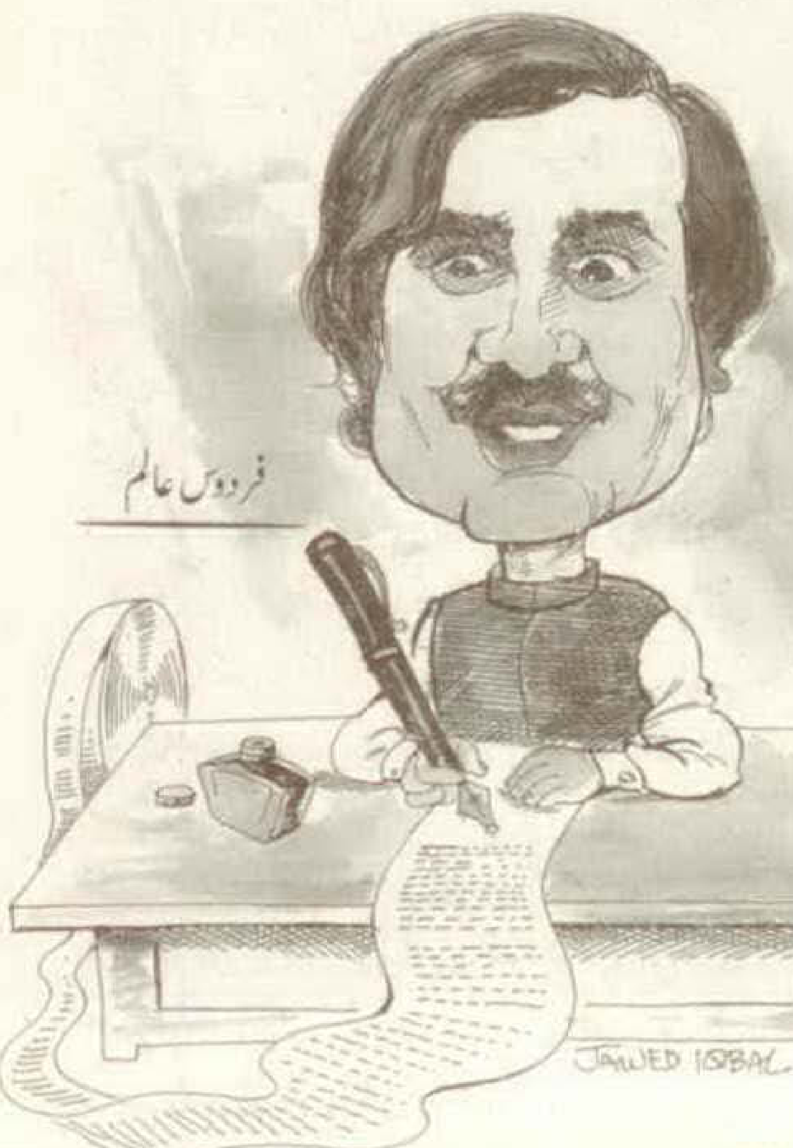

فردوس عالم

ہی لکھ کر دے دیا تھا تاکہ جی بھر کے اپنی تعریف کرا سکوں...... مگر صدیقی صاحب نے میرے تجربے سے فائدہ نہ اُٹھایا...... اس لیے یہ تقریر مجھے ہی لکھنی پڑی...... میں یہ تقریر زبانی بھی کر سکتا تھا بلکہ منہ زبانی جیسے بچے دو کا پہاڑہ سناتے ہیں مگر لکھی ہوئی تقریر کرنے کی ایک خاص وجہ ہے...... وجہ یہ ہے کہ آج ہمارا موضوع ایک ایسی شخصیت ہے جس کا تعلق آڈٹ اور اکاؤنٹس سے ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ آڈٹ کی نگاہ میں جب تک کوئی چیز ضبط تحریر میں موجود نہ ہو، تو وہ قابل یقین نہیں ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ مرنے والے سے بھی شاید یہ سرٹیفکیٹ مانگا جا سکتا ہے کہ میں تصدیق کرتا ہوں کہ میں واقعی مر چکا ہوں...... یہی وجہ ہے کہ میں یہ تقریر لکھ کر بلکہ اپنے ایک دوست کی لغت کے مطابق ''اِن رائٹنگ لکھ کر'' پیش کر رہا ہوں...... اس لیے یہ تقریر کم ہے اور میرے جذبات کا کیش میمو

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ہمارے یہاں ایک اکاؤنٹس آفیسر آنے والے ہیں...... جب مجھے یہ معلوم ہوا، تو میں نے اکاؤنٹس آفیسر صاحب کی ایک تصویر اپنے تصور میں کھینچ لی...... حالانکہ عام زندگی میں مجھے تصویر کھینچنا تو کیا...... تصویر کھچوانا بھی نہیں آتا...... اگر تصویر کھچوانا ہی پڑ جائے، تو اس کے لیے کئی ہفتے یوگا کی مشقیں کرنا پڑتی ہیں...... لیکن ہاں میں نے اکاؤنٹس آفیسر صاحب کی ایک تصویر اپنے ذہن کے کینوس پر اُتار لی...... تصویر کچھ اس طرح کی تھی...... آنکھوں پر چشمہ تو ہے مگر آنکھوں سے خفا ہو کر ناک کی طرف مائل ہو گیا ہے...... ہاتھ میں پنسل تو ہے مگر ہاتھ سے اُچھل کر کان میں جا لگی ہے۔ آنکھیں تو ہیں مگر میز پر ایسی گڑی ہیں جیسے میدانِ جنگ میں کوئی تیر زمین میں گڑ گیا ہو...... ابھی میں یہ تصویر بنا ہی رہا تھا کہ میری ملاقات اُن اکاؤنٹس آفیسر صاحب سے کرا دی گئی جن کی گراں قدر خدمات ایک ادارے سے حاصل کر لی گئی تھیں۔ یعنی آپ سے ملیے، آپ ہیں جناب صدیقی صاحب...... پورا نام...... جناب نعمت اللہ صدیقی صاحب۔

حضرات! یقین جانیے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے تصور میں جو تصویر بنائی تھی وہ تصویر تو ضرور تھی مگر وہ تصویر کا نیگیٹو (Negative) تھا اور جب صدیقی صاحب کو دیکھا، تو پازیٹیو (Positive) نظر آیا۔ ہاں واقعی...... صدیقی صاحب کی طبیعت میں نفاست اتنی کہ...... ماتھے پر شکن آجائے مگر پتلون پر شکن نہیں آسکتی...... صفائی پسند اتنے کہ شاید کوئی وکیل صفائی بھی اتنا نہ ہو...... حاضر جواب اتنے کہ اگر مغلیہ دور میں پیدا ہوتے تو اب تک کروڑ پتی ہو چکے ہوتے...... فائلوں کے ڈسپوزل میں اتنی تیز رفتاری کہ اگر ہائی وے سیفٹی والوں نے دیکھ لیا، تو فوراً بتلائیں گے...... ''یہ غلط طریقہ ہے...... صحیح طریقہ یوں ہے۔'' چہرے پر مسکراہٹ ایسی کہ جیسے ٹی وی پر کسی ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار۔ حالانکہ تمام عمر فگر ورک (Figure Work) میں گزری مگر ماشاءاللہ اپنی فگر اب بھی خوب ہے۔ محفلوں میں پہنچیں، تو جان ڈال دیں...... لطیفوں کے بادشاہ ہیں، اگر لطیفوں میں کوئی ان کا مقابلہ کرسکتا ہے، تو صرف ملّا دو پیازہ...... جب عام گفتگو ہو تو ایسی کہ شاید ہی کوئی موضوع ہو جو صدیقی صاحب کی زد میں نہ آئے...... مثلاً اگر یہ بات ہو کہ یوڈی کولون...... کون سا اچھا ہے تو صدیقی صاحب...... اگر یہ بات چل نکلے کہ ٹماٹر جمعہ بازار میں اچھے ملتے ہیں یا راجا بازار میں، تو صدیقی صاحب کی سروے رپورٹ۔ اگر یہ بات ہو کہ چائے کی پتی کون سی بہتر ہے تو صدیقی صاحب دارجلنگ سے لے کر نکاری بازار تک کا جائزہ پیش کر دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ بظاہر تو ہم باریک نظر آتے ہیں

> صدیقی صاحب کی ایک عادت مجھے بہت پسند ہے کہ وہ چائے کبھی تنہا نہیں پی سکتے...... ہمارے ایک دوست قاضی شاہد صاحب کی طرح وہ ہر روز لازمی طور پر ساڑھے دس بجے تو چائے نہیں پیتے ہاں مگر ان کے ساڑھے دس بہرحال ایک بجے سے پہلے ضرور بج جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایک بجے کے بعد چائے پلانے پر مُصر بلکہ مُضر ہوا، تو اس کو بادلِ نخواستہ قبول کرتے ہیں اور وہ بھی ایک شرط کے ساتھ کہ...... اس کے ساتھ ایک سموسہ بھی ضرور ہو...... اور چائے بھی کیا...... اگر صرف سموسہ ہو جائے، تو کیا مضائقہ بلکہ کیا ذائقہ ہے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مگر باریک بین دراصل صدیقی صاحب ہیں۔

صدیقی صاحب کی عمر مجھ پر مسلسل پوشیدہ رہی یعنی اُن کی شخصیت میں ایک جادو ہے کہ جو شخص بھی ان سے ملتا ہے ان کو اپنا ہم عمر سمجھتا ہے...... میں بھی ان کو اپنا ہم عمر سمجھتا رہا...... ان کی صحیح عمر تو اُس وقت پتا چلی کہ جب میں نے ایک روز ان کا ایک سرٹیفکیٹ بلکہ صحیح سرٹیفکیٹ اٹیسٹ (Attest) کیا تھا، بغیر فیس لیے۔ ورنہ میں تو گھبرا گیا تھا کہ پتا نہیں صدیقی صاحب کو کیا ہوگیا ہے، کون سی بیماری خدانخواستہ لاحق ہوگئی ہے کہ ان کی عمر آگے بڑھ ہی نہیں رہی ہے لیکن ہاں...... اس کی وجہ یقیناً یہی ہے کہ ان کے شوق بلکہ شوق صاحب اب بھی جواں ہیں...... ان کے ایک شوق کا جب سے مجھے علم ہوا، تو میں تو ان سے کچھ کچھ ڈرنے لگا ہوں...... اور وہ یہ کہ جمعہ کی آفٹر نون میں یہ گھر سے باہر نہیں نکلتے کیونکہ اس وقت یہ ریسلنگ چمپئن شپ میں مصروف ہوتے ہیں مگر واضح رہے...... صرف دیکھنے کی حد تک۔

صدیقی صاحب نے ہائی وے کے اکاؤنٹس میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں مگر پھر بھی انھوں نے کوئی نئی تحقیق اس شعبہ میں پیش نہیں کی جیسی ہمارے ایک اور ساتھی محترمی اور مکرمی عزیزی صاحب نے پیش کی تھی...... ایک مرتبہ عزیزی صاحب کو ایک ہائی وے پروجیکٹ کا انچارج بنا دیا گیا، تو ان کا پہلا اعتراض اس کے نام پر تھا کہ اس کے نام میں ہائی وے کیوں ہو......؟ یہ کوئی پہاڑوں پر سے نہیں گزری...... یہ تو ساری نشیبی راستوں سے گزری ہے...... ہائی وے تو قراقرم ہائی وے ہے...... ہمارا اندازہ ہے کہ اگر عزیزی صاحب بدستور ہائی وے پروجیکٹ کے انچارج ہوئے، تو صرف یہی نہیں کہ وہ اب تک بن چکی ہوتی بلکہ قوی امکان ہے کہ بن کر ٹوٹ بھی چکی ہوتی...... اس طرح کی کسی تحقیق میں صدیقی صاحب کی طرف سے تشنگی محسوس ہو رہی ہے۔

> شاید کبھی آپ نے صدیقی صاحب کو سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکالتے ہوئے دیکھا ہو۔ جب میں دیکھتا ہوں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سگریٹ اس طرح نکال رہے ہوں کہ کہیں واقعی نکل نہ آئے...... بڑی نفاست اور بڑی نزاکت سے...... اور پھر اسی نزاکت سے سگریٹ کو نذرِ آتش کرتے ہیں کہ سگریٹ آگ میں جل کر گل وگلزار ہوتا ہے۔

حضرات! اب صدیقی صاحب ہم سے رخصت ہو رہے ہیں، کراچی جا رہے ہیں...... ہم کراچی والوں پر ایک بہت بڑا احسان کر رہے ہیں...... کراچی والوں سے ہم نے کہا بھی کہ تمھارے پاس اللہ کی دی ہوئی بہت سی نعمتیں ہیں، مثلاً ہاکس بے، احمد کا حلوہ، لالوکھیت، بندو خان کے کباب اور فرزند علی کی قلفی...... لیکن ان کا کہنا تھا کہ ابھی ایک نعمت کی کمی ہے اور وہ ہے نعمت اللہ صدیقی...... ہم بادلِ نخواستہ اس نعمت سے دوری پر راضی ہوگئے...... مگر ایک پریشانی ضرور ہے کہ اب اکاؤنٹس کے محکمے سے ہمارے بل کون پاس کرائے گا۔ صدیقی صاحب کو اکاؤنٹس نے تو اپنا آدمی بنا کر بھیجا تھا لیکن وہ تو ایسے معلوم ہوئے تھے کہ جیسے ہمارے آدمی ہوں۔ لیکن حضرات......! آپ مطمئن رہیے کہ میں نے صدیقی صاحب سے محکمہ اکاؤنٹس کے نام ایک خط لکھوا لیا ہے۔ جسے میں عنقریب سائیکلو اسٹائل کرا کے تقسیم کرا دوں گا...... خط کا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

باتیں انشاء جی کی

''بس ایک بات عزت کی یہ تھی کہ پروفیسر کہلاتے تھے۔ وہ بھی کالج سے باہر۔ کالج کے کاغذوں میں ہم فقط لیکچرر یعنی بولنے والا یا مجمع لگانے والا تھے۔ وہ بھی آنریری۔ خیر پھر بھی پروفیسری عزت سادات کا ایک قرینہ تو تھی۔ بارے میں ایک روز صدر اور پریڈی سٹریٹ سے گزر ہوا اور پروفیسر کا غول کا غول نظر آیا۔ کچھ نے خیبر ہوٹل اور نور جہاں ہوٹل پر بورڈ لگا رکھے تھے اور جنات کو تابع کرتے تھے۔ لوگوں کی بگڑی بناتے اور بنی بگاڑتے تھے۔ کچھ نے خاکساری اختیار کی تھی۔ جا بجا فٹ پاتھوں پر طوطوں کے پنجرے لیے بیٹھے تھے۔ فال نکالتے تھے اور محبت، شادی، مقدمہ، روزگار اور لاعلاج بیماریوں کے مسائل حل کرتے تھے۔

لیکن تھے سب پروفیسر۔ ہمیں بہت پشیمانی ہوئی کہ جو عزت ایک طوطے کے پنجرے کی مدد سے بخوبی حاصل ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے ناحق سولہ جماعتیں پاس کیں۔ والدین کا روپیہ اور اساتذہ کا وقت ضائع کیا۔ خیر ہم تو یہ دیکھ فارغ ہوئے شتابی سے۔ ہمارے ساتھ والے اب تک اس کوچہ کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(مراسلہ: شیر زادہ، سوات)

مضمون فی الحال out کیے دیتا ہوں...... وہ یہ ہے......

محترمی! سلام مسنون...... حامل رقعۂ ہٰذا میرا بھتیجا نہیں بلکہ میرا دوست ہے۔ اس کی زندگی میں یہ وقت بھی آنا تھا کہ اس کا ایک بل آپ کے یہاں پہنچ جائے۔ کوشش کر کے اس کا یہ بل اس کی زندگی ہی میں پاس کرا دیجیے۔ اگر پاس کرانے میں کچھ دقت ہو، تو گریس مارکس دلوا دیجیے ورنہ سپلیمنٹری تو بہر حال ضروری ہے...... میں نے ایک بل ارجنٹ نیچر کا بھی بھیجا تھا...... اسے براہ مہربانی صرف پاس ہی نہ کریں بلکہ ہارن دے کر پاس کریں...... یہ پیارٹنگ نہ کر...... روکومت جانے دو......

جس طرح صدیقی صاحب ہمارے بل واپس نہیں آنے دیتے تھے اسی طرح ہم بھی ان کے لیے رکاوٹ نہیں بنتے...... جب صدیقی صاحب کے کراچی جانے کی بات ہمارے ایک دوست سے چل نکلی تو انھوں نے کہا...... ''اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ صدیقی صاحب کا متبادل تو ضرور دے گا۔'' میں نے کہا...... ''نہیں......'' کہنے لگے...... ''کیسے نہیں دے گا......'' میں نے کہا...... ''نہیں دے گا......'' مگر جب وہ میری بات پر راضی نہ ہوئے، تو پھر میں نے ان کو سمجھایا کہ محکمہ اکاؤنٹس ایک دوسرا اکاؤنٹس افسر تو ضرور دے گا...... لیکن صدیقی صاحب کا نعم البدل نہیں دے سکتا۔ صحیح بھی ہے کہ نعمت اللہ کا کوئی نعم البدل نہیں ہے اور ان کی جو خصوصیات اور خدمات ہیں ہم بھی ان کا کوئی بل نہیں دے سکتے...... سوائے یہ کہ ہم دعا کریں کہ وہ جہاں بھی رہیں، اللہ ان کو ہنستا مسکراتا رکھے۔ اور یہ بھی کہ...... ان کی زندگی کا ٹائم اس طرح پاس ہو کہ واقعی پاس ہو...... اَن پاس نہیں......

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ان کے لیے خاص جو اُردو سکھانے میں بے حد دلچسپی رکھتے ہیں

اُردو کی پہلی کتاب (جدید) کے چند سبق

ایسے سبق کبھی ابن انشاء نے پڑھے تھے اور اب یوسف ناظم نے پڑھائے ہیں۔ پڑھیے اور لطف لیجیے۔

یوسف ناظم

سبق نمبر 1

دیکھو وہ لڑکا مدرسے جا رہا ہے۔ (کتنا غمگین ہے)۔ اُس کی پیٹھ پر خاکی رنگ کا ایک بستہ ہے۔ اس بستے میں بیس عدد ایکسر سائز بکس ہیں۔ ان بیاضوں کو اُٹھائے اُٹھائے پھرنے سے اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے، جبھی تو انھیں ایکسر سائز بک کہا جاتا ہے۔ یہ سب بیاضیں سادہ ہیں۔ یہ سب ایسی ہی رہتی ہیں۔ اگلے سال کام آئیں گی۔ بستے میں کتابیں بھی ہیں۔ کتابوں میں جگہ جگہ فوٹو رکھے ہوئے ہیں۔

یہ ہیرو ہیروئنوں کے فوٹو ہیں۔ یہ بھی نصاب میں شامل ہیں۔ لڑکا ساتویں جماعت میں پڑھ رہا ہے۔ دو سال سے اسی کلاس میں ہے۔ (یہاں اس کا دل لگ گیا ہے) بستے میں کھانے کا ڈبا بھی ہے۔ اسکول پہنچتے ہی لڑکا پہلے کھانا کھائے گا اسکول پہنچتے پہنچتے اسے دو گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔ راستے میں اسے کتنے کام ہیں۔ دوستوں سے ملنا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد ہوسکتا ہے کہ کلاس میں بھی جائے۔ کھانے کے بعد اسے سگریٹ بھی تو پینی ہے۔ وہ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد سگریٹ ضرور پیتا ہے (غریب لڑکا ہے، صرف سگریٹ پیتا ہے)۔ شام میں گھر واپس ہوگا تو اس کے کپڑے پھٹے ہوں گے۔ اسے کشتی بھی تو لڑنی پڑتی ہے۔ یہ بھی نصاب میں داخل ہے۔

1۔ اس سبق میں پہلا سوال نہیں ہے۔

2۔ دوسرا بھی نہیں ہے۔

سبق نمبر 2

لو مونگ پھلی کھاؤ، بہت مزے دار ہے۔ مونگ پھلی ہوتی ہی مزے دار ہے۔ مونگ پھلی اور مونگ کی دال میں بہت فرق ہے۔ دال پکا کے کھائی جاتی ہے۔ پھلیاں بھی طرح طرح کی ہوتی ہیں جیسے گوار کی پھلی،

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بینس کی پھلی اور دو چار پھلیاں ایسی ہیں جن کے نام ہمیں اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں۔ اب سب پھلیوں کو پکا کر کھانا پڑتا ہے اور جس طرح یہ پکائی جاتی ہیں اس کے متعلق کچھ کہنا بے کار ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کون سی پھلی پکی ہے۔ یہ سب پھلیاں ترکاری ہوتی

ہیں لیکن ہماری یہ ''مونگ پھلی'' تو میوہ ہے میوہ۔ یہ الگ ہی قسم کا خشک میوہ ہے۔ اس کے کھانے سے منہ خشک ہوجاتا ہے۔ دوسری پھلیاں زمین کے اوپر پیدا ہوتی ہیں اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوسکتی ہیں، لیکن مونگ پھلی زمین کے اندر رہتی ہے اور انڈر گراؤنڈ ہی ترقی کرتی ہے (کافی سیاسی ذہن رکھتی ہے) یہ پھلی مجلد ہوتی ہے۔ اس کے اوپر جو چھلکا ہوتا ہے، بہت دبیز، کھردرا اور سخت ہوتا ہے۔ حشرت الارض اس میں داخل نہیں ہوسکتے۔ اس میں کوئی دروازہ یا کھڑکی نہیں ہے ورنہ حشرات الارض تو جیل ہو یا میل، ہر جگہ داخل ہوسکتے ہیں۔ (حشرات الارض کے معنی لغت میں دیکھ لینا اور انھیں چلتا پھرتا دیکھنا ہو تو کہیں بھی دیکھ لو)۔ اس چھلکے کے اندر مونگ پھلی کے دانے ہوتے ہیں۔ کسی میں دو دانے، کسی میں تین اور کسی میں ایک دانہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے خالی لفافہ ہو۔ اس میں خط نہ ہو۔ مونگ پھلی کے دانوں پر ایک اور جلد بہت ہی ہلکی سی چڑھی ہوتی ہے۔ اسے کھایا بھی جاسکتا ہے اور ہوا میں اڑایا بھی جاسکتا ہے۔ ٹرین میں سفر کرتے وقت یا سینما دیکھتے وقت مونگ پھلی کھاؤ تو چھلکے وہیں پھینک دو۔ وہاں نہیں پھینکو گے، تو کیا جیب میں رکھو گے۔ چھلکوں میں کافی کچرا جمع ہوجاتا ہے او اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ یہاں ہر شخص کھاتا پیتا ہے۔

گوار کی پھلی یا بینس کی پھلی اور ان پھلیوں کا، جن کے نام ہمیں یاد نہیں آرہے ہیں، تیل نہیں نکل سکتا بلکہ ان پر تو تیل خرچ کرنا پڑتا ہے۔ مونگ پھلی یہاں بھی کام آتی ہے۔ اس کا تیل نکلتا ہے اور خوب نکلتا ہے۔ اس لیے مونگ پھلی کے دانے دانے کو تیل کا کیپسول سمجھا جاتا ہے۔ (کیپسول کے معنی ہیں کیپسول)۔ اسی تیل میں ہمارا کھانا پکتا ہے۔ اسی تیل کی مٹھائی بنتی ہے اور خالص گھی کی مٹھائی کے نام سے فروخت ہوتی ہے۔ زیادہ مزے دار مٹھائی بنانی ہو تو مونگ پھلی کے تیل میں سورج مکھی کا تیل ملا دیا جاتا ہے۔ اس مٹھائی میں صرف تیل کا مزہ آتا ہے اور مٹھائی کے ذائقے کے لیے کوئی دوسری مٹھائی خرید کر کھانی پڑتی ہے۔ حلق کا علاج بھی کروانا پڑتا ہے۔

مونگ پھلی کئی طریقوں سے کھائی جاتی ہے۔ چھلکوں کے ساتھ کوئلوں پر سنکی ہوئی مونگ پھلی اچھی ہوتی ہے۔ ایک پڑیا میں آٹھ مونگ پھلیاں ہوتی ہیں۔ مونگ پھلی چھلنے سے انگلیاں کالی ہوجاتی ہیں۔ تھوڑی سی کالک ہونٹوں پر بھی لگ جاتی ہے۔ گھر جا کر انگلیاں اور ہونٹ دونوں صاف کر لینا چاہیے۔ خاص

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

طور پر ہونٹ۔ اس پُڑیا میں پانچ چھ نرم اور پانچ چھ جلی ہوئی مونگ پھلیوں کا ہونا ضروری ہے۔ آخری مونگ پھلی عموماً بدمزہ ہوتی ہے۔ ہاں، وہ ہلدی اور پانی کے نمک میں نہلائی ہوئی مونگ پھلیاں بہت شان دار ہوتی ہیں۔ یہ تل کر بکتی ہیں۔ کچھ پھلیوں میں صرف پانی ہوتا ہے اور کچھ میں صرف رنگ۔ اور ایک مونگ پھلی وہ ہوتی ہے جس کے خوب صورت پیکٹ ملتے ہیں اور اس میں مونگ پھلی کے سفید، کریم کلر کے دانے موتیوں کی طرح رکھے ہوتے ہیں۔ اس پیکٹ کے خاصے دام ادا کرنے پڑتے ہیں۔ یہ ذائقے کے نہیں خوب صورتی کے دام ہوتے ہیں۔ مونگ پھلی کھاتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم کاجو کھا رہے ہو۔

مونگ پھلی جب بھی خرید کر کھاؤ، کھانے کے بعد وہ کاغذ ضرور پڑھ لو جس میں یہ مونگ پھلی ہوتی ہے۔ ممکن ہے یہ کاغذ کسی سرکاری آفس کی فائل کا کوئی اہم ورق ہو، جس کے فائل میں نہ ہونے کہ وجہ سے کسی غریب کے وظیفے کی کارروائی رُکی پڑی ہو۔ مونگ پھلی کھانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی کو نئی نئی چیزیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔

مشق

مونگ پھلی پیدا کرنے والے لوگ بڑے آدمی بھی بن سکتے ہیں مثلاً صدر وغیرہ۔ ایک دو کے نام لکھو اور بتاؤ کہ ہمارے یہاں ایسا کیوں نہیں ہوسکتا۔

سبق نمبر3

دیکھو سڑک پر کتنی رونق ہے۔ ہزاروں لوگ جمع ہیں۔ ٹرک، گاڑیاں، موٹریں، بسیں، آدمی، سبھی رُکے ہوئے ہیں۔ کوئی آگے جا نہیں سکتا اور پیچھے بھی جا نہیں سکتا۔ پیچھے تو گاڑیوں کی کئی میل لمبی قطار ہے۔ اوہو کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں تو پتھر بھی ہیں۔ چہرے اور پتھر دونوں چمک رہے ہیں۔ وہ چلے پتھر۔ بسوں کے شیشے ٹوٹ رہے ہیں۔ بسوں اور گاڑیوں سے مسافر گرتے پڑتے اُتر رہے ہیں۔ عورتیں پسی جا رہی ہیں۔ اچھا ہوا، انھیں اب معلوم ہوا کہ آٹا کیسے پستا

ہے...... یہ راستہ روکو مہم ہے۔ اس مہم میں شہر کی سبھی انجمنیں حصہ لے رہی ہیں۔ لینا ہی چاہیے۔ دوسرا کوئی کام ہے بھی نہیں۔

لوگ اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ ضرور نیچے گریں گے۔ کیا تعجب چھت ہی بیٹھ جائے۔ ایک چھت پر کتنے لوگ سما سکتے ہیں اور ہاؤسنگ بورڈ کے بنائے ہوئے گھر کی غریب چھت کتنوں کا وزن سنبھال سکتی ہے۔ لوگ بے چارے کریں بھی کیا۔ نیچے کھڑے رہیں، تو کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ تماشا پھر کب نظر آئے گا۔ ٹی وی پر تو صرف گیت کا پروگرام ہوتا ہے۔ یوں بھی روز روز تھوڑے ہی راستہ روکا جاتا ہے۔ ترقی کا راستہ البتہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مستقل طور پر رُکا ہوا ہے۔

پتھر خانگی گاڑیوں پر بھی برس رہے ہیں۔ کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ لیکن اس میں نقصان کی کوئی بات نہیں۔ اس مہم کا فائدہ بعد میں ہوگا اور بہت ہوگا...... راستہ روکو مہم میں ہمیشہ فائدہ ہی ہوتا ہے۔

دو گھنٹے سے راستہ رُکا ہوا ہے اور دو گھنٹے سے پتھر پھینکے جا رہے ہیں۔ اب پولیس کو آنا ہی چاہیے۔ وہ دیکھو پولیس آ رہی ہے۔ سیٹیاں بج رہی ہیں، سائرن کی آواز بھی سُنائی دے رہی ہے۔ اب مزہ آئے گا۔ پولیس یوں ہی خالی ہاتھ تھوڑے ہی چلی آئی ہے۔ پوری طرح تیار ہو کر آئی ہے۔ اس میں دو گھنٹے تو لگتے ہی ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے بھی آ سکتی تھی۔ پولیس جلد آجائے، تو مشکل یہ ہوتی ہے کہ لوگ کچھ نہیں کر پاتے۔ اتنے سارے لوگ جمع ہوں اور کچھ نہ کر پائیں تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بسوں کے نقصان کی زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے۔ اگر بسوں میں سفر کرنے کے جرمانے کی رقم میں اضافہ کر دیا جائے، تو یہ نقصان پورا ہو جاتا ہے۔ ہر سال یہی ہوتا ہے۔ راستہ روکو مہم کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں لیکن ایک چھوٹے سے سبق میں سارے فائدوں کی فہرست نہیں دی جا سکتی۔

مشق

1۔ کیا تم معاوضہ لے کر ایسی مہم میں شریک ہونا پسند کرو گے؟

2 تم نے اپنی آئندہ زندگی یعنی مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ کیا یہ کام یعنی پتھر پھینکنا تمھیں پسند ہے؟ بطور پیشہ؟

سبق نمبر 4

آج پہلی تاریخ ہے۔ کیلنڈر میں سب سے اچھی تاریخ یہی ہوتی ہے۔ آج تنخواہ ملے گی۔ کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ کم تنخواہ قابلیت کی وجہ سے ملتی ہے اور بہت زیادہ تنخواہ قسمت کی وجہ سے۔ آج بسوں اور ریلوں میں سفر کرنے والے لوگوں کی جیبیں کٹیں گی۔ (عام دنوں میں بھی کٹتی رہتی ہیں۔ اب تو گردنیں کٹنے کے

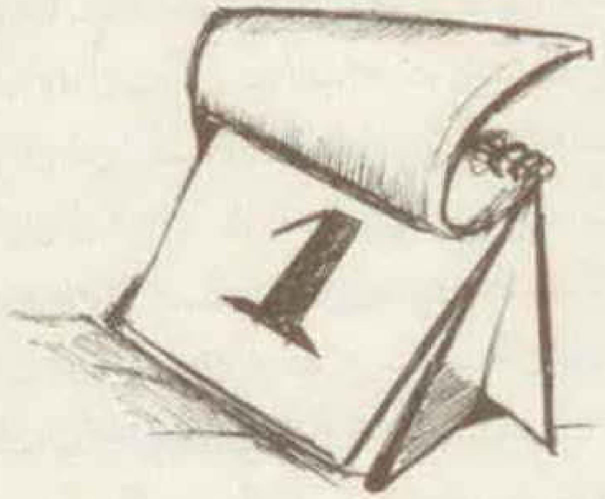

دن آگئے ہیں)۔ جو لوگ پوری تنخواہ کے ساتھ گھر پہنچیں گے۔ شام میں خرید و فروخت کے لیے باہر جائیں گے۔ خوب خریداری ہوگی۔ سینما کے ٹکٹ خوب بکیں گے۔ ہاں یہ مل جاتے ہیں۔ نہ ملیں تو لوگوں کو کتنی تکلیف ہوگی۔ آنے جانے کی تکلیف اور سینما نہ دیکھنے کا غم۔ یہ بہت ہوتا ہے۔ وہ دیکھو ہر جگہ کسی نہ کسی فلم کا پوسٹر لگا ہوا ہے۔ فلموں کے لیے جو پوسٹر ہوتے ہیں ان کے لیے کوئی سنسر بورڈ نہیں ہوتا۔ اس لیے نہیں ہوتا کہ فلموں کے سنسر بورڈ نے کون سا تیر مار لیا (تیر مارنا محاورہ ہے) برائی تو آدمی کی نظر اور اس کے بعد اس کی نیت میں ہوتی ہے۔ یہ درست ہونی چاہیے۔

مشق

1۔ آدمی کی نظر اور نیت درست ہونے کا کیا مطلب ہے؟

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سبق نمبر 5

یہ کتابوں کی دُکان ہے۔

یہاں اسکول کی کتابیں بھی ملتی ہوں گی؟

ملتی تو ہیں لیکن ابھی نہیں ملیں گی۔

اسکول تو کُھل گئے ہیں۔ کتابیں نہیں ملیں تو

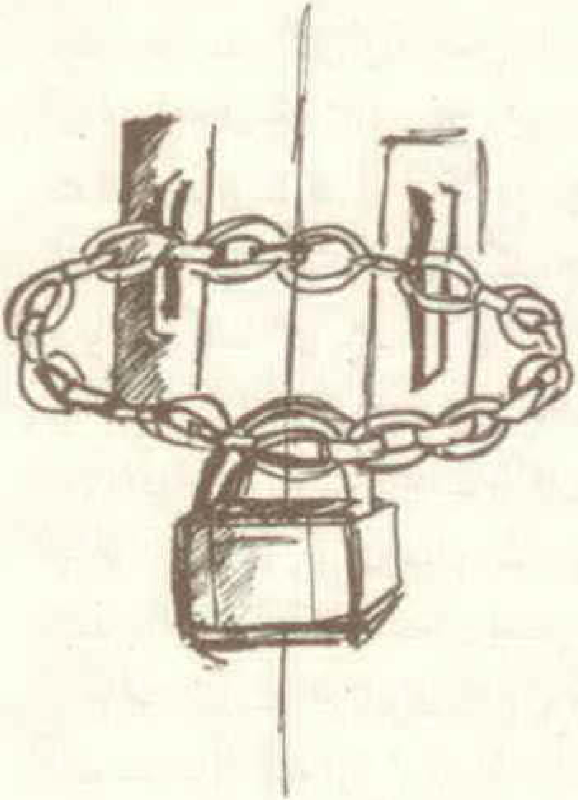

طالب علم پڑھیں گے کیا؟

اسکول کُھل گئے ہیں، تو کیا ہوا؟ ان کے بند ہونے میں ابھی آٹھ نو مہینے ہیں۔

اس وقت تک کتابیں ضرور آجائیں گی۔

اس وقت تک کیا اسکول میں پڑھائی نہیں ہوگی؟

نہیں...... کتابیں ہوتیں بھی تو پڑھائی نہیں ہوتی۔

کیوں نہیں ہوتی؟

شروع کے دنوں میں خوب بارش ہوتی ہے۔ کبھی مدرس نہیں آتے کبھی طالب علم نہیں آتے اور کبھی تو چھٹی ہی دینی پڑتی ہے۔

اور بعد میں!

اس کے بعد کے دنوں میں اسکول کا عملہ ہڑتال پر چلا جاتا ہے!

یہ عملہ کیا چیز ہے؟

عملے سے مطلب وہ لوگ جو اسکول کے دفتر میں کام کرتے ہیں۔ جیسے سپرنٹنڈنٹ، محاسب کلرک، آفس بوائے، چوکی دار وغیرہ۔ جب یہ لوگ ہڑتال سے فارغ ہو کر اسکول واپس ہوتے ہیں، تو اُستاد اسٹرائک پر چلے جاتے ہیں......!

اچھا! یہ لوگ بھی ہڑتال کرتے ہیں؟

ہاں ہاں یہ لوگ بھی کرتے ہیں۔ جب ڈاکٹر ہڑتال کر سکتے ہیں۔ انجینئر کر سکتے ہیں۔ پائلٹ کر سکتے ہیں، تو بے چارے ٹیچر کیوں نہیں کر سکتے۔ ان کی ہڑتال ذرا لمبی چلتی ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ جو کہنا چاہتے ہیں سُننے والوں کو ٹھیک سے سمجھا نہیں سکتے۔

تو کیا اس کام کے لیے بھی کوئی گائیڈ چھپی ہے؟

نہیں نہیں۔ گائیڈ تو نہیں چھپی لیکن چار چھے ہفتوں میں ان کی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

یہ تو کوئی زیادہ وقت نہیں ہوا۔ اتنا وقت تو سمجھنے کے لیے چاہیے ہی۔ اس کے بعد تو اسکول میں تعلیم شروع ہو جاتی ہوگی؟

ارے وہ کیسے شروع ہوگی؟ اسٹاف ہڑتال کرے۔ ٹیچر اسٹرائک کریں، تو غریب طالب علموں نے کیا گناہ کیا ہے کہ وہ ہڑتال نہ کریں۔ اب ان کی ہڑتال شروع ہوئی ہے!

تو پھر اسکول بند ہو جاتے ہوں گے؟

اسکول کھلے ہی کب تھے جو بند ہوں گے؟

سبق نمبر 6

تمہیں یہ انتظام کیسا لگا! سچ سچ لکھو۔

ارے یہاں یہ نئی عمارت کب بن گئی۔ دیکھو تو

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کئی پچھلے مہینے کے اندر اندر شان دار بلڈنگ کھڑی ہوگئی۔ اچھا یہ شادی خانہ ہے۔ کسی بڑے آدمی نے بنوایا ہے۔ اس محلے میں شادی خانہ تھا بھی نہیں۔ لوگوں کو شادی کرنے میں بہت تکلیف ہوتی تھی۔ بعد میں جو تکلیف ہوتی ہے وہ الگ...... اس شادی گھر میں

غسل خانہ طہارت خانہ، باورچی خانہ، سبھی کچھ موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس میں باراتوں کے ٹھہرنے کا انتظام ہے۔ ہونا ہی چاہیے۔ کبھی کبھی باراتیں باہر سے بھی آتی ہیں اور یہی اچھی بھی معلوم ہوتی ہیں (مقامی دولھے بالکل مقامی شاعروں کی طرح ہوتے ہیں)۔ ٹھہرنے کا انتظام ہو تو شادی دل کھول کر ہو سکتی ہے۔ جتنے دن چاہو، رہو۔ پکاؤ، کھاؤ۔ لاؤڈ اسپیکر بھی لگے ہوئے ہیں۔ بچوں کا اسکول بھی سامنے ہی ہے۔ دن بھر لاؤڈ اسپیکر پر ریکارڈ بجیں گے، تو اسکول کے بچوں کو بھی مزہ آئے گا۔ وہ پابندی سے وقت پر اسکول آئیں گے۔ کوئی ناغہ نہیں کرے گا۔ ہر مدرسے کے قریب ایک ایسا شادی خانہ ہونا چاہیے تاکہ بچوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ شادی کیا چیز ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے۔ انھیں بھی آگے چل کر اور کرنا بھی کیا ہے، بس یہی شادی۔ کام وغیرہ جب ملے گا، دیکھا جائے گا۔ لاؤڈ اسپیکر پر ریکارڈ بجیں تو ان کی پڑھائی میں کوئی ہرج نہیں ہوتا۔ دو چار گھنٹے گانے سُن لینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ فلمی گانے اچھے ہی ہوتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو اسی عمر میں یہ گانے یاد ہونے چاہییں۔

کیا کہا آپ نے؟ کیا کسی مدرس نے ریکارڈ بجانے پر اعتراض کیا تھا اور اسے اس بات پر مارا پیٹا گیا تھا۔ اس نے اعتراض ہی کیوں کیا تھا۔ تعجب ہے وہ بچ کیسے گیا؟ شادی کے موقع پر باراتی ریکارڈ نہیں تو کیا بغلیں بجائیں گے۔ مدرس نے ادھر اُدھر شکایت کی تو کسی نے سُنا ہی نہیں...... جی یہی فرمایا نا آپ نے؟ ظاہر ہے ایسی مہمل شکایت بھلا کون سنے گا؟ جب یہاں شادی ہو رہی ہو تو چھٹی دے دینی چاہیے! لیکن شادیاں تو یہاں ہمیشہ ہی ہوتی رہیں گی۔ تو کیا ہوا اسکول بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو سکتا ہے۔

مشق

1۔ تمھیں کون کون سے گانے یاد ہیں؟

2۔ فلمی گانوں میں مکھڑا ہوتا ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

یہ تیرے "پُراسرار" بندے

خدا کے گھر میں خدا کے بندوں کو تنگ کرنے والے خودساختہ محتسبوں کا ماجرا

ناصر محمود ملک

صاحب! ہم تو ٹھہرے گنہگار، دنیادار انسان۔ عبادات کی اہمیت و فرضیت معلوم ہےلیکن عمل مفقود! وجہ تساہل پسندی، کاہلی۔ حضرت غالب ہماری کیا عمدہ ترجمانی کر گئے ہیں!!

؎ جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی !

لیکن جب ہم تھوڑا غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسجد سے دوری کی واحد وجہ ہماری [illegible] سُستی ہی نہیں ہے بلکہ کچھ ایسی "مہربان" ہستیاں بھی ہیں جن کے ساتھ ہمیں گاہے گاہے پالا پڑتا رہا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں انہی "کرم فرماؤں" اور ان کی "نوازشوں" کا تذکرہ ہے۔

سب سے پہلے ہمارے محلے کی مسجد کے ایک محترم بزرگ کو ہی لیجیے! یہ اپنے دائیں بائیں کھڑے نمازیوں کو دورانِ نماز اپنے انتہائی قریب کرنے کے شوقین ہیں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے،لیکن اپنے اس شوق کے لیے وہ جس جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور وہ بھی بیچ نماز کے! کوئی ضعیف العقیدہ اور نحیف الجسم انسان اس کا

ان "مہربان ہستیوں" کا تذکرہ جن کے دم قدم سے مساجد کی رونق "داؤ" پہ لگی رہتی ہے
دیکھیے! کل آپ کہاں کھڑے ہوتے ہیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہ صاحب ہمیشہ ''دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچے'' پر تلے دکھائی دیتے ہیں۔ قبلہ گاہی ہمیشہ اپنے گرد اور خصوصاً دائیں طرف کھڑے نمازی کو، بھلے وہ بے چارہ کتنا ہی قریب کیوں نہ کھڑا ہو، کھینچ کر اپنے ساتھ ملانا چاہتے ہیں اور یہی ان کا اصل ''مشن'' ہے۔ سچ پوچھیے تو اسی مشن کی تکمیل ہی ان کی اصل نماز ہے۔ طریقہ بڑا سادہ سا ہے کہ دائیں طرف کھڑے نمازی کی قمیص، شلوار، پینٹ، ران (جو بھی فوری ہاتھ لگے) کو پکڑنا اور ایک جھٹکے سے اپنے قریب کھینچ لینا۔ ہمارے ساتھ یہ ''جھٹکا'' چونکہ آئے دن ہوتا رہتا ہے اس لئے ہم اسکی تفصیلات ومضمرات سے بخوبی و''مضروبی'' واقف ہیں۔ ہماری حتی الوسع کوشش ہوتی ہے کہ نماز میں ان صاحب کا ساتھ میسّر نہ آئے۔ لیکن بُرا ہو اس ضعفِ دماغ کا کہ عین وقت پر بھول جاتے ہیں اور اکثر انہی کے ساتھ کھڑے پائے جاتے ہیں۔ بس پھر کیا ہوتا ہے! ادھر امام صاحب نے تکبیر اولیٰ کہی۔ ان صاحب نے نماز شروع کی اور پھر لاشعوری طور پر اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور ہماری قمیص یا شلوار کو کھینچنا شروع کیا۔ اس دوران میں اس کھینچا تانی سے بچنے کے لیے ہم اپنے آپ کو ان کے انتہائی قریب کرتے ہوئے اپنا بایاں پاؤں، جو ان کے پاؤں سے پہلے ہی ملا ہوتا ہے، کو اور بھی ساتھ ملا دیتے ہیں۔ یہ گویا اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ''صاحب!! میں آپ کے انتہائی قریب کھڑا ہوں اور مزید قربت، کم از کم نماز میں ممکن نہیں ہے''۔ لیکن اُن کی تسلی نہیں ہوتی اور کھینچا تانی جاری رہتی ہے۔ اس ساری مشق کا سب سے اذیت ناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ شلوار وغیرہ کا گھیرا چونکہ بڑا ہوتا ہے لہٰذا اس کے کھینچنے سے 'مدعا' پورا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اُن کا اگلا اور حتمی ٹارگٹ ہماری 'ران' ہوتی ہے۔ وہ بظاہر بوڑھے اور کمزور ہاتھ کی بڑی سی چٹکی سے ران کو پکڑ کر کھینچتے ہیں اور ہم اُن کے ساتھ لگتے بلکہ ٹکرا جاتے ہیں اور انہیں سکون آجاتا ہے۔ نجانے اس نحیف ہاتھ کی مُڑی تڑی انگلیوں میں اتنی طاقت کہاں سے آجاتی ہے کہ ہمیں وہ چٹکی ''پلاس'' کی سی لگتی ہے۔ چٹکی جب ران کو پکڑ رہی ہوتی ہے تو اس خاص لمحے ران کے ''مقامِ اذیت'' پر اک تھرتھری اور کپکپی طاری ہو جاتی ہے! جیسے کمہار کے گدھے کی کمر کا وہ حصہ تھرتھراتا ہے جس پر ''سوٹا'' پڑنے والا ہوتا ہے۔ اندریں حالات ہم مکمل ''سرنڈر'' کرتے ہوئے ٹانگ ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں اور بابا جی کو دل ہی دل میں مخاطب کر کے کہتے ہیں..... ''پلیز! فنش اٹ''

کچھ حضرات کو چھوٹے بچوں کے مسجد میں آنے سے سخت چڑ ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بچے اگر ان کے قریب کھڑے ہوں تو ان کے خشوع وخضوع میں خلل آتا ہے۔ بلاشبہ انتہائی چھوٹے بچوں کو مسجد میں لانے پہ احتیاط ضروری ہے۔ اور بچوں کو شفقت وپیار سے سمجھانا بھی چاہیے۔ مگر دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ لوگ بے جا سختی کرتے ہیں!! چنانچہ جماعت کھڑی ہونے سے پہلے وہ بچوں کو سختی سے پکڑ پکڑ کر دھکیل رہے ہوتے ہیں۔ ایسے میں ان کا عموماً ٹارگٹ بچوں کی نازک گردن ہوتا ہے۔ بخدا جب بھی ہم یہ ''پکڑن پکڑائی'' دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنا بچپن یاد آجاتا ہے۔ تب ہماری گردن بھی اکثر نشانے پر ہوتی تھی۔ اب اگرچہ انگلیوں کے نشان تو شاید موجود نہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ہوں لیکن جب بھی ایسا منظر دیکھتے ہیں تو آج بھی وہ شکنجہ نُما گرفت گردن پر محسوس ہوتی ہے۔ مسجد میں ان ''بچہ بیزار'' صاحبان سے کوئی پوچھے کہ ہمارے آقا و مولا نبی رحمت ﷺ نے تو بچوں کی خاطر اپنے سجدے طویل فرمادیے اور خطبہ جُمعہ کے دوران بھی بچوں سے اظہارِ محبت فرمایا تو بھئی! آپ کی بیزاری اور نماز میں خلل کے بہانے کا کیا جواز بنتا ہے؟

دورانِ نماز موبائل فون بند رہنے چاہئیں اور نماز میں موبائل فون کی آواز کسی کو بھی اچھی نہیں لگتی، لیکن آپ کے مشاہدے میں آیا ہوگا کہ کچھ لوگوں کے لیے یہ زندگی موت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اب اگر غلطی سے کسی بیچارے نمازی کا فون ''آن'' رہ گیا اور اُس کی گھنٹی بجی تو گویا اس کی اپنی ''گھنٹی'' بج گئی۔ ادھر نماز ختم ہوئی ادھر اس کی کلاس شروع ہوگئی۔ ہماری مسجد میں بھی 3/4 صاحبان پر مشتمل یہ ''اینٹی موبائل سکواڈ'' موجود ہے۔ ماشاءاللہ سے سبھی ستر کے پیٹے میں ہیں لیکن مجال ہے کہ ''ثقلِ سماعت'' انہیں چھو کر بھی گذری ہو۔ دورانِ نماز دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر، پورے خشوع و خضوع اور انتہائی انہماک کے ساتھ موبائل فون کی بیل پر کان دھرے رکھتے ہیں۔ ''دامِ شنیدن'' پوری مسجد میں پھیلایا ہوتا ہے۔ مجال ہے کہ معمولی سی "Misbell" بھی ان کی سماعت سے بچ سکے۔ ادھر کسی سے یہ ''جُرم'' سرزد ہوا اُدھر اُس کی شامت آگئی۔ سلام پھیرتے ہی ''توپوں'' کا رُخ اُس ''کم نصیب'' کی طرف ہو جاتا ہے۔ پھر اس ''گستاخ'' کی تادیب میں ایک سے بڑھ کر ایک جُملہ سننے کو ملتا۔ ''فرمودات'' جس روانی، بیساختگی اور حسنِ ترتیب سے اُن کے منہ سے نکلتے ہیں اس سے لگتا ہے کہ اُن کے لیے باقاعدہ

عطر کی شیشی لگایئے

اس عطر میں اور بھی خوبیاں ہوں گی لیکن ہمارے نزدیک اس کے تین خصائص ایسے تھے جو اسے دوسرے عطریات سے ممتاز کرتے تھے اور آج تک ہمیں کسی اور میں نہیں مل سکے۔ ایک تو یہ انتہائی بدبودار تھا۔ دوسرے انتہائی تیز! کسی منہ پھٹ، بدتمیز مراثی کی طرح جسے اک ذرا چھیڑیے تو اس کی آواز دوسرے محلّے بھی سنائی دے۔ تیسرے اس کا اثر بے حد دیرپا تھا۔ ان ''خصائص'' پر مستزاد مولانا صاحب کا وہ اہتمام و انصرام تھا جس کا مظاہرہ وہ عطر لگاتے وقت کرتے تھے۔ انہی دنوں ہم بھی کہیں مسجد میں داخل ہوئے۔ مولوی صاحب نے ''عطرِ کم یاب'' کی سلائی بھری، ہمارے دائیں ہاتھ کی پُشت پر لگائی اور اُسے ایک جھٹکے میں مروڑتے ہوئے پیچھے سینے کی طرف لے کر آئے۔ ہماری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ تند و تلخ بُو کا ایک بھبکا ہمارے نتھنوں سے ٹکرایا، سانس رُکنے لگا۔ انہوں نے حسبِ عادت تحسین طلب کی۔ شومئی قسمت! ہم مُسکرائے اور مروتاً مُنہ سے نکل گیا کہ کیا کمال شے ہے! صاحب نے اسے داد سمجھا۔ چنانچہ اس کے بعد ہم ان کے ''التفات'' کے خاص حقدار ٹھہرے۔ اب ہر جمعے کو آنکھ مچولی کا کھیل ہوتا! ہم اُن سے چھپتے لیکن وہ کہیں نا کہیں ہمیں ڈھونڈ نکالتے۔ پھر وہی عطر کی دو سلائیاں، ہماری ''مونا لیزی'' مسکراہٹ اور سانس و آواز بند۔ بچے بالکے اُن کے پیچھے ہوتے کہ ہمیں بھی عطر لگائیں لیکن وہ اُن سے بچتے۔ کوئی بچہ اگر اپنا ہاتھ آگے کرتا تو وہ کہتے ''ابے! چل ہٹ! تُو عطر لگائے گا!!! بندر کیا جانے ادرک کا سواد''۔ ہمیں چونکہ وہ متذکرہ جانور سے بہر طور بہتر خیال کرتے لہٰذا ''عطر نوازی'' میں ہمارا خاص حصہ تھا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تیاری کی گئی ہے۔ گویا دورانِ نماز ہی ان ''ارشادات'' کی نوک پلک سنواری جاتی اور اس کی ''ریہرسل'' کی جاتی ہے۔ اس ''گل افشانی'' کے دوران ''چیف آف سکواڈ'' اگر سانس لینے کے لئے رُکیں تو اُن کا "2 IC" (2nd In Command) لقمہ دینے کو موجود ہوتا ہے۔ مسجد چونکہ برلب سڑک ہے۔ اس لیے ان صاحبان کو آئے دن کوئی تازہ ''شکار'' ملتا رہتا ہے اور ہم ان کی 'زبان دانی' سے مُستفید ہوتے رہتے ہیں۔

ایک روز عجب واقعہ ہوا کہ نماز کے دوران جس موبائل فون کی گھنٹی بجی وہ کسی اور کا نہیں بلکہ اسی ''اینٹی موبائل گروپ'' کے چیف کا تھا۔ تو گویا ''صیاد'' خود زیرِ دام آ گیا تھا۔ بڑا اطمینان ہوا کہ چلو آج حضرت خود ہی اپنی ''کلاس'' لیں گے۔ سلام پھیرتے ہی حسبِ معمول کلاس تو انہوں نے ضرور لی، لیکن اس بار ''روئے سخن'' اس ''گستاخ'' کی طرف تھا جس نے جانتے بوجھتے اوقاتِ نماز میں انہیں کال کرنے کی جسارت کی تھی۔ فرما رہے تھے، ''کیسے ''بے حیا'' لوگ ہیں کہ نماز بھی سکون سے نہیں پڑھنے دیتے۔ اب کے لگے ہاتھوں انھوں نے اس ''بے فضول'' ایجاد کے بدتمیز موجد کی بھی خبر لی جس کی اس ''خبیث'' ایجاد یعنی موبائل فون کے فائدے تو تھے لیکن اس کے نقصانات کہیں زیادہ تھے۔

ڈکار کی قربتِ خاص

ایک دفعہ اندرونِ لاہور محلّے کی کسی مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھنے کا موقعہ ملا۔ پہلی صف میں ہمارے دائیں طرف ایک ادھیڑ عُمر باریش شخص براجمان تھے۔ نماز شروع کی تو اُن صاحب نے ڈکارنا شروع کر دیا۔ انداز بہت زوردار اور دھماکہ خیز تھا!! اپنے تسلسل اور طنطنے کے اعتبار سے یہ اپنی نوعیت کے عجیب ڈکار تھے۔ ان کی آواز و اثرات نے پوری مسجد کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ معمولی قوتِ شامہ والا بھی بتا سکتا تھا کہ موصوف نے لنچ میں کیا نوشِ جاں کیا ہے۔ ہمیں چونکہ ''قربتِ خاص'' میسّر تھی لہٰذا ہمیں حضرت کی گذشتہ دو تین دنوں کی ''دستر خوانی مصروفیات'' سے بلا واسطہ آگاہی ہو رہی تھی۔ نماز میں ہمارے ''خشوع و خضوع'' کا حال ویسے ہی پتلا ہے اس پر مستزاد پڑوس میں ہونے والی یہ مسلسل ''گھن گرج'' تھی۔ چناں چہ ذہن سے باقی ماندہ دھیان بھی جاتا رہا اور ہم پورے انہماک اور یکسوئی سے اُن ''مساعیٔ جمیلہ'' کا جائزہ لینے لگے جن کا مظاہرہ ہمارے دائیں طرف جاری تھا۔

ڈکاروں کی دھن دھناہٹ ''آمد'' کی بجائے ''آورد'' کا شاخسانہ لگ رہی تھی۔ محترم باقاعدہ ''بوکی'' ڈالتے اور پتہ نہیں کہاں کہاں سے ڈکار ''کھینچ'' کر نکال رہے تھے۔ انہوں نے جب کوئی بیسویں بار ''بوکی'' ڈالی تو ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دورانِ نماز ہی ہم دُعا کرنے لگے کہ! ''الٰہی! اُن کی مشکل آسان کر دے یا پھر ہماری مشکل آسان کر دے (اُن سے)''۔

ہمارے ہاں ابھی بھی لوگوں کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جنھیں اگر عُمر کے ایک خاص حصے میں پہنچ کر بھی ''گیس و تبخیر'' کا عارضہ لاحق نہ ہو تو وہ اُلٹا زیادہ پریشان ہوتے ہیں اور لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں کہ 'ابا جان اور دادا حضور تو ہماری عمر میں ''باقاعدہ'' دائمی مریض بن چکے تھے۔ خدا خیر کرے! نجانے ہمارے ساتھ کیا مسئلہ ہے'۔ اور پھر جب خدا واقعی ''خیر'' کر دیتا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ہے تو وہ سکھ کا سانس لیتے ہیں۔ ہمارا قوی خیال ہے کہ ہمارے یہ "ڈکار بردار" پڑوسی بھی اسی "طبقۂ تبخیریہ" سے تعلق رکھتے تھے۔

حملہ آور عطر بابا

پھر ہمیں وہ بزرگ صورت بابا جی یاد آتے ہیں جو جامع مسجد میں نمازیوں کو 'عطر' لگایا کرتے تھے۔ یہ تذکرہ ہمارے سابقہ محلّے کا ہے جہاں ہم کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ اب سچ پوچھیے تو اس محلّے کو چھوڑنے کا سبب بھی یہی نیک سیرت مرد بزرگ ہی تھے۔ محلّے کے بیچ میں جامع مسجد واقع تھی جہاں ہم جمعہ پڑھنے کے لیےحاضر ہوتے۔ یہ بزرگ بڑی باقاعدگی سے وہاں تشریف لاتے۔ ان کے پاس ہمیشہ رنگین کڑھائی دار رومال میں لپٹی ایک چھوٹی سی عطر کی شیشی ہوتی۔ یہ صاحب مسجد کے اندرونی مرکزی دروازے پر تشریف رکھتے۔ اپنے 'چوغے' کی سینے والی اندرونی لمبی جیب سے رومال نکالتے، اس کی پرتیں بڑی احتیاط سے کھولتے، شیشی میں پلاسٹک کا "سُرمچو" ڈالتے اور اس کا اگلا کونا عطر میں ڈبو کر باہر نکالتے اور پھر آنے والے "خوش نصیب" نمازی کے دائیں ہاتھ کی پُشت پر وہ عطر لگاتے اور اُسے معطّر ہاتھ کو اپنے سینے اور ملحقہ "علاقے" پر پھیرنے کو کہتے۔ ہاتھ پھرتے ساتھ ہی 'خوشبو' کی ایک لپٹ اُٹھتی۔ اس پر وہ صاحب اس نمازی کی طرف تحسین طلب نظر سے دیکھتے۔

مذکورہ عطر سے ہمارے "فرار" کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ اس کی بدبُو تھی۔ لیکن اس سے بھی بڑا سبب یہ تھا کہ اک زمانے میں ہمارے گاؤں میں اسی "بُو" کا حال عطر مُردوں کے کفن پر لگایا جاتا تھا۔ عطر لگتے ہی پورا گاؤں ایک انتہائی ناگوار بُو کی لپیٹ میں آجاتا۔ گلیوں سے میت گزر جاتی لیکن عطر ٹھہر جاتا۔ گھنٹوں وہاں سے گزرنے والوں کو پتہ چلتا رہتا کہ یہاں سے میت گزری ہے۔ نجانے کس "خوش ذوق" نے اس کا آغاز کیا تھا، لیکن اب یہ "عطر چھڑکاؤ" کی رسم تدفین کا لازمی حصہ بن چکی تھی۔ اس رسم کا "بیک گراؤنڈ" جو بھی تھا، بہرحال اب یہ ایک کامیاب کوشش تھی کہ کوئی مُردہ کم از کم ذہنی سکون کے ساتھ قبر تک نہ پہنچے۔ قبر کا حال تو اللہ پاک کو معلوم ہے لیکن!! بظاہر اُس بیچارے مُردے کا عذاب کفن اُوڑھتے ساتھ ہی شروع ہو جاتا۔ انہی بچپن کے دنوں کی بات ہے کہ ہم ایک دوسطری وصیت لکھ کر ہمہ وقت اپنی جیب میں رکھتے کہ، "موت فوت بندے کے ساتھ ہے۔ ہماری وصیت ہے کہ بعداز وفات ہمیں یہ عطر نہ لگایا جائے"۔

اب جب وہی عطر برسوں بعد ان بابا جی کو مسجد میں لگاتے دیکھا تو ہمارا ذہنی کرب گویا دوبارہ شروع ہو

شنید ہے

اب جو ریٹائر ہوئے تو مسجد میں نمازوں کے خود ساختہ اصلاح کار بن بیٹھے۔ یہاں پر بھی حسبِ عادت وہ 'اصولی' مؤقف پر ڈٹے رہے۔ اپنے علاوہ کسی دوسرے کی نماز کو کبھی درست نہیں سمجھا۔ ان کے مطابق امام صاحب سمیت کسی کی نماز بھی کراہت سے مبرّا نہیں تھی۔ کسی نئے نمازی کے ساتھ تو بالکل "نومسلم" کی طرح سلوک کرتے ہیں۔ خود پانچ وقت بڑی پابندی سے نماز باجماعت ادا کرتے ہیں۔ شنید ہے کہ وقت کی پابندی کے ساتھ انہیں مسجد بھیجنے میں ان کے گھر والوں کا بھی عمل دخل ہے۔ یہ بھی خبر ہے کہ اوقات نماز میں ان کے گھر کا ماحول بہت پُرسکون رہتا ہے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

گیا۔ انہیں دیکھتے ہی ذہن میں ایک فلم چلنا شروع ہو جاتی،، کفن میں لپٹی میت نظر آتی اور لاشعور سے ''کلمہ شہادت'' کی آوازیں آنا شروع ہو جاتیں۔ لاچار! وہ محلہ چھوڑا تب کہیں قرار آیا۔

مساجد میں سمری ٹرائل

مساجد میں آجکل قابلِ ذکر تعداد ایسے حضرات کی بھی ہے جو آپ کے طریقۂ نماز پر تنقید کریں گے اور پھر ''سمری ٹرائل'' کرتے ہوئے فیصلہ یا فتویٰ دیں گے کہ، ''جناب! آپ کی نماز قبول نہیں ہوئی، (گویا انھوں نے خود ہی کرنا تھی) لہٰذا اپنی نماز لوٹائیے۔'' یہ اعلان کرتے ہوئے ان کا زعمِ تقویٰ اور خبطِ عظمت دیدنی ہوتا ہے۔ یا پھر فرمائیں گے کہ آپ کی نماز 'مکروہ' ہوگئی ہے۔ اور لفظ ''مکروہ'' کی ادائی کے دوران ایسی شکل بنائیں گے گویا کراہت نماز میں نہیں بلکہ آپ کی ذات میں ہے۔ یہ حضرات اکثر بھول جاتے ہیں کہ اگر اصلاح بھی مقصود ہو تو مستحسن انداز میں ہونی چاہیے۔ عزتِ نفس کا خیال رکھنا اور دلآزاری سے بچنا بھی ضروری ہے۔

ہماری مسجد میں آجکل ''سمری ٹرائل'' کی اہم سیٹ پر محترم جناب بزمی صاحب المعروف ''چاچا چکری'' براجمان ہیں۔ یہ حضرت ایک سرکاری دفتر میں کسی اہم عہدے پر تعینات رہے۔ اسی سال ریٹائر ہوئے ہیں۔ مزاج بے حد چڑچڑا پایا ہے۔ دورانِ ملازمت پرلے درجے کے بد اخلاق، مُنہ پھٹ اور انتہائی بدلحاظ مشہور تھے لیکن ''بااصول'' بھی تھے۔ حتیٰ کہ رشوت کے بھی ''اُصول'' مقرر کر رکھے تھے، یعنی جو ایک دفعہ طے ہوگئی اس سے آنہ برابر اُوپر نیچے نہیں کرتے تھے۔ حرام ہے جو گھر میں کبھی حلال آنے پایا ہو اور ساری زندگی اسی 'اصول' پر کاربند رہے۔ ان کا نام ''چکری'' پڑنے کی وجہ بھی یہ تھی کہ دفتر میں ان کا سائل اگر ان کی ''فرمائش'' پوری نہ کرتا تو اُسے دفتر کے بے تحاشا چکر لگانے پڑتے بلکہ وہ بے چارہ اس قدر پھیرے لگاتا کہ بقول قاسمی صاحب وہ خود ''بھائی پھیرو'' بن جاتا۔ لہٰذا لوگوں نے انہیں ''چاچا چکری'' کہنا شروع کر دیا۔

یہ نمازوں پہ تنقید کرنے والے حضرات پُرغرور انداز میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں اور اکثر طنز کے ساتھ! بھلے خود ہی غلط ہوں!! چند دن پہلے ہم مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ساتھ کھڑے ایک صاحب (جو بزمی ثانی کا 'مقام' رکھتے ہیں) نے بڑی عُجلت سے سلام پھیرا اور ہماری طرف تقریباً گھورتے ہوئے فرمانے لگے، ''بھئی! آپ کی نماز مکروہ ہوگئی ہے، بہتر ہے! لوٹا لیجیے''۔ آواز میں بلا کی رعونت تھی۔ صاحب! ان حضرات کے کہنے پر نمازیں لوٹاتے ہمیں اک عُمر گزر گئی ہے۔ اس دن پتا نہیں کیا ہوا، ہم نے خاطر جمع کی اور لبوں پہ ہلکی مسکراہٹ لاتے ہوئے ان صاحب کو جواب دیا، ''جناب! چھوڑیئے! ہمیں معلوم ہے کیوں مکروہ ہوئی ہے ہماری نماز''۔ فرمایا، ''کیوں؟'' عرض کیا۔ ''جناب! ہم آپ کے ساتھ جو کھڑے تھے''۔ ہم نے اتنا کہا اور اگلی نماز شروع کر دی۔

حکیم مومن خان مومنؔ کا اک شعر ایک عرصے تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اس شعر کی نوبت کیوں کر پیش آئی۔ لیکن اب سمجھ آنے لگا ہے کہ اس باکمال رومانوی شاعر کو بھی یقیناً کچھ ایسے ہی حالات پیش آئے ہوں گے، تبھی تو انہیں کہنا پڑا کہ:

کل شب جو مسجد میں جا پھنسے مومنؔ
رات کاٹی خدا خدا کر کے!! ○○○

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ذرا خبر لگوا دینا

ایک بے ضرر سی خواہش کا دلپذیر احوال
اُسے حد سے تجاوز کرتے میں ذرا دیر نہیں لگتی

عطاء الحق قاسمی

نام و نمود کی خواہش حد اعتدال میں رہے تو کچھ اتنی بُری نہیں، کیونکہ دنیا میں آج تک جتنے بڑے کام ہوئے ہیں ان کے پس پردہ یہ جذبہ بھی کافی حد تک کام کرتا رہا ہے، لیکن بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ اس جذبے کو Infection ہو جاتی ہے۔ اخبار میں کام کرنے والے لوگوں کو غالباً حشر کے دن خدا کے سامنے اس لیے بھی جواب دہ ہونا پڑے گا کہ ان کی بدولت یہ "انفیکشن" بہت بڑھ گئی ہے۔ مثلاً اگر کسی گھر میں چوری ہو گئی ہے تو سنسنی خیز قسم کے فیچر کے ساتھ اولاً اس گھر کی تصویر شائع ہو گی، جہاں چوری ہوئی، پھر اس دروازے کی تصویر لی جائے گی جدھر سے چور داخل ہوا۔ صاحب خانہ کی تصویر کی اشاعت بھی لازمی ہے۔ اس کے بیوی بچوں کی تصاویر چھپنے کے امکانات بھی کافی روشن ہوتے ہیں۔ اگر اہل محلّہ میں سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ اس نے رات کو کچھ کھڑاک بھی سنا تھا اور کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی سنی تھی تو اس اہل محلّہ کی تصویر بھی لازماً شائع ہو گی، بلکہ اگر کوئی فوٹو گرافر زیادہ مستعد ہے، تو ممکن ہے وہ ان کتوں کی تصویر بھی اپنے اخبار کو مہیا کر دے جو رات کو چوری کے وقت بھونکے تھے۔

اس کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یار لوگ اخبار میں اپنا نام اور تصویر شائع کرانے کے لیے کسی چھوٹے موٹے حادثے کی دعا مانگتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے بعض ایک دو چار سو روپے کی چوری کا بندوبست بھی خود ہی کر ڈالتے ہوں اور جو لوگ اتنے صاحب حیثیت نہ ہوں کہ یہ ڈرامہ رچا سکیں وہ تمام

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

رات، بلکہ تمام راتیں جاگ کر کسی دوسرے گھر میں چور کی آمد کا انتظار کرتے ہوں، تاکہ وہ آئے اور یہ کھڑاک سنیں اور پھر اگلے روز ان کا نام اور تصویر اس کیپشن کے ساتھ اخبار میں شائع ہو ''محمد حسین جنھوں نے کھڑاک سنا۔''

نام و نمود کی یہ ''انفیکشن'' خواص و عام ہر دو طبقوں میں موجود ہے۔ طبقہ خواص میں سے حزبِ اقتدار کے راہنمایان کی کیفیت کچھ یوں ہے کہ جس روز وزیرِ اعظم لاہور میں ہوں اور اس روز اخبارات کے دفاتر میں ان رہنماؤں کے ٹیلی فون اور بیانات خاصی کثرت سے پہنچتے ہیں۔ بیانات شائع ہونے کے لیے ہوتے ہیں اور ٹیلی فون تاکید کی خاطر کیے جاتے ہیں جس میں یہ درخواست بھی شامل ہوتی ہے آج اس کے ساتھ تصویر ضرور شائع ہونی چاہیے۔ بعض ایک تو اس خواہش کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ ٹوپی یا اچکن یا ڈبل بریسٹ والی تصویر شائع کی جائے۔ سوشل ورک کرنے والی بیگمات کے اپنے مطالبات ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک طبقہ اور بھی ہے جو ذرا سی ''سمپاتھیٹک'' صورت حال کو ایکسپلائٹ کر کے اخبار میں اپنا نام شائع کراجاتا ہے اور اس کی ''ٹائمنگ'' میں وہ کمال مہارت کا ثبوت دیتا ہے۔ مثلاً گزشتہ روز ایک صاحب اپنے کسی صحافی دوست کے ساتھ کار میں جا رہے تھے کہ ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ صحافی کو تو بالکل معمولی چوٹیں آئیں، البتہ ان کے دوست جھٹکا لگنے سے کار سے باہر جا گرے۔ وہ کراہتے ہوئے بمشکل اپنے قدموں پر کھڑے ہوئے اور جب انھیں مرہم پٹی کے لیے ہسپتال لے جایا جا رہا تھا، تو انھوں نے نیم مردہ آواز میں اپنے صحافی دوست سے کہا خبر لگوا دینا، احباب کو اطلاع ہو جائے گی۔'' ایک شاعر ہمارے پاس آئے اور بتایا کہ ان کے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے، ذرا خبر لگا دیں۔ ہم نے کہا لکھ دیجیے۔ انھوں نے کاغذ قلم سنبھالا اور لکھا ''برصغیر پاک و ہند کے ممتاز شاعر جناب انور راٹھوروی کے بڑے بھائی انتقال کر گئے''۔ ہم نے عرض کی ''کہ اے برصغیر پاک و ہند کے ممتاز شاعر! آپ کا نام اس خبر میں بجا، مگر اس سے یوں لگتا ہے جیسے آپ فوت ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اس مظلوم کا نام بھی لکھ دیں جو فوت ہوا ہے۔'' دروغ برگردنِ راوی۔

ایک صاحب نے ایک صحافی دوست سے پوری سنجیدگی سے کہا ''میں پاگل ہو گیا ہوں، ذرا خبر لگا دینا۔''

سو اس معاملے میں اب ہم اتنے ہراساں ہو گئے ہیں کہ جب ہم کسی فوٹو گرافر کو کسی میت کی تصویر اتارتے دیکھتے ہیں، تو اس تصور سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے کہ کہیں مرحوم بہتر پوز دینے کے لیے اٹھ کر نہ بیٹھ جائیں اور مسکرانا شروع کر دیں کہ آخر یہ تصویر صبح اخبار میں شائع ہونی ہے۔

●●●

الوداع

''کیا تم اسٹیشن کا مطلب صرف ریلوے اسٹیشن سمجھتے ہو۔ میں نے جس صورت حال میں یہ لفظ استعمال کیا تھا، اس کا مطلب تھا پولیس اسٹیشن۔'' افسر اعلیٰ نے دونوں چوکیداروں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! اب ہمیں معلوم ہو گیا، ورنہ جب آپ نے چور کو پکڑ کر ہمیں یہ حکم دیا کہ اسے اسٹیشن لے جاؤ تو ہم یہی سمجھے کہ آپ نے ریلوے اسٹیشن کا کہا ہے۔'' ایک چوکیدار نے کہا۔

افسر اعلیٰ نے جواب مانگا۔ ''وہ پھر کیسے فرار ہوا؟''

''جناب اس نے ہمیں خدا حافظ کہا اور ٹرین میں سوار ہو گیا۔'' دوسرے چوکیدار نے منہ بسور کر جواب دیا۔

(محبوب اقبال، لیہ)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

عبدالغفور صاحب

خوشبو میں بسے قیامت کے ان ناموں کا ذکر جنھوں نے پڑھنے والے کو ہی نہیں سننے والوں کو بھی بے چین و بے قرار کر دیا تھا

عطاء الحق قاسمی

ہم تو خیر سادھو سے آدمی ہیں ہمیں کیا پتا یہ من وتو کے سلسلے کیا ہوتے ہیں، مگر ہمارے ایک دوست بڑی مقبول شخصیت ہیں۔ اگر چہ ان کی عمر اس وقت ساٹھ برس سے تجاوز کر چکی ہے مگر اس کے نام قیامت کے نامے آتے ہیں۔ وہ خوشبو میں بسے ہوئے یہ خطوط اپنی میز پر کسی فائل کور کے اردگرد کچھ یوں رکھتے ہیں کہ ان کے نہ چاہتے ہوئے بھی نظر انھی ناموں پر پڑتی ہے۔ ہم تو چونکہ سادھو سے آدمی ہیں اس لیے ہمیں تو نہیں لیکن ان کے جو دوست صنف نازک کی تحریر پہچاننے کے ضمن میں اسپیشلسٹ واقع ہوئے ہیں۔ وہ ان سے راز دارانہ انداز میں ایک آدھ سوال کر کے سب کچھ اگلوا لیتے ہیں۔ ان لمحوں میں ہمارے اس دوست کے کان سرخ ہو جاتے ہیں چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ جاتی ہے اور یہ جھکی نظروں کے ساتھ جیب سے رومال نکال کر اس کا پلو اپنی انگلی کے گرد لپیٹنے لگتے ہیں۔ ان کا نام عبدالغفور ہے۔ یہ عبدالغفور صاحب بڑے شرمیلے ہیں! ہم نے عرض کیا نا کہ ہمارا تو یہ فیلڈ ہی نہیں،

چناں چہ عبدالغفور صاحب رقابت کے تمام خطروں سے بے نیاز ہو کر بن مانگے ہم پر مائل بہ کرم ہو جاتے ہیں۔ یعنی ہم ان سے کچھ پوچھیں وہ ہمیں خود ہی بتا دیتے ہیں کہ آج ان کے نام کتنے مہ وشوں کے نامے آئے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ از راہ کرم گاہے گاہے ان میں سے کچھ اقتباسات بھی ہمیں سناتے رہتے ہیں اور یوں ہم ایسے شریف آدمی کو گمراہ کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ دراصل ان کے نام جو خط آتے ہیں ان میں بڑے مخرب اخلاق فقرے درج ہوتے ہیں اور عبدالغفور صاحب سارے خطوں میں سے چن چن کر ہمیں یہی فقرے سناتے ہیں۔ مثلاً چلیے بیٹھے، ہم آپ سے نہیں بولتے، ہم آپ سے ناراض ہیں۔ یا آج ایک ہفتہ ہو چلا ہے، راہ دیکھتے دیکھتے میرے بال سفید ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کے اور ہمارے ایک مشترکہ دوست جو عبدالغفور صاحب کی اس مقبولیت کی وجہ سے اندر ہی اندر حسد کی آگ میں جلتے رہتے ہیں، طرح طرح کی باتیں کر کے اور بہانے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سے ان خطوط میں کیڑے ڈال کر اپنی یہ آگ ٹھنڈی کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ مثلاً وہ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ عبدالغفور صاحب کمرے میں سے جاتے ہوئے یہ خطوط واپس اپنی جیب میں رکھنا بھول گئے، تو انھوں نے جلدی جلدی یہ خط پھاڑ ڈالے، ایک خط کا متن کچھ یوں تھا۔ ''محترم عبدالغفور صاحب! میں نے آپ کو لکھا تھا کہ بانو بازار میں، میں نے دوپٹے رنگنے کو دیے ہوئے ہیں۔ ذرا زحمت کر کے کسی روز گھر چھوڑ جائیں، میں نے رسید بھیجی تھی۔ ایک دن میں آپ کو خط مل گیا ہوگا مگر آج دو روز ہو گئے ہیں، دوپٹے نہیں پہنچے۔ نواسی کی شادی میں چند روز رہ گئے ہیں! اس روز آپ بازار سے جو سبزی لے کر آئے تھے وہ بھی گلی سڑی ہوئی تھی۔ چلیے بیٹے، ہم آپ سے نہیں بولتے۔ ہم آپ سے نہیں بولتے ہم آپ سے ناراض ہیں!'' ہمارے اس حاسد دوست کے مطابق دوسرے خط کا متن یہ تھا۔ ''محترم عبدالغفور صاحب! آپ کو لکھا تھا خضاب کے دو پیکٹ ذرا جلدی بھجوا دیں۔ آج ایک ہفتہ ہو چلا ہے، راہ دیکھتے دیکھتے میرے بال سفید ہو گئے ہیں!'' اور کچھ اس قسم کی باتیں ہمارے یہ حاسد دوست باقی خطوں کے بارے میں بھی کرتے ہیں، لیکن ہمارا ایمان عبدالغفور پر ہے، وہ بزرگ آدمی ہیں، بھلا وہ کاہے کو خود پر الزام تراشی کریں گے۔

عبدالغفور صاحب کے بیان پر ایمان لانے کی وجہ صرف یہی نہیں جو ہم نے ابھی بیان کی ہے بلکہ اس کی دو وجوہ اور بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ موصوف کا ذوق جمالیات ابنائے زمانہ سے نہ صرف جداگانہ ہے بلکہ بہت صاف ستھرا اور صالح بھی ہے۔ وہ بناوٹ کو بالکل پسند نہیں کرتے، چناں چہ میک اپ کو بھی ناپسند کرتے ہیں۔ شو، شا کے پیچھے نہیں جاتے بلکہ سادگی پر مرتے ہیں۔ چناں چہ ہم نے ایک روز اپنی آنکھوں سے ان کے کمرے کی طرف ایک حور شمائل کو جاتے دیکھا جس نے پرانی طرز کا ٹوپی والا سفید برقع اوڑھا ہوا تھا اور پاؤں میں ہوائی چپل تھی۔ عبدالغفور صاحب اس کے قدموں کی چاپ پہچان کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ اس کی بہت عزت و تکریم کی، اس کے راستے میں آنکھیں بچھائیں اور جب اسے رخصت کیا، تو آنکھوں میں آنسو تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی آنکھوں کا سارا سرمہ بہ نکلا۔ اس موقع پر انھوں نے ہمیں اپنا یہ شعر بھی سنایا:

؎ وقت رخصت ہم چپ رہے عبدالغفور
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

یہ شعر سن کر خود ہماری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تاہم اس روز ان کے سارے دعوے سچے ثابت ہو گئے، کیونکہ اب تو ہماری حیثیت چشم دید گواہ کی ہو گئی تھی جب کہ ہمارے اس حاسد دوست کا کہنا تھا کہ ایسے گواہ کو چشم دید گواہ نہیں، وعدہ معاف گواہ کہتے ہیں۔

اپنے حاسد دوست کو جھٹلانے اور عبدالغفور صاحب کے بیان پر ایمان لانے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ گو یہ نامے اور سلسلے عبدالغفور صاحب کی کمزوری ہیں، مگر ان کا ضمیر اس پر خوش نہیں ہے بلکہ وہ اکثر اس کی خلش محسوس کرتے ہیں، چناں چہ ان لمحوں میں وہ اپنے تمام رومانس ایک ایک کر کے سناتے ہیں اور اس دوران کانوں کو ہاتھ لگاتے اور توبہ استغفار کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہم نے ایسے موقع پر خوف خدا کے باعث ان پر کپکپی طاری ہوتی بھی دیکھی ہے، مگر برا ہو اس حسد کا کہ ہمارے متذکرہ حاسد دوست اس مثبت پہلو میں سے بھی منفی پہلو نکال لیتے ہیں اور ایسے مواقع پر پوری بدلحاظی سے کام لیتے ہوئے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتے ہیں اور عبدالغفور صاحب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ''یہ تم گناہوں کا اقرار کر رہے ہو یا بڑ ہانک رہے ہو؟''

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

گھوڑا اور کاربوریٹر

زندگی کے مختلف شعبوں میں بروئے کار ان گھوڑوں کا دلچسپ ماجرا جو سفید رنگ کے ہونے کے باوجود اپنے اپنے کاربوریٹر سے بے خبر سمجھے جاتے ہیں

ایک سنسان سڑک پر چلتے چلتے ایک شخص کی کار خراب ہوگئی، وہ کار سے اترا اور نقص معلوم کرنے کے لیے اس نے ابھی بونٹ اٹھایا ہی تھا کہ قریب سے آواز آئی ''اس کا کاربوریٹر خراب ہے۔'' اس نے گھبرا کر آواز کی سمت دیکھا، تو ادھر صرف ایک گھوڑا کھڑا تھا۔ اس پر یہ شریف آدمی بہت پریشان ہوا۔ اس نے اپنا وہم دور کرنے کے لیے گھوڑے کو تھوتھنی سے پکڑا اور کہا ''یہ آواز تمھاری تھی؟ اگر تمھاری تھی تو ذرا پھر سے کہو جو تم نے ابھی کہا تھا۔''

گھوڑے نے پورے سکون سے کہا ''تمھاری کار کاربوریٹر خراب ہے۔'' اس پر شخص مذکور کی گھگھی بندھ گئی اور اس نے مارے خوف کے وہاں سے دوڑ لگا دی۔ فاصلے پر ایک شراب خانہ تھا۔ وہ بھاگتا ہوا اس میں داخل ہوا اور لمبا سانس لے کر ایک کرسی میں دھنس گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے، تو اس نے اپنی برابر والی میز پر بیٹھے ایک شرابی کو مخاطب کیا اور اسے سارا واقعہ تفصیل سے سنایا۔ یہ واقعہ سن کر شرابی نے اس سے پوچھا ''گھوڑا سفید رنگ کا تو نہیں تھا؟''

''ہاں۔ یہ سفید رنگ کا تھا!''

''اس کی دم کٹی ہوئی تھی؟''

''ہاں''۔

''اس کی کمر کے دائیں جانب ایک سیاہ داغ بھی تھا؟''

''ہاں'' اس شخص نے ڈری ڈری آواز میں جواب دیا۔ یہ سن کر شرابی نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا ''پھر تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اس گھوڑے کو کاربوریٹر کا کچھ پتا نہیں!''

یہ لطیفہ ہم نے سنا تو کافی عرصہ قبل تھا مگر آج کل ہمیں یہ دن میں تین چار مرتبہ یاد آتا ہے۔ یاد کیا آتا ہے یار لوگ یاد دلاتے ہیں۔ مثلاً گزشتہ روز ایک محفل میں ہم مہنگائی کا رونا رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ گوشت کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، دالوں نے ناکوں چنے چبوا دیے ہیں، سبزیاں عام آدمی کی دسترس سے باہر ہوگئی ہیں۔ آٹا، چاول، گھی، سگریٹ

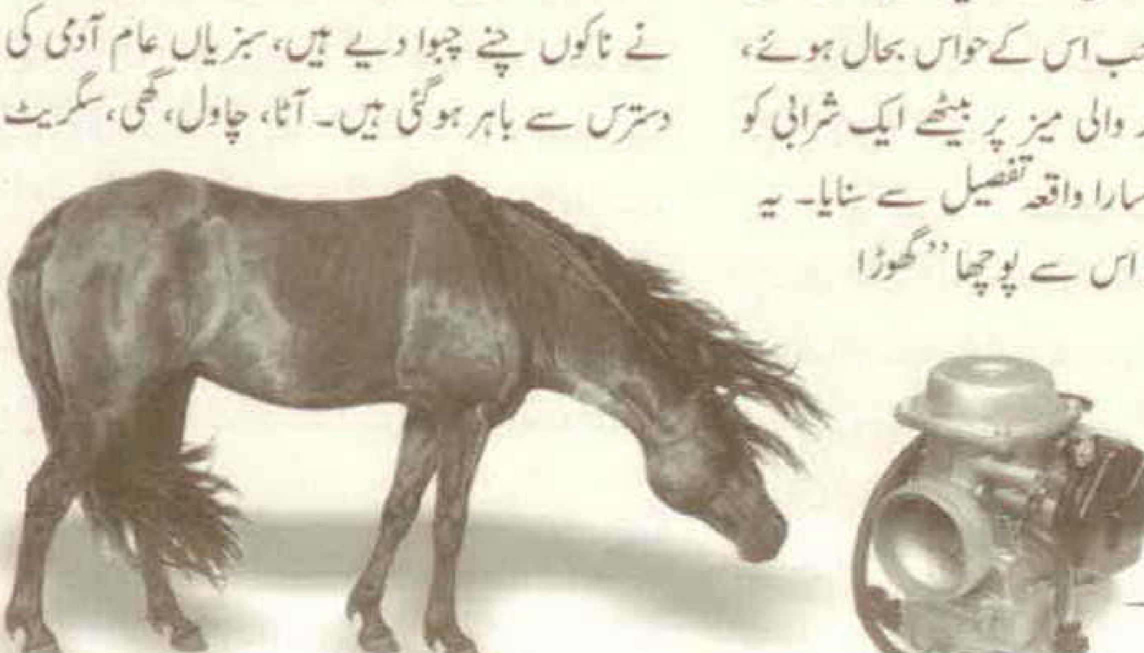

عطاء الحق قاسمی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اور چائے بھی آنکھیں دکھانے لگے ہیں۔ اچانک اس گفتگو کے دوران محفل میں موجود ایک ذخیرہ اندوز نے گھور کر ہماری طرف دیکھا اور کہا ''تم نے ایف اے میں معاشیات پڑھی تھی؟'' ہم نے کہا ''نہیں!''

پوچھا ''بی اے میں؟'' ہم نے کہا ''نہیں!''

بولا ''ایم اے میں؟'' ہم نے جواب دیا ''نہیں!''

یہ سن کر اس ذخیرہ اندوز نے قہقہہ لگایا اور اہل محفل سے مخاطب ہو کر کہا ''تم لوگوں کو مہنگائی سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اس شخص کو معاشیات کا کچھ پتا نہیں!''

اسی طرح چند روز قبل ہم نے ایک مولوی صاحب کی تقریر سنی۔ اس تقریر کے دوران ان کے منہ سے جھاگ بہ رہا تھا۔ اپنی اس ایک گھنٹے کی تقریر کے دوران انھوں نے مسلمانوں کی اتنی کثیر تعداد کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا کہ خدشہ تھا مزید آدھ گھنٹا اگر انھوں نے اور تقریر کی تو اس اکثریت والے خطے میں مسلمان اقلیت میں رہ جائیں گے، چناں چہ ہم نے گھبرا کر اپنے برابر کھڑے ان مولوی صاحب کے ایک عقیدت مند سے فریاد کی اور کہا ''کبھی موقع ملے تو حضرت صاحب کو سمجھایئے کہ ایسے اختلافی مسائل پر اتنے حتمی فتوے صادر کرنے سے مسلمانوں میں افتراق پیدا ہوتا ہے! ہماری یہ بات قریب کھڑے کچھ اور لوگوں نے بھی سن لی اور انھوں نے ڈرتے ڈرتے ہماری تصدیق میں سر ہلایا۔ اس پر مولوی صاحب کے اس عقیدت مند نے ہمیں مخاطب کر کے پوچھا ''تم نے کسی عالم کے آگے زانوئے تلمذ تہ کر کے قرآن کی تفسیر پڑھی ہے؟'' ہم نے کہا ''نہیں!''

پوچھا ''حدیث پڑھی ہے؟'' ہم نے کہا ''نہیں!''

بولا ''فقہ پڑھی ہے؟'' ہم نے کہا ''نہیں!''

اس پر اس نے قہقہہ لگایا اور لوگوں سے مخاطب کر کے کہا ''تمھیں اس شخص کی باتوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس شخص کو دین کا کچھ پتا نہیں۔''

یہ گھوڑے اور کاربوریٹر والا لطیفہ ہمیں اس وقت بھی یاد آیا تھا جب ایک جلسے میں ایک مقرر اپنی جماعت کے علاوہ باقی جماعتوں کو ''پاکستان دشمن'' قرار دینے پر تلا ہوا تھا۔ ہم اس تقریر کے دوران تلملاتے رہے۔ بالآخر ہم سے نہ رہا گیا چناں چہ ہم نے وہاں کھڑے لوگوں سے کہا ''اپنے پاکستانی ہونے پر فخر کرنا فخر کی بات ہے، لیکن کسی کو غدار قرار دینے سے قبل کم از کم ایک ہزار مرتبہ سوچنا چاہیے!'' اس پر ایک کارکن نے گھور کر ہماری طرف دیکھا اور کہا ''قیام پاکستان کے وقت تمھاری عمر کتنی تھی؟'' ہم نے کہا ''چار سال!''

پوچھا ''تم کسی جلوس میں شریک ہوئے تھے۔'' ہم نے کہا ''نہیں!''

پوچھا ''لاٹھی وغیرہ کھائی تھی؟'' ہم نے جواب دیا ''نہیں!''

اس پر اس نے قہقہہ لگایا اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہا ''تمھیں اس کی باتوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اس شخص کو محب وطن اور غیر محب وطن کا کچھ پتا نہیں!''

سو یہ لطیفہ جو ہم نے کالم کے آغاز میں سنایا تھا ایسے ہی مواقع پر دن میں کئی مرتبہ ہمیں یاد آتا ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا یاد کیا آتا ہے یار لوگ ہمیں یاد دلاتے ہیں، چناں چہ رفتہ رفتہ خود ہمیں یہ یقین ہونے لگا ہے کہ ہم واقعی گھوڑے ہیں اور ہمیں کاربوریٹر کا کچھ پتا نہیں، بلکہ اب تو ہمیں شبہ گزرنے لگا ہے کہ ہم گھوڑے بھی نہیں بلکہ گدھے ہیں اور ہمیں کچھ بھی پتا نہیں!

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

نصیب اوج پر ہوں تو سنا ہے چوروں کی دعائیں بھی قبول ہوتی ہیں۔

آپریشن پلان خروس

ایک روز کا سنسنی خیز تذکرہ ایئر فورس سے تعلق رکھنے والے چار جوان ایک مشن پر تھے جن کا ہدف خود چل کر ان کے پاس آگیا تھا۔

اختر حسین شیخ

جونہی ہماری کانوائے گورا قبرستان سے نکلی پیشرو گاڑی ''15 ہیڈ'' کا چھچا جہازی سائز ''ایریل ریفلکٹر'' کھل گیا۔ اور سرِعام گھومنے لگا۔ سامنے راکٹ کی رفتار سے گناہوں کے بوجھ تلے دبی ایک بس آرہی تھی۔ مسافر اس انداز سے اندر ٹھونسے ہوئے تھے۔ جیسے گتے کے ڈبے میں بوٹ۔ کچھ دروازے سے باہر ابلے پڑ رہے تھے۔

بریک لا۔ 'دبریک گزارا'' ہم نے چیخ کر ''محمد علی گزار کر'' سے کہا۔

انیس ٹن وزنی ''تھارنی کرافٹ'' گاڑی ہاتھی کی طرح جھولتی ہوئی رک گئی۔ ہم نے صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے نیچے چھلانگ لگائی۔ جلدی میں قلا بازی کھاتے کھاتے بچے ورنہ لب سڑک باوردی تماشہ بن جاتے۔ ان دنوں فوج کا وقار عوام الناس میں ''مونٹ ایورسٹ'' سے کم نہ تھا۔ ہم ہوائی مرد تو ویسے بھی پڑھے لکھے مشہور تھے۔ کاپل ''گذارا'' نے بڑی مہارت کا ثبوت دیا ورنہ تصادم ہولناک ہوتا۔

کانوائے رک گئی۔ سارجنٹ زیدی ایف ایچ۔ جنھیں ہمارا زبیر ہمیشہ ''فلکن ہیل'' زیدی کہا کرتا تھا (اسے نام بگاڑنے میں خاص ملکہ حاصل تھا) کیکڑے کی کج رفتاری سے جائے وقوعہ پر تشریف لائے۔ ہم اتنے میں بپھرے ہوئے سانڈ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کو نتھ ڈال چکے تھے۔ (ایریل کو مقفل کر کے ڈان۔8 تار سے مضبوط باندھا جا چکا تھا)

''وٹ دا ہیل از گوئنگ آن'' زیدی صاحب نے آتے ہی پہلا فائر کیا۔ ہمیں معلوم تھا اس کے بعد مسلسل فائرنگ ہوگی۔ ایسے میں خاموشی بہترین حکمت عملی ہوتی ہے۔ فائرنگ کا جواب فائرنگ سے دیا جائے تو جنگ کے شعلے اور بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور فضول کی جنگ ضیاع ہوتی ہے۔

''میں پوچھتا ہوں کہ یہ کھلا کیسے؟'' فائر میں کمی ہونے لگی۔

''ابھی پوچھ کر بتاتا ہوں۔'' ہم نے تھوڑا سا ایڈوانس کیا۔

''کس سے؟ اس ایریل سے؟'' زیدی صاحب نے حیران ہوکر پوچھا۔

''نہیں جس کی نگرانی میں ایریل مقفل کیا گیا تھا اور جسے آخری معاینہ کرنا تھا۔'' ہم نے دبے الفاظ میں ان ہی کی طرف اشارہ کیا۔ پہلے تو زیدی صاحب کا خیال تھا کہ اسی جگہ لب سڑک کورٹ آف انکوائری سجا دی جائے۔ ہمارے اشارے سے جوش خطابت ذرا تھما تو ان کو ہوش آیا۔ (ہوش میں ان جیسا باہوش آدمی ہماری نظروں سے کم ہی گزرا ہے) کہ ذمہ داری تو ساری کی ساری ان کی تھی۔ ویسے بھی خیریت گزری تھی۔ خواہ مخواہ بات چل نکلے تو جانے کہاں تک پہنچے۔ بات کا کیا لسی اور لڑائی کی طرح جتنا چاہو طول دے لو مگر سمیٹنا اپنے اختیار میں نہیں رہتا۔

''اچھا تم دوسری گاڑی میں جاؤ'' انداز ایسا تھا جیسے اب دیکھتا ہوں کہ ایریل کیسے کھلتا ہے۔ ہماری قافلہ ائے ریڈار بردار عجیب وضع قطع کی گاڑیوں پر مشتمل تھی۔ تھارنی کرافٹ۔ لیلینڈ۔ تھری ٹنر وغیرہ۔ اور منزل ٹھٹھہ تھی۔ ہم جدھر سے بھی گزرے لوگ اپنے اپنے ظرف کے مطابق ہمیں سمجھے۔ کوئی تیل بردار، کوئی ماہر موسمیات سمجھا۔ کسی نے فقط ''پاگل ای اوئے'' کہا۔

محمد علی گزارہ ہر بات کا جواب صرف ایک فقرے سے دیا کرتا تھا۔ ''اوگزارہ کرو جی'' آواز کے اتار چڑھاؤ اور لہجے کی مدد سے ہر قسم کا مفہوم ادا کر دیا کرتا تھا۔ پیارے لال ''مشتاق) پاتھی۔ (جمیل) گوپال داس (تابعدار حسین رضوی)۔ زبیل (محمد زبیر)، بل ورنا (ہم) کھکھا (عبدالحفیظ کھوکھر)، بکا (برکت علی) کیسے کیسے نابغۂ روزگار ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ (ہمارے سوا) ہم بکے کے ساتھ پچھلی گاڑی میں آ گئے۔ بکا اور گزارہ دونوں ''کیٹیگری اے ون'' ڈرائیور تھے۔ اور اپنی فنی مہارت کے ناقابل تردید ثبوت بارہا مہیا کر چکے تھے۔ بکے نے ہماری طرف دیکھا، دائیں ابرو کی ذراسی عمودی حرکت سے سوال کیا۔ ہم نے اسی انداز میں دونوں ابرو سکیڑ کر جواب دیا۔ سوچ میں ہم آہنگی ہو تو گفتگو میں زبان کا استعمال غیر ضروری ہوتا ہے۔

اس نے پوچھا ''کیا گزری؟''

ہم نے جواب دیا ''دفع کر مٹی ڈال سارے معاملے پر کوئی نئی بات نہیں'' قافلہ روانہ ہوا تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ مگر بکا خاموش رہنے والی جنس نہ تھا۔

''اوئے لاہوریا فیر مر گیا ئے'' تھوڑی دیر بعد بکا اپنی اوقات پر آ گیا اور اس نے اپنا مخصوص راگ الاپنا شروع کر دیا۔ یہ ہمیں چھیڑنے کا خاص انداز تھا۔ مطلب یہ کہ ہم فاتحہ خوانی کی محفل میں نہیں ہیں۔ کھکھا اور بکا ہمیں مختلف حالات میں مختلف ناموں سے پکارتے تھے۔ جن میں لہوریا، بل ورنا اور لوہا ان کے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پسندیدہ تھے۔)

پچھلی گاڑی میں پیارے لال اور اس کے پیچھے ''زبیل'' تھا۔ زیدی صاحب ٹریپ ڈور سے سر باہر نکالے قافلے کو اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے کھڑے کھڑے سفر کر رہے تھے۔ پپری کے قریب کانوائے کو رکنے کا اشارہ دیا گیا۔ پیارے لال بھاگا بھاگا ہمارے پاس آیا۔ جیسے کوئی بہت اہم خبر سنانا چاہتا ہو۔ ''اوئے! دیکھو زیدی انج لگدا پیا اے جیویں بلا چوری دا دوھ پی کے تھڑے تے بیٹھا ہووے'' (دیکھو زیدی صاحب اس طرح لگ رہا ہے جیسے بلا چوری کا دودھ پی کر کھلیان پہ جا بیٹھتا ہے) طبیعت کا سارا بوجھ اور تکدر دور ہو گئے۔ بکے نے قہقہہ مار کر کہا۔ پیارے لال ڈرشاباش کمینے تم واقعی ''جی دار'' ہو۔

اسی وقت سے پیارے لال جی دار ہو گیا۔ ہم نے ایک جی دار کھویا دوسرا پا لیا۔

''مکلی مانومنٹ'' اصل میں ٹھٹھہ کے شروع میں ایک قبرستان ہے۔ لیکن وہاں فن تعمیر کے ایسے ایسے نادر نمونے ہیں کہ انسان دیکھ کر دنگ رہ جائے۔ وادی مہران کے حکمران کلہوڑا خاندان کی قبریں کچھ اولاد تیمور کی آرام گاہیں۔ ایک منزلہ دو منزلہ ہوا دار کمرے پاکستانی کرنسی میں دس روپے کے نوٹ پر ان ہی تاریخی عمارتوں میں سے ایک کی تصویر ہے۔ یہ ہمارا تاریخی ورثہ ہے۔ ہے تو قبرستان ہی اور یہاں قبرستانوں جیسی خاموشی بھی موجود ہے لیکن شہرِ خموشاں میں قدم رکھتے ہی جو مایوسی، دنیا کی ناپائیداری کا احساس، ہر جدوجہد کی لاحاصلگی اور طبیعت پر بے زار کن سا بوجھ سوار ہو جاتا ہے وہ یہاں مفقود ہے۔ اس کے برعکس ایک تجسس ''اچھا! تو ایسا بھی ہوتا ہے؟'' کی سی کیفیت قدم قدم پر قائم رہتی ہے۔ دوپہر کے گہرے سکوت میں محرابوں کی جالیوں سے ٹکرا کر دیواروں کے روزنوں میں سے گزرنے والی ہوا کی سرگوشیاں بڑی پراسرار لگتی ہیں۔ اس ماحول سے دور بھاگنے کو نہیں بلکہ ٹانگیں پھیلا کر ستانے کو جی چاہتا ہے۔ جیسے کوئی کنج عافیت ہو۔ حد تو یہ ہے کہ وہاں ہم نے ایک مسروقہ مرغی بھی پکا کر مزے سے کھائی......

مکلی کے نواح میں ہم نے ڈیرے ڈال دیے، دیکھتے ہی دیکھتے کھلے میدان میں خیموں کی بستی اگ آئی۔ کھانے پینے کا سامان بجلی بتی۔ ہم ہر چیز میں خود کفیل تھے۔ ہر سال ملکی اخباروں میں اعلان ہونے والے خود کفیل نہیں۔ ''ملک گندم میں امسال خود کفیل ہو گیا'' اور پھر اسی برس گندم میں پسی ہوئی بھوسی کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور روٹی کا روپ ماند پڑ جاتا ہے۔ پھر اس کی تاویلوں میں بحر فصاحت بہتے ہیں۔

خدا بخشے چرچل نے جو سیاست دان کی تعریف کی ہے اس کی رو سے اول تو اس کے ''دان'' میں بھس نہیں سوجھ بوجھ بھری ہونی چاہیے جس کی وجہ سے وہ آئندہ آنے والے واقعات کے متعلق پیش گوئی کر سکے اور جب وہ پیشگوئی حسب توقع جھوٹ کا پلندہ ثابت ہو تو یہ بھی سمجھا سکے کہ اس کی پیشگوئی سچ کیوں ثابت نہ ہو سکی۔ معلوم ہوتا ہے ہماری توانائیاں بس اسی تعریف پر پورا اترنے میں صرف ہو رہی ہیں۔ خدا چرچل کو دوزخ میں ڈالے جس نے سیاست کی یہ تعریف کر کے ہمارا کباڑا کیا۔ (ہم اپنی پہلی دعا واپس لیتے ہیں)

ہماری خود کفالت کا منہ بولتا ثبوت اسی رات مل گیا۔ جی دار، باٹھی اور پہلوان کا تمبو ہمارے قریب تھا۔ ابھی آنکھ جھپکی ہی تھی کہ کگڑوں، کوں کگڑوں......

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کوں کی کرخت آواز سے نیند اچاٹ ہوگئی۔
''اوئے بل ورنے پہلوان اپنے مامے نوں وی نال ای لے آیا ای۔'' بکے نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا۔
''بچو! فکر نہ کر مامی وی نال اے'' ہماری نیند بھی اچاٹ ہو چکی تھی۔
کھوکھر کی شادی طے پا چکی تھی۔ بس اسے چھٹی کا انتظار تھا۔ پھر اس کا جنازہ جائز ہو جاتا۔ وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔
''آئیڈیا! آئیڈیا!'' اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔
''میں بھی اس کو بنا چکنے کے بعد ساتھ ہی رکھوں گا۔'' کھوکھر خود کلامی میں مصروف تھا۔ ''اوئے کیا بک بک بگا رکھی ہے؟ کس کو کیا بنا چکنے کے بعد ساتھ رکھو گے؟'' بکے کی نیند بالکل اچاٹ ہو چکی تھی۔
''یار! صغراں کو بیوی بنانے کے بعد ساتھ ہی رکھوں گا۔ دیکھو نہ اس میں حرج ہی کیا ہے۔'' وہ اس وقت گوجرانوالہ میں اپنی ''صگی'' کے پاس پہنچ چکا تھا۔
''آخری بیوی، بیوی ہوتی ہے کوئی غیر تو نہیں۔ لوگ تو ایسے ہی کہتے پھرتے ہیں، سپاہی کی بیوی اور جولاہے کی جوتی دور پڑے پڑے سوکھ جاتی ہیں۔'' کھوکھر نے تبصرہ کیا۔
''یعنی اس جگہ؟ اس ٹینٹ میں؟ اوئے تم نے آج ''سوٹا'' تو نہیں لگا لیا۔'' ہم حیران ہوئے ''اوئے لہوریا! یار تم سے کیا پردہ تم تو خود بہو بیٹی کی طرح ہو۔ چلو اگر تمہیں شرم آنے کا خطرہ ہے جس کی مجھے بالکل امید نہیں، تو ہم دلھا اور دلھن کو الگ خیمہ لگا دینا۔''
''مگر تمہارے دماغ میں یہ کیڑا کلبلایا کیسے؟'' زبیل نے کمبل سے منہ نکال کر کہا۔ ہم سمجھے وہ سو رہا ہے۔ ان دنوں وہ بے حد شرمیلا تھا۔ اور بکا اسے گاڈ فادر کی طرح تحفظ مہیا کیا کرتا تھا۔
''اوئے تو کب سے جاگ رہا ہے؟ سو جا چپ کر کے۔ مت سنا کر ان لفنگوں کی باتیں......'' بکے نے بزرگی جتائی۔
''یار کیوں اسے کنواری ''کڑیوں'' کی طرح چھپا چھپا کر رکھتے ہو...... ہونے دو اسے بھی تھوڑا سا بالغ۔'' کھوکھر نے زبیل کی حمایت کی۔
اتنے میں مرغ نے اذان دے دی۔
''یار! ہم سے تو یہ ''ککڑ ککڑی'' اچھے ہیں ساتھ سوتے ہیں ساتھ جاگتے ہیں۔'' کھوکھر نے اداس ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔
''صبح پہلوان سے پوچھیں گے کہ اس نے مرغی مرغا رکھنے کی ''پرمشن'' لی ہے؟ ہم نے موضوع بدلا......
دن گزرتے رہے ہم تنگ ہوتے رہے۔ ایک روز وفد کی صورت میں جا کر پہلوان سے بات کی کہ رات پچھلے پہر کی نیند اس کا ''ماما'' خراب کرتا ہے اور دوپہر کو تخلیقی عمل سے فارغ ہوتے ہی کنکنا۔۔ کنکنا کر کے اس کی ''مامی'' پریشان کرتی ہے۔ ''پہلوان جی! مانا ان کا یہ فعل، تمھارے مفاد میں ہے۔'' (پہلوان کو سونے سے پیشتر دودھ انڈے پینے کی عادت تھی) لیکن ہم ان کی یہ ''بدفعلیاں'' برداشت نہیں کر سکتے۔'' لیکن پہلوان کی موٹے تازے جسم کے ساتھ عقل بھی موٹی تھی۔ اسے کھانے پینے اور جان بنانے کے سوا ہر کام فضول لگتا تھا۔
''برداشت نہیں کرو گے تو کیا خود ان جیسی حرکتیں شروع کر دو گے۔ میں تو ابھی مرغی بٹھانے کی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سوچ رہا ہوں پھر کیا کرو گے؟ تمہارا کام تو بہت مشکل ہو جائے گا۔''

''پہلوان! مرغی کو کیوں تکلیف دیتے ہو۔ خود ہی بیٹھ جاؤ ناں۔ اتنی بڑی لاش کس کام آئے گی آخر تو کیڑے ہی کھائیں گے۔'' کھوکھر بھلا کیوں معاف کرتا۔

''جاؤ یار اپنا کام کرو۔ میرے شریف مرغ مرغی کو کیوں بدنام کر رہے ہو؟'' اس نے الٹے ہاتھ سے ہوا کو دھکا دیتے ہوئے کہا ''میرا مرغ اذان نہ دے تو سورج ہی نہ نکلے۔''

''تو اسے سمجھاؤ کہ طلوع آفتاب کا اہتمام ذرا دیر سے کیا کرے۔'' ہم نے کھوکھر کو کمک پہنچائی ''بھئی میرا مرغ ایک تو خود مختار ہے۔ دوسرے فوجی ڈسپلن اس پر لاگو نہیں ہوتا۔''

'پہلوان بات نہ بڑھاؤ۔ فوجی کیمپ میں جو بھی رہے گا اس پر ''ڈسپلن'' ضرور لاگو ہوگا۔ پھر یہ شور مچا کر ہماری پوزیشن کا اعلان کر دیتا ہے۔ جو'' آفیشل سیکرٹ ایکٹ'' کے خلاف ہے۔ اس کا تو کورٹ مارشل ہونا چاہیے۔'' بکے نے قانونی نکتہ اٹھایا۔

''کون کرے گا میرے اصیل مرغ کا کورٹ مارشل؟ میں اس کا پینٹ مارشل نہ کر دوں گا؟''

اس طرح تمام دلائل ضائع گئے۔ اور مذاکرات فیل ہو گئے۔ ہم واپس اپنے خیمے میں آئے اور ''اوپریشن پلان خروس'' کو زیر بحث لا کر نہایت سنجیدگی سے اس کا فیز I ''ڈیکلیئر'' کر دیا۔ صرف اپنے ٹینٹ کے اندر۔

''بل ورنے!'' بکے نے سنجیدگی سے کہا ''ہر اوپریشن کی کامیابی کا راز، مکمل رازداری میں ہوتا ہے

''کیپ یور سیکرٹ۔ رینج یور گول'' پھر زبیر کو گھور کر دیکھا۔ کیونکہ وہی ہماری زنجیر کی کمزور ترین کڑی تھا۔

سب نے مل کر غور وخوض کیا۔ اور ایک لائحہ عمل طے ہو گیا۔ فیز I میں مرغ مرغی یا دونوں کا ورغلانا۔ فیز II میں اغوا اور فیز III میں ''پیٹ مارشل'' ''اوپریشن پلان خروس'' کے یہ تین اہم پہلو تھے۔

''یار کہیں بات بڑھ نہ جائے۔'' زبیر نے دبے الفاظ میں مخالفت کی۔

''اوئے چپ کر'' بکے کو غصہ آ گیا۔ ''کیا زنانیوں کی طرح ہر وقت ''ریکتا'' رہتا ہے مرد بن مرد۔ بس فیز I کا انچارج تو ہے۔''

ورغلانے کی تفصیل کچھ یوں طے پائی کہ اپنے تنبو کے سامنے آٹے کی گولیاں، روئی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یا چاول کے دانے بکھیر دیے جائیں۔ جب دونوں میاں بیوی کی نظر ان پر پڑے گی تو لالچ کے مارے رفتہ رفتہ ہمارے قریب آ جائیں گے۔ جب ہم سے مانوس ہو جائیں گے تو بقیہ فیزوں پہ عمل آسان ہو جائے گا۔

پہلے ''فیز'' پر عمل درآمد ہوا اور اسی دن بھانڈا پھوٹ گیا۔ غنیم کی سیکیورٹی ہم سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئی۔ دوپہر کو ہم ٹینٹ میں گپ شپ لڑا رہے تھے کہ پہلوان مسکراتا ہوا داخل ہوا۔

''اچھا تو یہ جال بچھایا جا رہا ہے۔ مگر اتنا یاد رہے میرے مرغ مرغی کی طرف بری نیت سے دیکھنا مہنگا پڑے گا۔''

''نہیں یار! تمہاری مرغی کو کون بری نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ تمہارے ہوتے ہوئے۔'' بکے نے عمداً ''تمہارے ہوتے ہوئے'' چند لمحوں بعد کہا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

''بہرحال مجھے یہی کہنا تھا۔'' پہلوان یا تو اس چوٹ کو سمجھا نہیں یا پی گیا۔

''اور اپنی مرغی کو سمجھا دینا کہ چھمک چھلو کی طرح مٹک مٹک کر...... زیادہ ادھر ادھر آوارہ نہ گھوما پھرا کرے۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔'' بکے نے جاتے ہوئے پہلوان پر ایک اور چوٹ کی۔

دوسری صبح جب مرغ نے اذان دی تو پہلوان کی ''بڑھک'' بھی ساتھ ہی سنائی دی شاوا شیر دیا پتھیا۔ دبارکھ''

ماحول کھچا کھچا سا، فضا میں ایک تناؤ سا پیدا ہو گیا۔ پہلوان آتے جاتے کھنکھارتا۔ اپنے ٹینٹ میں اگرچہ ہر کوئی آزاد ہوتا ہے مگر پہلوان کا رویہ بالکل بھارت جیسا ہو رہا تھا۔ ہمارے دریاؤں کا منبع بھارت کے علاقے میں ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اس کمزوری سے فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ اپنے گھر بیٹھے بیٹھے دریاؤں میں سیلاب دھکیل دینا یا ان کی رگوں سے آخر قطرہ آب تک چوس لینا اس کی عادت بن چکی ہے۔ مانا ڈیم اس نے اپنے علاقے میں بنائے ہیں مگر ان کے اثرات ہم تک منتقل ہوتے ہیں۔ تمام معاہدے تو کاغذ کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ سیلابوں کے آگے کاغذی بند تو نہیں باندھے جا سکتے طغیانی کے آگے معاہدے والا کاغذ رکھ کر اسے روکنا دماغی خلل کی نشانی ہے اور نہ خشک دریاؤں میں اسے ڈالنے سے وہ ٹھاٹھیں مارنا شروع کر سکتے ہیں۔ گویا اس کا دستِ ستم ہماری شاہ رگ پر ہے۔

پہلے صرف مرغی مرغا تھے اب پہلوان کی شمولیت سے ''بنجامن سسٹرز'' کا ''تن گڈا'' مکمل ہو گیا۔ لیکن قدرت کو عدل پسند ہے اور عدل انصاف کی آخری حد تک ہوتا ہے۔ ایک دوپہر کھوکھر کی دبی دبی سرگوشی

> یوں تو خاصی دیر میں جا کر عشق کا شعلہ بھڑکا ہے
> چھوٹی عمر میں شادی کے نقصان کا پھر بھی دھڑکا ہے
> دُلہا اور دُلہن کی عمریں پوچھیں تو معلوم ہوا
> بچپن سال کی لڑکی ہے اور ساٹھ برس کا لڑکا
>
> (ڈاکٹر انعام الحق جاوید)

سنائی دی۔ ''اوئے لہوریا، اوئے بکے، اوئے ''ناما نیموں'' ادھر ویکھو رب دی شان''

ہم نے قدرت کا کمال دیکھا تو ایمان تازہ ہو گیا۔ پہلوان کی مرغی تجسس بھری نگاہوں سے ہمارے خیمے کی فرضی دہلیز پر کھڑی اندر جھانک رہی تھی۔

''بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے'' ہمارے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''شکر ہے پھر بھی آئے تو'' کھوکھر نے باندازِ دگر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ ''اوئے چپ کرو کھوتیو'' بکے نے دبی زبان سے ڈانٹ پلائی ''کہیں بھگا نہ دینا۔'' مرغی نے اپنا بایاں پاؤں اٹھایا۔ ہوا میں کسی چیز کو پکڑنے کے انداز میں اپنا پنجہ اک ادا سے بند کیا۔ اور تین انچ آگے زمین پر نزاکت سے رکھ دیا۔ جیسے گوری تھم تھم کے پہلی ملاقات کرنے پیا دوارے حاضر دیتی ہے۔ آنے والے وقت اور ہونے والے واقعات کا تجسس، خوف خلق کا سہم، ضمیر کی چبھن، منہ زور جذبات کے ریلے میں سب کچھ بہہ جاتا ہے۔ خدا خدا کر کے اس نے دہلیز پار کی۔ ہم نے چارپائی سے چھلانگ لگا کر ''کینولیس'' کا دروازہ بند کیا۔ مرغی نے گھبرا کر چارپائی کے نیچے کنج عافیت تلاش کیا۔ لیکن ماحول سے مانوس تھی سب ٹینٹوں کا اندرون تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

احتجاج وغیرہ نہ کیا۔ کہاں کی اوپریشن پلان اور کہاں کا لائحہ عمل۔ پہلا، دوسرا، تیسرا سب فیزوں کو پسِ پشت ڈال کر ہم نے فوراً چاقو نکالا۔ بکے اور کھوکھر نے بیک وقت زبیر کی چارپائی کے نیچے جھانکا۔ مرغی کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔ جھپٹ کر بکے نے اسے دبوچا۔ وہ انسانی ہاتھوں کے پیار بھرے لمس کی عادی تھی اس لیے اس نے کوئی خاص مزاحمت نہ کی۔ جب تک اسے ہمارے ''نیک'' ارادوں کا ادراک ہوتا، پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اور وہ اچھی طرح قابو میں آ چکی تھی۔

''لاہوریا چھری پھیر، چھری، جلدی کر'' بکے کی آواز میں کامیابی کا جوش نمایاں تھا۔ ٹینٹ کے ایک کونے میں ہم نے اپنے گناہ گار ہاتھوں سے اس روز روز کی دانتا کل کل کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد ہر چیز خود بخود ہوتی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دیگچی کی تربت میں شہید وفا کا ٹکڑے ٹکڑے بدن، سالم پیاز اور نمک مرچ تلے دبا، ملاحظہ فرما رہے تھے۔ جب نصیب اوج پر ہو تو سنا ہے کہ چوروں کی دعائیں بھی قبول ہو جاتی ہیں۔ لوگ گھروں میں گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے اور دروازے کھلے ملتے ہیں۔ پہلوان کا خیمہ خالی بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہ لوگ شہر گئے ہوئے تھے۔

برکت نے فوراً ''چوٹ'' کی رنگین ٹی شرٹ اور خاکی پتلون پہنی۔ ہمیں بھی ایسا کرنے کو کہا۔ ان دنوں جوٹ کی شرٹوں کا بڑا رواج تھا۔ باؤزر (آب رسانی کی گاڑی) کی چابی لی اور پورا پلان بتایا۔

''زبیر تم میرے ساتھ چلو گے بل ورنے تم اور کھوکھر پہلے نکل جاؤ۔ راستے میں ہمارا انتظار کرو۔ سب اکٹھے نکلیں گے تو لوگ خواہ مخواہ شک کریں گے۔ میں باؤزر لے کر آتا ہوں۔ سب جانتے ہیں کہ میں پانی لینے کسی بھی وقت شہر چل پڑتا ہوں۔''

لوگ قیلولہ فرما رہے تھے اور ہم باؤزر میں بے سرا کورس الاپتے، مکلی مانومنٹ کی طرف رواں دواں تھے۔ کھوکھر پیچھے کھڑا پانی کی ٹنکی پر تھاپ دے کر طبلے پہ سنگت کر رہا تھا۔

ریشم دا لاچا لک وے
نالے بلاں تے بجرا سک وے
جئی چلی مربیاں دی سیر نوں
نہ گھور کے اڑیا تک وے
ریشم دا لاچا لک وے

مکلی مانومنٹ کی ''شکر دوپہر'' ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ صرف چار شخص ایک دوسرے سے بوٹیاں چھین چھین کر کھا رہے تھے اور ایک دوسرے کی پسند کا خیال بھی رکھ رہے تھے۔ ''اوئے پھڑ! ایہہ بوٹی کھا۔ مریں سکدا ای جاناں ایں۔ کوئی جان شان وی بنایا کر''

کوئی بیس پچیس برس بعد پیرس کے نواح میں ''لافاتے سینتوں باں'' کے مشہور ریسٹورنٹ میں لذیذ ترین لنچ کرتے وقت ہمیں مکلی مانومنٹ والا لنچ یاد آ گیا تو سامنے رکھی وہی تمام ڈشیں بدمزہ لگنے لگیں۔ ہم نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور بہانہ بنا کر اٹھ گئے۔

نوٹ: ہم نے اپنی طرف سے تمام سراغ مٹا دیے تھے۔ مگر یہ ہماری بھول تھی۔ دوسرے دن پہلوان اینڈ پارٹی نے کامیاب سراغ رسانی کی۔ بال و پر، کھال ہر چیز برآمد کر لائے خشک چولھے کی راکھ تک اٹھا لائے۔ ان تمام شہادتوں کے باوجود وہ یہ ثابت نہیں کر پا رہے تھے کہ اصل مجرم ہم لوگ ہیں۔ ہمارے فنگر پرنٹس تو کسی چیز پر تھے نہیں۔ نفسیاتی دباؤ تلے آ کر ہماری زنجیر کی کمزور ترین کڑی ٹوٹ گئی۔ زبیر نے اعتراف کر لیا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

علم و ادب کے خزانے کی واپسی

ٹھٹھے میں ہمارے قیام کا سب سے بڑا فائدہ اس اکلوتے سینما کو ہوا جہاں پہلے اُلو بولا کرتے تھے۔ پھر جی دار، پاٹھی، کوڈی پلیئر، بکے اور ہمارے نعرے گونجنے لگے۔ کبھی کوئی ''بڑھک'' بھی مار دیتا جس کے لیے سینمے کا مالک ہمارا ممنون و مشکور ہوتا۔ دوسرا فائدہ چند گھروں پر مشتمل ایک غریب سی بستی کو ہوا جس کو بکا چوری چھپے جا کر پانی سپلائی کر آتا تھا۔ یہ حرکت ''ڈسپلن'' کے خلاف تھی مگر اس کا علم ہمیں کافی عرصہ بعد میں ہوا۔ ہمارے کریدنے پر ایک مرتبہ وہ ہمیں بھی ساتھ لے گیا۔ بکے نے بستی (جو بستی کے نام پر تہمت تھی) کے باہر ''باؤزر'' روک کر ہارن بجایا۔ اس کی ضرورت نہ تھی۔ ٹین کے کنستر، مٹی کے مٹکے اور طرح طرح کے برتنوں کی قطار پہلے ہی سے موجود تھی۔ پھر بوڑھی، جوان عورتیں بچیاں اپنی اپنی باری پر پانی لینے لگیں۔ ہم نے اندازہ لگایا بکا کسی خاص چہرے کی تلاش میں ہے۔ ہمارا اس کا دن رات کا ساتھ تھا۔ اس لیے ایک دوسرے کے متوقع عمل و ارادے کی ہم پیشگوئی کر سکتے تھے۔ گدڑی میں دھول سے اٹے ایک لعل کو دیکھ کر بکے کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''اللہ روٹی دیتا ہے تم پانی دیتے ہو'' اس نے بس ایک فقرہ بکے سے کہا اور پھر اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔ ہم بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ بکا راستے بھر خاموش رہا پھر خود ہی بڑبڑانے لگا۔ بڑے غریب لوگ ہیں۔ اسے بس ایک ہی اردو کا فقرہ آتا ہے۔ ''رفتہ رفتہ سب سیکھ جائے گی'' ہم نے بھی اسی انداز میں باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ پھر کافی دیر خاموشی رہی۔ بکا چاہتا تھا کہ ہم اس پر تبصرہ کریں مگر زبان کو بھی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔

بل ورنے! یقین کرو کوئی گڑ بڑ والی بات نہیں۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔

ٹھٹھے میں دن رات کافی مصروف گزرے۔ جس مقصد سے ہم گئے تھے وہ تقریباً پورا ہو چکا تھا۔ زیدی صاحب کراچی واپس جانے کو یوں بے تاب تھے جیسے وہاں آگ لگی ہو اور ان کے بغیر وہ بجھ نہ سکے گی۔ بقول ٹھٹھے وہ ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے تھے اور ہمیں اس جمنے جمانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہتھیلیاں تو ویسے بھی ''بنجر'' ہوتی ہیں۔

ایک صبح کہ موڈ ان کا زیادہ بگڑا ہوا تھا شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ چکے تھے انگشت شہادت سے عینک کو ناک کی پھننگ پر بار بار سجاتے ورکشاپ میں تشریف لائے۔ انداز کیچڑ میں چلنے والا تھا۔ آتے ہی زبیر اور ہم پر برس پڑے۔ کھوکھر تکنیکی معاملات کو ''مسائل تصوف'' کہا کرتا تھا اور ان سے حتیٰ الوسع دور ہی رہتا تھا ''تم لوگ سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو؟ یہی کہ تمھارے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ مجھے تمھاری نیتوں اور کرتوتوں کا سب پتا ہے۔ کل سے لگے ہوئے ہو اور ''ٹرننگ گیئر'' ٹھیک نہیں ہو رہا میں ایر ہیڈ کوارٹر کو کیا رپورٹ دوں؟ ہیں!'' (یہاں پہلا فل اسٹاپ لگا) ہم جانتے تھے کہ یہ ابال ختم ہوتے ہی زوجہ کا ہنبل سرونٹ (وہ اکثر کہتے لیس آئی ایم ہنبل سرونٹ آف مائی وائف) سب کا ہنبل سرونٹ بن جائے گا اس لیے دودھ کی امید میں دولتیاں کھا رہے تھے۔

''لاؤ! سارے۔ ٹی۔ او۔ مجھے دو! بس بہت دیکھ لی ہر ایک کی ''ایفٹے خانی'' میں آج ہی پڑھ کر اپنا نالج برش اپ کرتا ہوں میں خود سارا کام کر لوں گا تم لوگ بیٹھو چرخا کاتو'' ہیں..... یہ دوسرا ''ہیں'' ذرا لمبا تھا۔ مطلب یہ کہ ابال روبہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ترقی ہے تنزل کی فی الحال کوئی امید نہیں...... یہ کہا، تین چار کتابیں جو بھی سامنے آئیں۔ بغل میں دبا، یہ جا وہ جا۔ آندھی کی طرح آئے بگولے کی طرح چل دیے۔ تھوڑی دیر تک ورکشاپ میں خاموشی چھائی رہی۔ کھوکھر "ریکٹی فائیر" یونٹ کی طرف منہ اور ہم سب کی طرف پشت کیے بڑی سنجیدگی سے ایک ہتھوڑے کی ساخت پر غوروفکر کر رہا تھا۔

"ہوں چرخہ کا تو۔" زبیر نے نقل اتاری۔ "الو دا چرخہ سارے ٹی۔ او اٹھا کر لے گیا ہے۔" ٹی۔او کے متعلق تھوڑی سی وضاحت بہت ضروری ہے یہ مخفف ہے۔ "ٹیکنیکل آرڈرز" کا ایک کتاب جس میں مشین کی کارکردگی نقائص اور ان کا ممکنہ حل نقشہ جات وغیرہ کی تفصیل ہوتی ہے۔ عسکری نظام میں علمی باتوں پر بھی احکام کے سے انداز میں بحث ہوتی ہے۔ اگر کوئی نقص دور کرنا ہے تو پہلے اس نقص کو دور کرنے کی اتھارٹی آپ کے پاس ہونی چاہیے۔
اگر آپ پہلے دوسرے درجے کے تربیت یافتہ ہیں تو تیسرے چوتھے درجے کے نقائص دور کرنے کی آپ کو اجازت نہیں۔ ہر چیز کا ایک نظام ہے۔ یہی "تنظیم" افواج کا طرہ امتیاز ہے۔

امریکن ایئر فورس ایڈجوٹنٹ ایک معزز خاتون کیپٹن تھی اس کے زیر احکام کام کرنے والے اسٹاف میں ایک سارجنٹ اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ پہلے تو ڈسپلن آڑے آتا رہا۔ ایک دن وہ اس دیوار کو پھلانگ کر ایڈجوٹنٹ کے کمرے میں گھس گیا۔ بڑے چاق چوبند انداز میں سلیوٹ مارا۔ اٹن شن ہو کر عرض کی

"سر"
ے آئی ہیو دی پرمشن ٹو کس یو......

ایڈجوٹنٹ نے گھبرا کر یہ درخواست سنی۔ ہر چیز ڈسپلن کے عین مطابق تھی۔ خاتون نے اٹھ کر وردی ٹھیک کی بغیر مسکرائے (یہ غیر ضروری حرکت ڈسپلن کے خلاف ہے) حکم دیا۔
پرمشن گرانٹڈ... (درخواست منظور کی جاتی ہے)
زبیر ابھی تک دس اگل رہا تھا "لاہوریا دیکھنا یہ کیکڑا سارے ٹی۔ او اٹھا کر تو لے گیا ہے۔ اب تکیے کے نیچے رکھ کے سو جائے گا۔ نہ خود پڑھے گا نہ کسی کو پڑھنے دے گا۔"

یہاں اس نے پنجابی کی مخصوص گالی دہرائی جسے ہم نے محنت سے انگریزی لباس پہنایا تھا۔ اسے کہتے ہیں نہ کھیڈاں گے نہ کھیڈن دیاں گے۔ کھتی وچ موتراں گے۔"

اوئے بیڑا غرق" کھوکھر نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا اور ادھر ادھر کچھ تلاش کرنے لگا۔ پھر الماری

"برکت! ایک چھوٹا سا واقعہ غور سے سنو" ہم پر بھی سنجیدگی طاری تھی۔
مسلمانوں نے جب مکے سے ہجرت کی تو ایک صحابی کے منہ سے بس ایک فقرہ نکل گیا۔ "مدینے جائیں گے۔ شاید لیلیٰ سے کوئی شادی کی سبیل بھی نکل آئے۔" کافی عرصہ پیشتر ان میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کی کوئی بات وات ہوئی تھی۔ اس صحابی نے بھی دوسرے صحابہ کی طرح ہر دکھ کی لذت چکھی۔ ایمان کی پختگی میں کمی نہ تھی اور نہ ہی نیت میں کوئی خرابی تھی۔ پھر بھی دوسرے مہاجرین کے برعکس "مہاجر لیلیٰ" قرار پائے۔ پاکیزہ کھانے کی تشت میں گندگی کا ایک چھوٹا سا قطرہ نہ ملاؤ۔
"اوئے لاہوریا فیر مر گیا جے" اس نے مسکرا کر اپنے خاص ترنم میں ہانک لگائی۔ مطلب یہ کہ سنجیدگی کو طلاق، طلاق، طلاق!

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کھول کر دیکھی۔

''کیا ہیرے جواہرات گم کر بیٹھے ہو؟'' منہ پر ''فٹے منہ'' برس رہی ہے۔'' زبیر کا موڈ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا تھا۔

''اوئے جاہل ماضی مطلق، میرا علم و ادب کا خزانہ۔ میرا پرسنل فولڈر بھی اٹھا کر لے گئے ہیں زیدی صاحب!''

اس کے علمی ادبی فولڈر کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ اس میں تمام فلمی غیر فلمی اداکاراؤں کی رات کی تنہائی میں ''بغور پڑھنے'' والی تصاویر جن پر اس نے ''قینچی کاری'' کا کمال دکھایا ہوا تھا، بند تھیں۔ دوپہر کو سارا کیمپ قیلولہ فرما رہا ہوتا۔ کھوکھر گوند، قینچی سے لیس بڑے انہماک سے آرٹ کے شہکار تخلیق کرنے میں مگن ہوتا۔ بدن کے خطوط کی وضاحت کرتا زاویوں کو مزید اجاگر کرتا۔ یہ اس کی اپنی دنیا تھی۔ جس میں کوئی دخل انداز نہیں ہو سکتا تھا اور ہم سب اس کے اس خبط سے واقف تھے۔

''تمہارے خاص الخاص ادب پاروں کے علاوہ اور کیا کیا تھا اس فولڈر میں'' زبیر نے سرسری انداز سے پوچھا۔

ہدایت نامہ خاوند اور ''انسائیکلوپیڈیا آف سیکس'' کھوکھر نے سادگی سے جواب دیا۔ ''در لعنت تیری اوقات پر ہدایت نامہ بیوی کو کیوں بھلا بیٹھے ہو؟ وہ کیوں نہ پڑھتے ریڈار کی کتابوں سے تو یوں بدکتے ہو جیسے کوا غلیل سے'' ہم نے بھی مقدور بھر لعن طعن کی ہم حیران اس بات پر ہو رہے تھے کہ دن رات کا ساتھ ہوتے ہوئے بھی ہم ایک دوسرے کے متعلق کیا جانتے ہیں؟ (ہمیں یہ خبر نہ تھی کہ اس کا شوق تصاویر سے تجاوز کر چکا ہے) کچھ بھی تو نہیں، انسان کے اندر جھانکنا، اس کی ذات کے بھنور کی آنکھ تک رسائی ناممکن ہے۔ دوسروں کو چھوڑیے، ہم اپنے آپ سے عمر بھر لا علم رہتے ہیں...... عشق و محبت کے دعوے! رشتوں کے بندھن کیا ان کی اساس صرف ذاتی مفاد پر ہے؟

عمر بھر رکھا کیے بے فیض رشتوں کے بھرم
ورنہ سچ پوچھو تو کوئی ایک بھی اپنا نہ تھا

ہم پر اداسی ٹوٹ کر چھانے لگی۔

''لاہوریا! تم کس کا سوگ منا رہے ہو؟ سب ٹھیک ٹھاک ہے'' زبیر نے عام سے لہجے میں کہا ''یار وہ تو ٹھیک ہے پر بات ہے شرمناک، زیدی صاحب دیکھیں گے تو ہمارے اخلاق دیوالیے پن پر انہیں شاک ضرور پہنچے گا، کیا پتا رپورٹ ہی کر دیں۔'' ہم نے تشویش کا اظہار کیا۔

''کیا احمقوں جیسی باتیں کرتے ہو۔ بزرگوں کو بھی لطف اندوز ہونے کا حق ہے۔ بلکہ وہ زیادہ مستحق ہوتے ہیں۔ رات کے پچھلے پہر کی نیند زیادہ مزے دار ہوتی ہے اسی لیے باسی کڑھی کا ابال اور پچھلی عمر کے چونچلے زیادہ مشہور ہیں'' زبیر آج بڑی گہری باتیں کر رہا تھا۔ ''اور دیکھ لینا کوئی رپورٹ شپوٹ نہیں ہو گی اس لیے کہ میں جانتا ہوں خواہ ایک مہینے بعد جا کر دیکھو سب کتابیں زیدی صاحب کے تکیے تلے جوں کی توں محفوظ ہوں گی۔ وہ ان کو کھولنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کریں گے۔''

''لو بھئی کھوکھر مبارک ہو۔ تمہاری حسیناؤں، محبوباؤں، کج اداؤں کی چادر عفت داغدار نہیں ہو گی۔'' ہم نے سوگوار ماحول سے تنگ آ کر کہا۔

زبیر، واقعی چند دنوں بعد زیدی صاحب کی اجازت سے تمام کتابیں جوں کی توں اٹھا لایا۔ کھوکھر نے اپنا علم و ادب کا خزانہ در خیمہ ہی پر دبوچ لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ انسانی نیت کا کیا اعتبار، جانے کب ڈانوا ڈول ہو جائے اور چادر عصمت کی سفیدی تو میلی نظر سے بھی داغدار ہو جاتی ہے۔

●○○

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

انبالہ میں منعقدہ مشاعرے کے میزبان کی شہرت کی انوکھی وجہ

ملہوترہ کے کتے

معروف مزاحیہ شاعر کی زندگی سے جڑے دلچسپ واقعات

ضیاء الحق قاسمی

انبالہ کے مشاعرے میں شرکت کے لیے منیر نیازی، تنویر سپرا، ڈاکٹر سعادت سعید اور دوسرے کئی شعرا بذریعہ سمجھوتہ ٹرین رات دو بجے انبالہ پہنچے تو منتظمین مشاعرہ میں سے کوئی بھی استقبال کے لیے اسٹیشن پر موجود نہ تھا۔ ہم سب پریشان تھے کہ اتنی رات گئے ہم کہاں جائیں۔ ملہوترہ صاحب کے بارے میں مختلف لوگوں سے پوچھا مگر کوئی نہ بتا سکا ہم نے سب حوالے گنوا دیے مگر بات نہ بنی ایک حوالہ اور دیا جو کامیاب رہا۔ ہم نے کہا وہ ملہوترہ صاحب جنھوں نے بڑے بڑے کتے پال رکھے ہیں۔ ایک نوجوان نے کہا مہاراج آپ نے خوامخواہ اتنا وقت ضائع کیا انبالہ کے لوگ ملہوترہ صاحب کو کتوں ہی کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔ ہم تانگوں میں سوار ہو کر چار بجے ملہوترہ صاحب کے بنگلہ پر پہنچے۔ دروازہ پر کال بیل نہیں تھی۔ بہت آوازیں دیں مگر کون سنتا ہے۔ یہ بھی خوف تھا کہ ملہوترہ صاحب کے بڑے بڑے کتے کہیں ہمارا استقبال نہ کریں۔ ایک نوجوان بڑا جی دار تھا وہ بنگلے کے اندر کود گیا۔ کتے بنگلے کے عقب میں بندھے ہوئے تھے۔ نوجوان نے برآمدے میں لگی کال بیل دبا دی۔ ملہوترہ صاحب باہر آئے۔ معذرت کرنے لگے کہ آپ لوگوں کے آنے کی کوئی اطلاع ہی نہیں تھی۔ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہنے لگے جناب! میں نے تو زندگی میں صرف دو سے محبت کی ہے شاعروں سے اور کتوں سے۔ اس جملے پر بھی ان کو معذرت کرتے سنا گیا۔ کتوں کے علاوہ ملہوترہ صاحب کے دو حوالے اور بھی ہیں وہ تاجر ہیں اور شام بہار ٹرسٹ انبالہ کے مشاعرے کے آرگنائزر ہیں مگر انبالہ والے نہ جانے ان حوالوں سے کیوں بے خبر ہیں۔

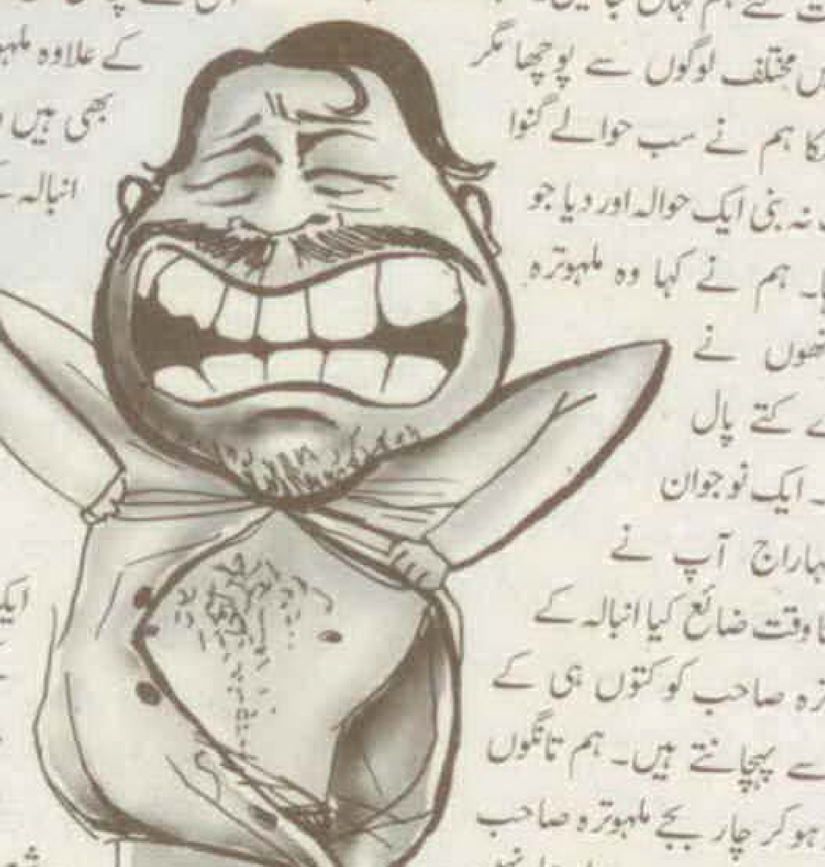

سی ڈی آنند

اٹاری ریلوے اسٹیشن پر کسٹم کے ایک افسر سی ڈی آنند سے جو جموں کے رہنے والے ہیں اور مرہٹہ ہیں ملاقات ہوئی۔ شعر و سخن کے دلدادہ اور شعرا کے چاہنے والے پاکستانی شعرا کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ انھوں نے اٹاری اسٹیشن پر ہمارا بڑا خیال رکھا۔ اٹاری اسٹیشن پر کئی گھنٹوں تک رکنا پڑتا ہے۔ آنند صاحب نے ہمیں

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کئی دلچسپ واقعات سنائے ایک واقعہ آپ بھی سنیے۔

آنند صاحب نے بتایا کہ وہ گھر پر نہیں تھے ان کے ایک ملنے والے آئے تو ان کی چھوٹی بیٹی نے ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ انھوں نے پوچھا بیٹی یہ بتاؤ سی ڈی کس کا مخفف ہے تو بچی نے کہا سی فار کیٹ ڈی فار ڈاگ۔

مشتاق احمد یوسفی کی گلفشانیاں

نیویارک کے ممتاز شاعر جناب مسرور جاوید کراچی آئے تو معروف شاعرہ ذکیہ غزل نے اپنے مکان پر ان کے اعزاز میں ظہرانے کا اہتمام کیا۔ جناب مشتاق احمد یوسفی' جناب سجاد میر اور پیرزادہ قاسم کے علاوہ دیگر شعرا بھی موجود تھے۔ میں نے یوسفی صاحب کو بتایا کہ دسمبر میں منعقد ہونے والی

عالمی طنز و مزاح کانفرنس کے کچھ مندوبین کے لیے ہوائی جہاز کے ٹکٹ خریدے جائیں گے اور کچھ کے لیے ریل گاڑی کے۔ یوسفی صاحب نے فرمایا اور کچھ کے لیے مال گاڑی کے جس کی بلٹی آپ خود چھڑائیں گے۔

یوسفی صاحب کی مزید گوہر فشانیاں

میں نے یوسفی صاحب کو بتایا کہ ہندوستان میں ایک شاعر ہر مشاعرے میں پرانی قمیص پہن کر جاتا اور غزل پڑھتے ہوئے جوش میں آ کر قمیص پھاڑ دیتا تو منتظمین مشاعرہ کو اس کے بدلے شاعر کو نئی قمیص دینا پڑتی اس طرح وہ مشاعروں سے اچھی خاصی تعداد میں نئی قمیصیں جمع کر لیتا۔ یوسفی صاحب نے کہا قاسمی صاحب! اگر اُس شاعر کو آپ کی قمیص دی جاتی تو وہ کیسے پہنتا اور اُسے لے کر کیا کرتا۔

یوسفی صاحب نے بتایا

مشتاق احمد یوسفی صاحب نے گفتگو کے دوران ایک واقعہ سنایا کہ وہ اور ان کا صاحبزادہ محلے کی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرنے گئے۔ یوسفی صاحب اس وقت مسجد میں داخل ہوتے تھے جب امام صاحب خطبہ پڑھ چکتے اور نماز شروع ہونے لگتی۔ اس روز امام صاحب نے یوسفی صاحب کو دیکھ کر کہا بعض جہنمی لوگ جمعہ پڑھنے اس وقت مسجد میں داخل ہوتے ہیں جب میں وعظ کر چکتا ہوں۔

سورۃ یٰسین

پاک لینڈ سیمنٹ کے عالمی مشاعرے میں ایک سامع لیٹ کر مشاعرہ سنتا رہا۔ صبح چھے بجے خمار بارہ بنکوی اپنا کلام سنانے آئے۔ راقم نظامت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ خمار صاحب سے کہا آپ ایسی غزل سنائیں کہ یہ لیٹا ہوا شخص اُٹھ کر بیٹھ جائے۔ خمار صاحب نے کہا قاسمی صاحب! آپ غزل کی بات کر رہے ہیں میں تو اس کے لیے سورۃ یٰسین پڑھنے والا ہوں۔

پاگل کو داد

دبئی کے عالمی مشاعرے میں پاگل عادل آبادی غزل سنا رہے تھے اور مشاعرہ لوٹ رہے تھے۔

جن کے ہاتھوں پہ ہے گھڑی سیکو
وہ نہیں جانتے بجا کیا ہے

راغب مراد آبادی کمپیئرنگ کر رہے تھے انھوں نے برجستہ کہا:

داد پاگل کو تم جو دیتے ہو
عقلمندو! تمھیں ہوا کیا ہے

سلیم احمد کے آخری ایام

نسیم حجازی کے تاریخی ناول کی ڈرامائی تشکیل اسد

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

محمد خان اور جناب سلیم احمد (سلیم بھائی) کی کاوشوں کا نتیجہ تھی اس کے پروڈیوسر محسن علی تھے۔ ٹی وی کے لیے اس ڈرامے میں میرا عیسائی گورنر کا کردار تھا۔ ایک روز میں جناب سلیم احمد سے اُن کے گھر واقع انچولی ملنے گیا تو وہ لحاف اوڑھے تکیے پر کتاب رکھے مطالعہ میں مصروف تھے۔ علیک سلیک کے بعد میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند ہی منٹ میں سلیم بھائی خراٹے لینے لگے۔ ان کے گھر سے ایک بچی خراٹوں کی آواز سن کر یہ سمجھی کہ کمرے میں دوسرا کوئی نہیں ہوگا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی مجھے بیٹھے دیکھا تو واپس صحن میں یہ کہتے ہوئے بھاگی۔ امی کمرے میں ایک صاحب بیٹھے ہیں اور ابو سو رہے ہیں۔ میں اُٹھ کر آ گیا۔ اس کے بعد ریڈیو پاکستان کراچی میں جناب قمر جمیل کے ساتھ ان سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ کبھی کمرے میں کبھی کینٹین میں۔ وہ گفتگو بھی کرتے رہتے اور دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں کو رگڑتے ہوئے ملتے بھی رہتے۔ بے چینی اور بے قراری ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ یہ دیکھتے ہوئے میں نے ایک روز قمر جمیل صاحب سے کہا مجھے ایسا لگتا ہے کہ سلیم بھائی زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتے۔ انھوں نے پوچھا تم نے کس بات سے یہ اندازہ لگایا۔ میں نے کہا ان کی بے چین طبیعت سے۔ آخر وہی ہوا سلیم بھائی چند روز بعد اللہ کو پیارے ہوگئے۔

ضیائے حق

جنرل محمد ضیاء الحق ایک شریف النفس حکمران تھے میں نے سو شعرا سے ان کی تعریف میں نظمیں لکھوا کر کتابی شکل میں ''ضیائے حق'' کے عنوان سے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ لیفٹیننٹ جنرل مجیب الرحمٰن جو اس وقت سیکرٹری اطلاعات و نشریات تھے اور راجہ ظفر الحق کو جو وزیر اطلاعات و نشریات تھے کتاب کا مسودہ دکھایا۔ دونوں حضرات نے کہا کہ کتاب ضرور شائع کریں مگر جنرل محمد ضیاء الحق اپنی تعریف پسند نہیں کرتے۔ خیر کتاب شائع ہوگئی۔ میں نے کتاب کا ایک نسخہ جنرل محمد ضیاء الحق کو ارسال کر دیا جس کا کوئی جواب نہ آیا حالانکہ جنرل صاحب کئی بار مجھے ذاتی طور پر خط لکھ چکے تھے۔ کچھ عرصے بعد اسلام آباد میں اہلِ قلم کانفرنس منعقد ہوئی۔ وہاں جناب غلام اسحٰق خان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کیا آپ نے یہ کتاب جنرل صاحب کو بھیجی تھی میں نے کہا ہاں بھیجی تھی مگر رسید نہیں ملی۔

غلام اسحٰق خان صاحب نے کہا سامنے جنرل صاحب کھڑے ہیں ان کو آپ خود ایک نسخہ پیش کریں میں نے کہا یہ مناسب نہ ہوگا کیونکہ ایک نسخہ پہلے ہی میں ان کو ارسال کر چکا ہوں۔ غلام اسحٰق خان صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جنرل صاحب کے پاس لے گئے۔ جنرل صاحب نے کتاب میرے ہاتھ میں دیکھ لی اور مجھ سے کہا قاسمی صاحب! آپ کی کتاب مجھے مل چکی ہے۔ آپ نے یہ اچھا کام نہیں کیا۔ آپ اس کے بجائے میرے رسولؐ کی نعت شائع کرتے تو مجھے خوشی ہوتی۔ میں ایک گنہگار انسان ہوں اور اس تعریف کا مستحق نہیں ہوں۔ یہ سن کر میں سکڑ گیا اور وہیں اُلٹے پاؤں پلٹ گیا۔

قتیل شفائی اور جنرل ضیاء الحق

اہل قلم کانفرنس میں جنرل محمد ضیاء الحق افتتاحی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تقریر کر رہے تھے۔ قتیل شفائی میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے تھے اور جنرل صاحب کو بے نقط سنا رہے تھے۔ میں نے منع کیا مگر وہ باز نہ آئے۔ کھانے کے پنڈال میں لوگ باری باری جنرل صاحب سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ وہاں میں نے دیکھا کہ وہی قتیل شفائی صاحب

جو کچھ دیر پہلے جنرل صاحب کو گالیاں دے رہے تھے اُن کے سامنے جھک کر سلام کر رہے تھے۔ جنرل صاحب نے قتیل صاحب سے پوچھا میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔ قتیل صاحب نے کہا میں آپ کو آپ کے دفتر میں ملنا چاہتا ہوں۔ جنرل صاحب نے کہا آج رات کو ہوٹل سے ایوان صدر کی گاڑی آ کر آپ کو لے جائے گی۔ طفیل ہوشیار پوری کی خواہش پر ان کے لیے نو بجے گاڑی آئے گی۔ ضیاء الحق صاحب سے مل کر رات کو جب یہ دونوں حضرات واپس آئے تو طفیل ہوشیار پوری نے مجھے بتایا کہ ضیاء الحق صاحب نے ان کی بیٹی کی شادی کے لیے سونے کے زیورات کے سیٹ دیے ہیں مگر قتیل شفائی صاحب نے کچھ نہ بتایا مگر ضیا صاحب کے انتقال کے بعد انھوں نے ضیا صاحب پر کئی الزامات لگائے ان کو بلیک میلر بھی کہا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

زبانیں چاٹ جائیں گی

اہل قلم کانفرنس اسلام آباد میں احمد فراز میرے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے اور بڑے غور سے تقریریں سن رہے تھے۔ کوئی اردو زبان کے حق میں بولا کوئی سندھی کی وکالت کرنے لگا اور کوئی پشتو کی۔ احمد فراز اپنی سیٹ سے اُٹھے اور بلند آواز میں کہا یہ زبانیں تمھیں چاٹ جائیں گی۔

واجدہ تبسم سے ملاقات

بمبئی کی ایک تقریب میں محترمہ واجدہ تبسم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ سو میں، مخمور سعیدی اور امیر قزلباش ان کے گھر پہنچ گئے۔ واجدہ تبسم اس وقت غسل خانے میں کپڑے دھو رہی تھیں۔ ہمارے آنے کی خبر سنتے ہی بھیگے کپڑوں ہی میں وہ ڈرائنگ روم میں آ کر ملیں اور چند لمحوں کی رخصت چاہی۔ ان کے شوہر اور وہ ہمارے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مخمور سعیدی صاحب نے کوٹ کی جیب میں سے بوتل نکالی اور میڈم سے کہا دو گلاس پانی منگوا دیجیے۔ میڈم نے کہا بھائی! یہ سلسلہ یہاں نہیں چلے گا۔ یہاں اس گھر میں قرآن کی تلاوت ہوتی ہے نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ مخمور سعیدی صاحب نے معذرت کی اور بوتل واپس جیب میں ڈال لی۔ رات بارہ بجے تک ہم باتیں کرتے رہے۔ جب ہم اپنی گاڑی میں بیٹھنے لگے تو میڈم نے کوئی دعا پڑھ کر ہم پر پھونکی۔ میں نے پوچھا تو بولیں کہ جب میرا کوئی مہمان رخصت ہونے لگتا ہے تو میں اس کے لیے عافیت کی دعا کرتی ہوں۔

میڈم نے مجھے اپنی کتابیں بھی دیں اور ان پر لکھا ضیاء الحق قاسمی کے ساتھ گزرے ہوئے چند لمحات زندگی بھر یاد رہیں گے۔

ٹیپو سلطان کی تلوار

میں اسکاٹ لینڈ گیا تو ڈاکٹر شفیع کوثر صاحب کے ہاں ٹھہرا۔ میں نے ان سے فرمائش کی کہ ایڈنبرا کے ایک بہت پرانے قلعے میں سلطان ٹیپو شہید کی تلوار محفوظ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ہے میں اس کی زیارت کے لیے جانا چاہتا ہوں۔ گلاسکو سے ایڈنبرا ڈیڑھ سو کلومیٹر کی مسافت پر ہے۔ ہم وہاں پہنچے تو بارش ہو رہی تھی۔ قلعہ بہت بلندی پر تھا اور بڑا وسیع و عریض۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ کمرا مل گیا جہاں شیشے کے ایک شوکیس میں اس مجاہد کی تلوار رکھی تھی۔

تلوار تک تو میری رسائی مشکل تھی لہٰذا میں نے شوکیس کے شیشے ہی سے اس کا بوسہ لیا۔ ایک انگریز جوڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا آپ نے تلوار کا بوسہ کیوں لیا؟ میں نے کہا یہ ہمارے اس مجاہد کی تلوار ہے جس کا قول تھا ''گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے''یہ تلوار شہید سلطان نے سرنگا پٹم کے آخری معرکے میں استعمال کی تھی اس کے دستے پر آیاتِ قرآنی کندہ ہیں۔

چار سو محدثین کے مزارات

ایوان غالب دہلی کے عقب میں ایک بہت بڑا قبرستان نظر آیا۔ ساتھ ہی ایک مدرسہ' مسجد اور مکانات بنے ہوئے تھے۔ ہم اندر چلے گئے تو مدرسے کے مہتمم صاحب سے ملاقات ہوئی بڑی محبت سے پیش آئے۔ ''اس قبرستان میں چار سو محدثین کی قبریں موجود ہیں۔'' تنویر سپرا نے کہا۔

قبرستان میں اردو کے عظیم شاعر مومن خان مومن کی قبر بھی ہے۔ ہم ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے بعد کافی دیر تک رکے رہے۔ تنویر سپرا نے کہا کیا ان محدثین کے ساتھ مجھے اپنی قبر کے لیے کچھ جگہ نہیں مل سکتی؟ ہم نے کہا تم ابھی مر کے دکھاؤ ہم مہتمم صاحب سے سفارش کر کے تمہیں یہیں دفنا کر واپس جائیں گے۔ شہدا کے مزاروں میں یہاں شاہ اسمٰعیل شہید کا مزار بھی ہے۔ شاہ کی تحریک میں مومن خان مومن نے بھی عملی حصہ لیا تھا۔

سسی کا شہر بھنبھور

نیشنل ہائی وے پر اسٹیل ملز کے قریب بھنبھور شہر کے کھنڈر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کھدائی کے دوران بھنبھور شہر منظر عام پر آیا جو رومانوی کردار سسی کے نام سے مشہور ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ کچھ دیر وہاں رکے اور میں با آواز بلند یہ پنجابی گیت گاتا رہا۔

تیرا للیا شہر بھنبھور نی سستیے بے خبرے

وہ سؤر کھا گیا

لندن جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لیے ہمارا جہاز ماسکو ائیرپورٹ پر رکا۔ چند پاکستانی مسافر ایک میز پر ناشتے کے انتظار میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک صاحب ڈاڑھی والے شیروانی پہنے ٹوپی اوڑھے ہوئے لطیفہ گوئی کے دوران ایک لطیفے پر سخت ناراض ہو گئے کہ آپ لوگ گندے لطیفے کیوں سناتے ہیں۔ لطیفہ سنانے والے نے معذرت چاہی۔ تھوڑی دیر بعد ناشتا آ گیا تو اس میں تلے ہوئے انڈے کے ساتھ سؤر کے گوشت کی ٹکیہ بھی تھی۔ سب لوگوں نے یہ ناشتا واپس کر دیا مگر ایک لطیفے پر اعتراض کرنے والا شخص وہ ناشتا ہڑپ کر گیا۔ اس کی یہ حرکت میں برداشت نہ کر سکا اور اُسے بے نقط سنا دیں۔ کہنے لگا میں 32 سال سے لندن میں رہ رہا ہوں۔ اس سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہوں۔ میں نے کہا تم منافق ہو مسلمانوں والا حلیہ بنا کر لوگوں کو دھوکا دے رہے ہو۔ ایک شخص تو اتنے غصے میں آ گیا کہ اس کو مارنے لگا مگر ہم نے سمجھا بجھا کر اسے الگ کر دیا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بلب کا موجد

بچپن میں ہمارے گھر میں پہلی بار بجلی کا بلب روشن ہوا تو میں نے اپنے والد محترم سے پوچھا۔ بلب کس کی ایجاد ہے تو معلوم ہوا کہ ایک امریکن مسٹر ایڈیسن نے بلب ایجاد کیا ہے۔ بڑے ہوئے تو امریکا جانا ہوا۔ نیویارک کے قریب ایڈیسن سٹی گیا۔ ایڈیسن کی لیبارٹری دیکھی اور اس کا مکان بھی۔ میں نے کہا ایڈیسن! تو نے دنیا

کو روشنی عطا کی میں تمہیں خراج تحسین پیش کرنے آیا ہوں مگر واپڈا کا فاتحہ بھی پڑھوں گا جس نے ہم سے وہ روشنی چھین لی۔

حیدر آباد دکن میں پذیرائی

ممتاز مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین اور ڈاکٹر مصطفیٰ کمال مدیر ماہنامہ ''شگوفہ'' کی دعوت پر میں حیدر آباد دکن گیا تو وہاں کے تمام احباب نے میری بڑی پذیرائی کی۔ انجمن ترقی اردو دکن کے زیر اہتمام میرے اعزاز میں ایک ادبی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ ادب سے تعلق رکھنے والی تمام شخصیات نے اس میں شرکت کی۔ میں نے اپنی تقریر میں وہاں کے مزاح گو شعرا کی خدمت میں گزارش کی کہ وہ اپنے تخلص میں جدت پیدا کریں۔ جھانپڑ' بمبوٗ' بمباٹ' کھمبا، والذابا جیسے تخلص بدل لیے جائیں تو اچھا ہے۔ اس مخلصانہ مشورے کو کسی نے قبول نہ کیا بلکہ دوسرے روز معلوم ہوا کہ تمام شعرا اس بات پر ناراض ہو گئے۔

دو لڑکیوں نے مجھے اپنا خون دیا

میرا بائی پاس آپریشن جب ہو چکا تو ڈاکٹر نے میرے عزیز و اقارب سے کہا آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ آپ کا مریض ٹھیک ہے۔ میری بیگم وہیں رہیں۔ اچانک ایک ڈاکٹر نے آ کر کہا کہ مریض کے اندر بلیڈنگ شروع ہو گئی ہے۔ دوبارہ اوپن کریں گے اور اس کے بعد اسے خون دینا پڑے گا۔ دو گجراتی سپیکنگ لڑکیاں اسپتال میں کسی مریض کو دیکھنے آئی ہوئی تھیں۔ انھوں نے بلڈ ڈونیشن کی آفر کی۔ بلڈ گروپ مل گیا اور مجھے خون چڑھا دیا گیا۔ ہمارے ایک دوست نے ازراہ مذاق ڈاکٹر صاحب سے پوچھا، یہ خون چڑھنے کے بعد قاسمی صاحب کہیں گجراتی زبان تو بولنا شروع نہیں کر دیں گے۔

بمبئی میں یوسف ناظم سے ملاقات

میں روزنامہ ''انقلاب'' کی پچاسویں سالگرہ کے سلسلے میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں شرکت کے لیے بمبئی گیا تو ممتاز مزاح نگار جناب یوسف ناظم مجھے میری اقامت گاہ پر ملنے کے لیے تشریف لائے۔ یوسف ناظم صاحب انتہائی خاموش طبع واقع ہوئے ہیں مگر جب کوئی لطیفہ سناتے ہیں تو محفل زعفران زار ہو جاتی ہے۔ انھوں نے ایک لطیفہ مجھے بھی سنایا۔

''ایک مولوی صاحب نے ایک کتاب لکھی جس کا عنوان تھا ''استنجے کرنے کے چالیس طریقے'' مولوی صاحب نے ایک پبلشر سے پوچھا اگر یہ کتاب شائع کی جائے تو کیا فروخت بھی ہو گی؟ پبلشر نے کہا ''یقیناً بکے گی بشرطیکہ باتصویر ہو۔''

کسی کو سزا دینا بہت مشکل ہے

قرآن شریف حفظ کرنے کے دوران بچپن میں' میں نے اساتذہ سے بہت مار کھائی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مجھے ہر قسم کے تشدد سے نفرت ہو گئی۔ میں نے اپنے کسی بچے کو کبھی ہلکا سا تھپڑ بھی نہیں مارا۔ البتہ ان لوگوں کی خوب پٹائی کی جو اپنی بے گناہ بیویوں پر ظلم کرتے ہیں یا وہ لوگ جو سڑک پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کے بعد ڈھیلا استعمال کرتے ہیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

نعیم صدیقی

مشینی دور کی اولاد

2258ء کا عالمی منظر نامہ، امریکا کی سیاحت کرنے والے ایک فکری مسافر کی ڈائری سے

ممتاز شاعر اور دانشور نعیم صدیقی مرحوم کی 70 سال قبل لکھی گئی ایک حیرت انگیز تحریر جو ناقابلِ یقین لگتی ہے

5 جولائی:

ریڈیو کے ذریعہ کل پروفیسر ویلار کی ایک اہم تقریر براڈ کاسٹ کی گئی۔ آپ نے کئی لائبریریاں کھنگالنے کے بعد یہ تحقیق پیش کی ہے کہ بیسویں صدی ہی سے عورتوں میں بچے پیدا کرنے کے خلاف رجحانات پھیل گئے تھے اور ان رجحانات کا اظہار

1944ء میں نعیم صدیقی کا طنزیہ و مزاحیہ تحریروں کا ایک مجموعہ 'ذہنی زلزلے' کے نام سے حیدر آباد (دکن) کے علمی و ادبی ادارے ''دارالاشاعت نشاۃِ ثانیہ'' نے شائع کیا تھا۔ 'ذہنی زلزلے دلچسپ افسانوں، ڈراموں اور مضمونوں کا مجموعہ تھا۔ ایک منتخب تحریر 'کیمیائی تناسل' یہاں شائع کی جارہی ہے، جس کے اوپر یہ نوٹ لکھا ہوا تھا:

''2258ء کے امریکا کی سیاحت کرنے والے فکری مسافر کی ڈائری کے چند اوراق۔''

مضمون پڑھتے ہوئے اس بات کا خیال رکھیں کہ اُس وقت جب یہ مضمون تحریر کیا گیا، صورتِ حال یہ تھی کہ جرمنی کے ہٹلر نے نعرہ لگایا تھا کہ جرمن نسل دنیا کی سب سے بہترین نسل ہے باقی سب نسلیں گھٹیا قسم کی ہیں، جرمنی تمام بڑی بڑی یورپی اقوام اور امریکا کے خلاف تھا۔ جاپان بھی جرمنی کا ہم خیال تھا اور انڈیا برطانیہ کا غلام تھا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مختلف ریزولیوشنز سے ہوتا ہے جو اس زمانہ کی زنانہ انجمنوں نے پاس کیے۔ نیز اس عہد کا لٹریچر بھی بتاتا ہے کہ عورت ارتقا کے فطری راستہ پر پڑ چکی تھی۔ پروفیسر مذکور نے برتھ کنٹرول کے قدیم آلات اور مروجہ دواؤں اور طریقوں پر جو بصیرت افروز بحث کی ہے اسے سن کر آدمی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر موصوف نے جس محنت سے بچہ کشی کے واقعات کو دو تین سو سال پہلے کے لٹریچر سے تلاش کیا ہے وہ قابل رشک ہے۔

پیٹ میں بچے کو پرورش دینا بھی کتنی مضحکہ انگیز حماقت تھی۔ انسان کی مادہ اس عہد میں بھی اس مصیبت کا شکار تھی۔ پروفیسر مذکور نے بتلایا ہے کہ دور جاہلیت میں بچہ پیدا کرنے کا جو حیوانی طریقہ رائج تھا اس سے عورتوں کے چہرے زرد ہوجاتے تھے، وہ سوا نو مہینے کا عرصہ محض ایک بچہ کی وجہ سے مستقل بیماری اور مسلسل تکلیف کی حالت میں کاٹتی تھیں، پھر دو سال تک چھاتیوں سے دودھ پلانے کا گھناؤنا کام کرتی تھیں۔ ان مشاغل لطیفہ کی وجہ سے وہ تمدن کی کوئی دوسری بہتر خدمت سرانجام نہیں دے سکتی تھیں اور اس کا معاوضہ کیا ہوتا تھا؟ ایک لفظ...... ''ماں'' اور کم فہم عورت اسی سے سرشار تھی۔

7 جولائی:

آج ایک فلم دیکھنے میں آئی۔ سنیما ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ پرانے زمانہ کا انسان کس طرح پیدا ہوتا تھا۔ استقرار حمل، جنین کا مختلف مدارج ارتقا طے کرنے، وضع حمل، بچے کی ابتدائی زندگی، چس چس کرکے دودھ پینا، جونک کی طرح ماں سے لپٹے رہنا، گندگی پھیلاتے پھرنا۔ یہ سارے مناظر بہت منظم طریقے سے دکھلائے گئے۔ اس سلسلہ میں عورت اور بچہ کی زندگی جس طرح بسر ہوتی تھی اسے عبرت کے لیے پیش کیا گیا۔

15/اگست:

آج ٹاؤن لائبریری سے حاصل کی ہوئی کتاب ''انسان کی پیدائش'' پڑھنے سے معلوم ہوا کہ دور حیوانی اور موجودہ دور انسانی کی درمیانی کڑی 2002ء سے 2026ء تک کا زمانہ ہے جبکہ دنیا کی سب سے بڑی عورت ایلاسکا نے ایک عالمگیر زنانہ تنظیم کے بل پر عورتوں کو مردوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کردیا۔ ان چند سالوں میں صرف دنیا کے تاریک حصص اور جرمن علاقہ کی عورتوں نے بچے جنے جن کی عالمگیر شرح پچھلے سالوں کے مقابلہ میں 78 فیصد کم تھی۔ آخر 2 فروری 2026ء کو عالمگیر انجمن ذکور اور ''مجلس اناث'' کے درمیان ایک عہد نامہ قرار پایا جس کی رو سے عورتوں نے عمر بھر میں ایک بچہ پیدا کرنے کی ذمہ داری ان شرائط پر قبول کرلی:

1۔ بچوں کی پرورش، نگہداشت اور تربیت کا کام حکومت سرانجام دے گی اور عورت بچہ پیدا کرنے کے بعد اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوجائے گی۔

2۔ عورت استقرار حمل سے لے کر زچگی کی حالت سے نکلنے تک حکومت سے اتنا وظیفہ حاصل کرنے کی حقدار ہوگی جس سے وہ اپنے معیار زندگی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی ضروریات فراہم کرسکے اور اپنی صحت کی نگہداشت کرسکے۔

3۔ ایک سے زیادہ بچہ پیدا کرنے والی عورت کے لیے شرط نمبر ایک اور دو ساقط ہوگی۔

ان شرائط کے طے ہوجانے سے توالد وتناسل کا سلسلہ تو چل نکلا لیکن یہ اتنا مہنگا پڑا اور باوجود صرف زرکثیر کے اتنی کم نسل حاصل ہوسکی کہ اقوام کی عددیت

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کا دیوالہ نکلنے لگا اور مختلف اداروں کو چلانے کے لیے کارندے نایاب ہونے لگے۔
سائنس کی توجہات اس مسئلہ پر مرتکز تو تھیں ہی، 2051ء میں امریکن پروفیسر مسٹر ایلفاری نے شیشے کے مرتبان میں انسانی نطفہ کو بچہ کی شکل میں تبدیل کرنے کا کامیاب طریقہ دریافت کرلیا۔ اور 2070ء میں پہلا باقاعدہ کارخانہ انسان سازی امریکا میں قائم ہوا۔ کارخانہ کے ساتھ ایک عالمگیر ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی بنیاد رکھی گئی، جس کی تحقیقات نے کیمیائی توالد و تناسل کے فن کو موجودہ منزل پر پہنچایا ہے۔ اس فن کو دنیا کے تمام آزاد ممالک میں فروغ ہو چکا ہے، بجز جرمنی کے جو دور وحشت کو آج دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے۔

29 اگست:

آج ہم ویٹل کے عظیم ترین کارخانہ بچہ گری کی سیر کو گئے۔ سب سے پہلے ہمیں وہ ہال دکھایا گیا جہاں امتحانی نلیوں اور رنگین بوتلوں میں قسم قسم کے انسانی نطفے محفوظ تھے اور نمبروں کے ساتھ ان کے متعلق ضروری کوائف ایک رجسٹر میں درج تھے کہ یہ فلاں آدمی سے حاصل کیا گیا ہے۔ وہ فلاں نسل سے ہے۔ اس کی دماغی حالت ایسی ہے۔ اس کا قد اور وزن اتنا ہے، اس کی ریکارڈ بک میں فلاں فلاں بیماریوں کا اندراج ہے وغیرہ۔ کسے معلوم کہ ان ٹیوبوں میں دو ٹنگے جانوروں کا ایک سیلاب بھرا ہوا ہے۔ کیونکہ ایک مرد کے یکبارگی نطفہ میں کئی لاکھ کیڑے ہوتے ہیں، جو "آدمی بننے" کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کیڑوں فراہمی کے لیے ایک مستقل سرکاری محکمہ موجود ہے۔ شہروں میں جگہ جگہ ان کو خریدنے والی دکانیں کھلی ہیں۔ یہ دکانیں دُہرا کاروبار کرتی ہیں۔ ایک تو صنفی خواہش کو بجھانے کے لیے مرد و عورت دونوں کے لیے ان کے پاس سائنٹیفک آلات ہوتے ہیں۔ ان آلات کے ذریعہ انسان نہایت مہذب طریقہ سے اپنی فطری ضرورت پوری کرتا ہے۔ آج کل مرد و عورت کے درمیان وہ جانوروں کا سا عمل واقع نہیں ہوتا جس سے دور جاہلیت کی طرح بچے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ دوسری طرف یہ دکانیں انسان پیدا کرنے والے کارخانوں کو مادۂ تولید فراہم کرتی ہیں۔ نیز عورتوں کا آپریشن کرکے ان کے "بیضے" بھاری قیمتوں پر خریدتی ہیں۔
پھر ہم نے ویٹل کا دوسرا ہال دیکھا، جہاں مرتبانوں میں مختلف مدارج کے جنین چپکے چپکے زندگی کا سفر طے کر رہے تھے۔ انہیں ربڑ کی باریک نلیوں کے ذریعہ ضروری جوہر بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ پھر ہمیں تربیت گاہ میں لے جایا گیا۔ جہاں ہر بچہ کو (مرتبان سے نکلنے کے بعد) پہلے دو سال بسر کرنے ہوتے ہیں۔ یہاں بچے کو ایسی سیال غذا خارجی طور پر دی جاتی ہے کہ فضلہ پیدا نہیں ہوتا۔ معدے اور آنتوں کو برسرِ عمل رکھنے کے لیے جو دوائیں اندر دی جاتی ہیں وہ ایک مشین کے ذریعہ خارج کرلی جاتی ہیں۔ بہرحال پرورش کنندگان کو کسی طرح بھی گندگیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔
پھر دکھایا گیا کہ کس طرح تربیت گاہ سے نکل کر بچہ تعلیم گاہ میں جوان ہوتا ہے۔ تعلیم گاہ کئی حصوں میں منقسم ہے اور بجائے خود ایک شہر ہے۔ ہر حصے میں ایک نطفہ کی بعد پیدائش تربیت کی جاتی ہے۔ پھر مختلف کاموں کے لیے ایک ایک کھیپ کو کئی ٹولیوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ سولہ سال کی عمر میں بچہ تعلیم گاہ سے فارغ ہوکر تمدن کی خدمت انجام دینے میں لگ جاتا ہے۔
اس کارخانہ سے ہر روز اوسطاً پانچ انسان خریداروں کے ہاتھ بیچ دیے جاتے ہیں اور شاید اسی کارخانہ کی جنس سب سے گراں ہے۔ کیونکہ یہ "پائیدار"

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ثابت ہوئی ہے۔ فی انسان پانچ ہزار ڈالر چارج کیے جاتے ہیں۔ اس کارخانہ کی کمیشن ایجنسیاں ہر شہر میں اور ہر ملک میں موجود ہیں۔

ناقص پیدائش کے انسانوں کی ہر مہینے میں ایک دفعہ نیلامی ہوتی ہے اور عموماً ایک ہزار سے زیادہ قیمت نہیں ملتی۔ حکومت غور کر رہی ہے کہ ایسے بچوں کو اوائل ہی میں ہلاک کر دینا چاہیے کیونکہ کارخانے یہ نقصان برداشت کرنے پر تیار نہیں ہیں...... کتنی دلچسپ سیر تھی۔

2 ستمبر:

امریکا کے انسان پیدا آوری کے تحقیقی ادارے نے اپنے سہ ماہی پرچے "رابٹ" میں امریکن "انسان زاد" کارخانوں کے متعلق نہایت دلچسپ معلومات پیش کی ہیں اور بعض کھیپوں کے عجیب حالات ایک نقشہ میں پیش کیے ہیں جو ذیل میں درج ہے:

نام کارخانہ	نمبر کھیپ	کیفیت
1-کراؤن	6448-C	

اس پوری کھیپ کے افراد کی ایک ٹانگ زیادہ لمبی ہے اور ان کو بالکل ہنسی نہیں آتی۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ ٹانگ اگر چھوٹی نہیں ہوسکتی تو کم از کم انہیں ہنسی تو سکھا دی جائے۔

2۔ویسٹل 1702-Q

اس کھیپ کے افراد پیہم چھینکتے رہتے تھے۔ آخر ماہرین کی مسلسل کوششوں سے یہ بیماری دور ہوگئی تھی۔ لیکن اب مختلف خریداروں کی طرف سے پھر چھینکوں کی شکایات آرہی ہیں۔

3۔کالیرا 31/54055

اس کھیپ کے افراد میں مرد اور عورت کے دہرے اعضا موجود ہیں۔

4۔ٹاکولی F041X0

اس کھیپ کے افراد کے دل دائیں طرف ہیں، جگر ناپید ہے اور خون کی جگہ رگوں میں زرد سا ایک سیال رواں ہے۔ یہ لوگ غصہ کی کیفیت سے محروم ہیں۔

رابٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ عمل تقلیم سے انسانوں میں بعض حیوانات کے خواص جمع کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ قد کی کمی بیشی، جلد کے نئے رنگین ڈیزائین بنانے انگلیوں کی تعداد کو گھٹانے بڑھانے اور مختلف اعضا کو چھوٹا بڑا کرنے کے تجربات بہت کامیاب رہے ہیں۔

24 ستمبر:

"لائٹ" نے آج کے ایڈیشن میں بتایا ہے کہ کالیرا کے بین الاقوامی کارخانے نے اس سال کے عرصہ میں 954000573 ڈالر کے انسانی بیج اور بیضے غیر ممالک سے خریدے ہیں اور اس کے مقابل میں 31104690861 ڈالر کے انسان غیر ممالک کو بھیجے ہیں۔ مختلف ممالک کی خریداری کا تناسب یہ ہے:

حبش: 10 فیصد، عرب: 31 فیصد، ہندوستان: 47 فیصد، چین 9 فیصد، فلسطین 2 فیصد، افغانستان: 1 فیصد۔ مغرب کے باقی حصص میں برطانیہ غالب ہے لیکن اب جاپان کامیاب ہو رہا ہے۔ مختلف انسان ساز ممالک میں قیمتوں کا تناسب حسب ذیل ہے، باقی ممالک میں ابھی تک بین الاقوامی کاروبار شروع نہیں ہوا:-

امریکا: 57 فیصد، برطانیہ: 40 فیصد، جاپان 13 فیصد۔ جاپان پر برطانیہ و امریکا کی نو آبادیات میں سو فی صدی کسٹم ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ پھر بھی اس کے انسان سستے بکتے ہیں۔ لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ جاپانی انسان خوشنما رنگوں کی اچھے ڈیزائنوں والی چمڑی سے مزین ہونے کے باوجود سب سے کم عمر ہوتا ہے۔ مختلف ممالک کے انسانوں کی اوسط عمر یہ ہے۔ امریکا 34 سال، برطانیہ 32 سال، جاپان 25 سال۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

امریکن پیداوار کے دانت عموماً جلد گرتے ہیں۔
برطانیہ والوں کا دل ذرا سے صدمہ سے فیل ہو جاتا ہے
اور جاپانیوں کے اعضا بہت جلد ٹوٹتے ہیں۔ بینائی
جواب دے جاتی ہے اور کمر ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔

یکم اکتوبر:

مشینی زنا کی ایک دکان کا سائن بورڈ یہاں نقل کیا
جاتا ہے:

کیراب اینڈ کمپنی

نہایت درجہ ترقی یافتہ آلات۔ نازک اور نرم۔ بجلی
سے ان میں معتدل حرارت اور حسب منشا دباؤ پیدا کیا
جاسکتا ہے۔ آپ کی فطری ضرورت کے لیے۔ (نوٹ)
انثی بیضے اور مادۂ تولید اچھے نرخوں پر خریدے جاتے ہیں۔

ہاں یہ یاد رہے کہ موجودہ دور میں عورت اور مرد کا
اختلاط قانونی طور پر جرم ہے۔ کیونکہ اس طرح بچے پیدا
کرنا سخت خطرناک ہے، عورت کی صحت کے لیے اور
خود بچے کی شرافت نفس کے لیے، نیز اس تعلق سے
انسان حیوان کی سطح پر گر جاتا ہے۔ امراض خبیثہ پھیل
نکلتی ہیں اور مادہ تولید کا کثیر حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔
اس لیے اکثر سرمایہ دار لوگ ضرورت کے آلات خود
خرید لیتے ہیں۔ لیکن عوام دکانوں سے اپنی ضروریات
پوری کرتے ہیں، جو عموماً ہوٹلوں، قہوہ خانوں اور
حجاموں کی دکانوں کا ضمیمہ ہوتی ہے۔

2/اکتوبر:

آج 'لیرا' کے کارخانے کو دیکھنے کی حسرت بھی
پوری ہوئی۔ اس کارخانہ سے اندرون ملک کی ہر طرح
کی مانگیں پوری کی جاتی ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ
یہاں مختلف جانوروں کے جرثومۂ نسلی پر انسانی جرثومہ
کے قلم لگانے میں کامیابی حاصل کی جارہی ہے۔ چند
خاص جوڑ یہ ہیں: بندر + انسان، گدھا + انسان، کوا +
انسان۔ پہلی قسم ریلوے، محکمہ تار، محکمہ برق اور
وغیرہ کے لیے، دوسری قسم گھریلو ملازمتوں اور کارخا
میں خدمات انجام دینے کے لیے اور تیسری قسم
گویے اور چھابڑی فروش بنانے کے لیے تیار کی ج
ہے۔ یہاں پرورش اور تغذیہ کا سلسلہ جدید تحقیقا
بنیاد پر چلتا ہے اور بے شمار قسموں کے انسان تیا
رہے ہیں۔ تنوع جتنا اس کارخانہ نے پیدا کیا اتن
اور سے نہیں ہو سکا۔

آج بچارا منیجر بہت پریشان تھا، کیونکہ تعلیم گاہ
21 نفررات کو کہیں بھاگ گئے ہیں۔ اتفاق سے کمرا
کو کھلا رہ گیا اور چوکیدار سو گئے۔ اب تلاش ہو رہی
ملے ملے، نہ ملے تو ان کا بیمہ تو کارخانہ نے کرا رکھا
ہے۔ قیمت مل جائے گی...... خیر پریشانی کے باوجود
نے کمال مہربانی سے خود ساتھ ہو کر کارخانہ کی سیر کرائی

خاص حصہ وہ ہے جہاں عجیب نوعیت کے جا
تعلیم پا رہے ہیں۔ ان میں وہ بھی تھے جن کی آنکھ
گدی پر لگی تھیں، وہ بھی تھے جو چار ٹانگیں رکھتے
وہ بھی تھے جن کے بازو عام انسانوں سے آدھے
وہ بھی تھے جن کا قد عام وانسانوں سے سوایا تھا
دُمدار بھی تھے۔ منیجر نے بتایا کہ اس نوعیت
جانوروں کی قیمت کچھ زیادہ ہی مل جاتی ہے۔ کیونکہ
ایسے ہیں جو عام انسانوں سے زیادہ مفید خدمات ا
دے سکتے ہیں۔ بقیہ کو تھیٹریکل کمپنیاں اور سرکس وا
خرید لیتے ہیں۔

واپسی پر منیجر صاحب کی میز پر خطوط کی فائل
دیکھی تو بہت دلچسپ پایا۔ بعض کے اقتباسات
میں درج کیے جاتے ہیں:

1- ہم افسوس سے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ
کے بھیجے ہوئے مزدوروں کے پورے گروپ نے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کے ساتھ ہڑتال کر دی ہے۔ اب ہمارا کام رکا پڑا جبکہ پندرہ روز سے کام کی رفتار آدھی ہوگئی تھی۔

ہمارے آرڈر فارم 4437 کو دیکھیے، اس میں نے لکھا تھا کہ جو کارندے آپ سپلائی کریں وہ آپس خاوند پیدا کرنے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں۔ اب ا کرکے یہ گروپ واپس کر لیجیے اور کوئی نیا گروپ، ورنہ ہم عدالتی چارہ جوئی پر مجبور ہوں گے۔

2- ہمیں ایک ایسا ایڈیٹر درکار ہے جو فنِ مزاح کا ماہر ہو۔ اس کا کل وزن 25 سیر ہونا چاہیے اور جلد پر زیبرے کی سی دھاریاں ہوں۔

3 - ٹائپ کرنے کے لیے کوئی ایسی عورت ے، جس کی انگلیاں بہت نازک ہوں۔ اگر بیں ں والی کوئی عورت ہو تو خوب رہے۔ قیمت کا ہ لکھ بھیجیے۔

4- ہمیں اپنے کارخانہ شیشہ سازی کے لیے بیں درکار ہیں، حسب ذیل خصوصیات ان میں ہونی ے۔ (1) معدے چھوٹے ہوں اور بھوک کم لگتی 2) قوت حاسہ کو کیمیاوی طریقے سے کند کر دیا گیا 3) اگر گدھے کے جرثومہ پر انسانی جرثومہ کا قلم لگا ں حاصل کی گئی ہو تو ترجیح دی جائے گی۔

5- کل بذریعہ ریل آپ کا بھیجا ہوا کارندہ واپس ا جائے گا۔ اس کی ساخت میں کوئی عجیب کوتاہی ہے۔ جب بھی لال رنگ کو دیکھتا ہے تو رونے لگتا ر سب کام چھوڑ دیتا ہے۔ ویسے نہایت شریف ہے۔ آپ کو کوئی نہ کوئی گاہک مل جائے گا ہمیں بھیج دیجیے۔ خیال رہے کہ ہمارا منیجر ایسے آدمی کو تا ہے جس کی ناک لٹکی ہوئی ہو۔

ا - محکمۂ پولیس کے آرڈر 314/AAA کے، چالیس سپاہی بھرتی کے لیے مطلوب ہیں۔ ان میں حسب ذیل خصوصیات ہونی چاہئیں:

(1) چھاتی: پچاس انچ (2) قد: سات فٹ (3) ٹانگوں کی لمبائی: چار فٹ (4) بازوؤں کی لمبائی: چار فٹ (5) دماغ: نہایت معمولی درجہ کا (6) آپریشن سے ان کے سینوں میں شکاری کتوں کے دل فٹ کیے گئے ہوں۔

ٹینڈر پندرہ اکتوبر کو لازماً سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر پہنچ جانے چاہئیں۔

7- کیا ہمارے ریڈیو اسٹیشن کو آیندہ دس دن میں آپ ایک ایسا آدمی سپلائی کر سکیں گے جو جرمن زبان جانتا ہو اور خرگوش کی سی قوت سماعت رکھتا ہو۔ قیمت سے آگاہ کیجیے اور فوری اطلاع دیجیے۔

8- کارخانہ کے مال کی مفصل فہرست اور ایجنسی کی شرائط سے اطلاع دیجیے۔

9- آپ کی فرم نے گم شدہ گروپ کا جو اشتہار ستمبر میں دیا تھا۔ اس کی اُجرت میں سے آٹھ ڈالر آپ کے ذمہ ہیں۔ کب تک نوازش کیجیے گا؟

3/اکتوبر

کیا خوب لڑائی تھی۔ سربازار دو نوجوانوں کی جھڑپ ہوگئی۔ ایک کہتا تھا تجھے معلوم ہے میں "برٹش میڈ" ہوں اور دوسرا آنکھیں دکھا رہا تھا۔ گاؤدی میں ہوں "اٹالین میڈ" میری ماں امتحانی نلی 6/7 تھی۔ جس میں لا مثال انسانوں نے پرورش پائی ہے۔ پہلا بولا تجھے خبر ہے کہ میرا مادۂ تولید جرمنی سے آیا تھا۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے انہیں الگ کیا۔

6/اکتوبر

وینٹل کا ایک اشتہار نقل ہے جو آج ہی کے پرچہ میں نکلا ہے:

ہر کام کے لیے بہتر کارندے، مضبوط، کم خور، پائیدار اور سستے۔ حسب منشا حاصل کرنے کے لیے وینٹل

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کو یاد رکھیے اور لیتے وقت پشت پر ویٹل کا نشان ضرور دیکھ لیجیے۔

لیجیے یسرا کا اشتہار بھی ہے اور خوب ہے:

انسانی خوبیوں کو جمع کرنے کی سائنس کو لیرا نے اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ تیسویں صدی کی عجیب و غریب مخلوقات لیرا ابھی پہنچا رہا ہے

14/ اکتوبر

عدالت میں آج صنفی مقدمہ بڑی مدت کے بعد پیش ہوا۔ مدعیہ کہتی تھی کہ ملزم نے مجھ پر جبر کیا ہے اور میری مرضی کے خلاف مجھے حمل قرار پا گیا ہے۔ مرد نے اقبالِ جرم کرلیا کہ میں تنہائی میں اس پر نظر ڈالتے ہی بے بس ہوگیا۔ اس پر ہر طرف سے شیم شیم کی آوازیں بلند ہوئیں اور اس جوڑے کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا کہ ظالموں نے تہذیب کی ناک کاٹ ڈالی۔ عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ عورت فوراً سرکاری ہسپتال میں جا کر اپنا حمل ساقط کرائے اور بطور جرمانہ اپنے انٹی بیضے حکومت کے حوالہ کردے، اس جرم میں کہ اس نے اپنی حفاظت میں کوتاہی کی۔ مرد کو پانچ سال قید کی سزا دی جاتی ہے۔

15/ نومبر

لیجیے ہولناک خبر۔ ہندوستان میں خفیہ کارخانہ پیدائش پکڑا گیا۔ ڈیموکریٹک پارٹی خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ خبر کا پس منظر یہ ہے کہ ایک سو سال پیشتر ہندوستان نے برطانیہ کو تولید کا مادہ بھیجنا شروع کیا اور اس مادۂ تولید سے انسان تیار کروا کر ان کی خریداری شروع کی۔ پچاس سال بعد ہندوستانیوں کو معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ بڑا دھوکا ہوا ہے۔ انہیں جو انسان دیے گئے ان کی ساخت میں معلوم کس حکمت سے کام لیا گیا کہ ایک تو وہ بیماری کو جلد قبول کرتے ہیں۔ دوسرے ان کے د... کام کرتے ہیں لیکن دل گیدڑوں کے سے ہیں، بہت بناتے ہیں اور کرتے کچھ نہیں۔ آپس میں جھگڑتے بہت ہیں اور کسی نقطہ پر متفق نہیں ہو... نیز دشمن کے لیے وفادار ثابت ہوتے ہیں اور ... کے لیے ناقابلِ اعتماد۔

جب اس دھوکے کا حال کھلا تو لوگوں نے بر... سے معاملہ بند کردینے کا الٹی میٹم دے دیا۔ ا... برطانیہ نے دھاوا بول دیا۔ ہندوستان کو شکست ... اور اسے بہ جبر ''ردی نسل'' خریدنے پر مجبور ... گیا۔ بلکہ برطانیہ کے کارخانوں سے جو ناقص الا... مال نکلتا تھا وہ بھی منہ مانگے داموں ہندوستان ... منڈھا جانے لگا اور یہاں حیوانی طریق پیدائش روکنے کے علاوہ پرائیویٹ کارخانہ ہائے پیدائش اجرا بھی ہمیشہ کے لیے قانوناً روک دیا گیا۔ ڈیموکریٹک پارٹی نے ہمالیہ کے غاروں میں ایک خفیہ کارخانہ پیدائش قائم کرلیا۔ ان لوگوں ... مشینیں غیر قانونی طریقے سے روس سے د... کرلیں۔ مشینیں ہی نہیں بلکہ حیوانی ذہنیت کے مر... اور عورتوں کو جمع کرکے پرانے جاہلی طریقے سے ... پیدائش کا سلسلہ شروع کردیا۔

پچھلے اگست میں اچانک سیاحوں کی ایک ... اس طرف جا نکلی۔ انہوں نے کہیں جنگل میں مشتبہ آدمیوں کو دیکھ لیا اور واپس آ کر پولیس کو اط... کردی۔ پولیس موقع پر پہنچی۔ کارخانہ اور تربیت... پر دھاوا بول دیا گیا۔ یہ مخلوق قانون کے رو... ناجائز قرار دی گئی ہے۔ اس کے حقوق پر ... پارلیمنٹ میں بحث ہو رہی ہے اور کارخانہ چلا... والوں کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

16 نومبر

''تیسویں صدی کا ادب'' کیسا تحقیقی مضمون ہے۔ ۔نگار نے بے شمار اقتباسات جمع کیے ہیں اور ادب ارتقا کی وضاحت کی ہے وہ لکھتا ہے کہ:

''ابتدائی دور میں شاعری و افسانہ کا مرکز و محور صنفی یہ تھا اور ہر شخص کے اعصاب پر عورت سوار تھی۔ اس کے ماحول میں یہی ہونا چاہیے تھا۔ اب کہ ہماری ۔یب اس دور کو پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ ہمارا ادب عین ری راستہ پر پڑ گیا ہے اور اس میں حسن و عشق کے مانوں کا سراغ نہیں ملتا۔'' زندگی میں انسانی نازک ساسات کا ذکر قصۂ پارینہ بن چکا۔

موجودہ ادب کی تشکیل میں ''مشینی پیدائش'' نے ت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اب ادیبوں کی تمام فکری وں کا مرکز عورت کے بجائے مشین ہے۔ کیا خوب ا ہے لیلا رے نے۔

اس مشینی دور میں
آدمی کے فکر نے
لی ہے کروٹ اس طرح
شرما گئے ہیں زلزلے
ہیں دلوں میں موجزن
کچھ مشینی سے نرالے ولولے!

پروفیسر گامل نے ''امتحانی نلی'' کی کہانی لکھتے ئے کتنا پاکیزہ فلسفہ پیش کیا ہے۔ وہ دکھاتا ہے کہ کس رح افریقا کی ایک عورت سے عشق جیسا مکروہ ربط پیدا یا جاتا ہے۔ پھر انسان اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے اس ربط کو بڑی حسین نقاب پہناتا ہے۔ پھر عورت کے ہاں اس ربط کے نتیجے میں بچہ پیدا ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ لکھتا ہے:

''بھائی اس عورت کی جسمانی تکلیف کا خیال کرو جو اس نے پورا ایک سال برداشت کی ہے اور دو سال مزید برداشت کرے گی۔ یہ ماں ہے۔ اسے ماں بننے کا جنون ہے لیکن یہ مائیں انسان کو گندے طریقے سے جن کر ہمیشہ کے لیے ذلیل نہیں کر دیتیں۔''

گیلرا مشہور مشینی ادیب لکھتا ہے:

''تہذیب ماتم کرتی ہے ان لڑائیوں کا جو قرون مظلمہ میں خدا کے نام پر لڑی گئی ہیں۔ خدا پیدائش کے سلسلہ کو چلانے والا...... کہاں ہے وہ آج؟...... بس اس کی بساط اتنی ہی تھی کہ اسے انسان نے معزول کر کے دکھا دیا۔ خدا کا پجاری پیدائش کے سلسلے کو خدا کی ہستی کا سب سے بڑا مظہر سمجھتا تھا۔ اور یہ آج صرف انسان کی ہستی کا مظہر ہے۔ آج تمام ترقی یافتہ ممالک میں بے شمار خدا ہیں جنھوں نے پیدائش کے کارخانے کھول رکھے ہیں لیکن ان کے لیے کوئی عبادت گاہ نہیں بنائی جاتی اور یہ کوئی مذہب ایجاد نہیں کرتے۔''

قاغی جس کی شاعری کا ڈنکا دنیا میں بج رہا ہے جدید شاعری کا محسن ہے اس کی شاہکار نظم سے اقتباس درج ذیل ہے:

مشینی دور کی اولاد ہیں ہم
نسب کی قید سے آزاد ہیں ہم
ہیں اپنی فطرت کہنہ کے باغی
خود اپنے فکر کی ایجاد ہیں ہم

اس ادب کے پیٹ میں ایک باغیانہ ادب پرورش پا رہا ہے اور یہ نتیجہ ہے ان فکری جراثیم کی درآمد کا جو ہزار پیش بندیوں کے باوجود جرمنی کے وحشیانہ خطے سے چلے آرہے ہیں۔ ان باغی ادیبوں کا خیال یہ ہے کہ کیمیائی تناسل سے پیدا ہونے والے انسانوں کے بل پر ملک کسی بڑی چوٹ کو نہیں سہ سکتا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

17 نومبر
نہیں معلوم کیا ہونے والا ہے۔ مجھ غریب سیاح کے لیے سخت پریشانی کے اسباب پیدا ہوگئے ہیں۔ ہمارے امریکا کا جرمن سفیر واپس بلالیا گیا ہے اور حکومت جرمنی کی طرف سے ایک مراسلہ حکومت امریکا کو موصول ہوا ہے جس میں حکومت امریکا پر دو الزامات عائد کیے گئے ہیں:

1- حکومت امریکا نے اپنی شرح پیدائش شرح اموات کے مقابلہ میں پچیس سال سے خفیہ طور پر دس گنا کر دی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ امریکا کو ان سالوں میں اپنی درآمد مسلسل بڑھانی پڑی ہے۔

2- یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ امریکا بعض فوجی دستے ایسے تیار کر رہا ہے جن کے ہر سپاہی کے بدن میں چیتوں اور بھیڑیوں کے دل، جگر اور گردے فٹ کیے جاتے ہیں۔ ان حرکات کے متعلق گورنمنٹ برلن کی رائے یہ ہے کہ یہ خاموش سا اعلان جنگ ہے ہمارے خلاف اور ہم اس کا معقول جواب جلد از جلد دینا چاہتے ہیں۔

23 نومبر
لیجیے جرمن سفیر واپس آگیا۔ حکومت امریکا نے شرح پیدائش کی تحدید جرمنی کے منشا کے مطابق کر دی ہے۔

22 جنوری
مختلف صوبوں میں دبا دبا سا قحط رونما ہے۔

28 جنوری
خودکشی اور ڈاکا زنی کی وارداتوں کا جو سالانہ نقشہ اعداد و شمار چھپا ہے اس نے ملک بھر میں اضطراب کی ایک لہر دوڑادی ہے۔

31 جنوری
آج پارلیمنٹ میں اس سوال پر بحث ہوئی کہ بھوک کیوں پھیل رہی ہے۔ وزیراعظم پر سوالات کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ خلاصہ بحث یہ ہے:

سوال: درآمد بدستور ہے۔ زرعی پیداوار کم نہیں ہوئی۔ پھر بھوک کیوں ہے؟

وزیراعظم: حکومت اس بات پر غور کر رہی ہے۔

سوال: ملک کی موجودہ آبادی کتنی ہے؟ وزیراعظم: نئی مردم شماری دو سال بعد ہوگی۔

سوال: ملک کی شرح اموات کیا ہے؟

وزیراعظم: چونتیس فی ہزار۔

سوال: اور شرح پیدائش؟

وزیراعظم: پینتیس اعشاریہ پانچ فی ہزا۔

سوال: کیا آپ مختلف کارخانوں کی پیداوار کا بست سالہ گراف ہاؤس کے سامنے پیش کر سکتے ہیں؟

وزیراعظم: ایسا کرنا مفادِ عامہ کے منافی ہے۔

سوال: یعنی؟

وزیراعظم: یعنی اس کا جواب دینے کے لیے ضروری معلومات موجود نہیں ہیں۔

آخر اس سلسلہ میں ہاؤس کے زائد از نصف ارکان نے واک آؤٹ کر دیا۔

26 اپریل
قحط کی شکایت امریکا ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک کا یہی حال ہے۔ ہر ملک کی شرح برآمد گر رہی ہے اور شرح درآمد چڑھ رہی ہے۔ نوآبادیات کا حال پتلا ہو رہا ہے۔ یہ راز کیا ہے؟ اخبارات کی رائے یہی ہے کہ مختلف ممالک میں شرح پیدائش کو بڑھانے کے لیے خفیہ طور پر جو غیر محسوس مسابقت ہوتی رہی ہے اس نے گل کھلانے شروع کیے ہیں۔

29 جون
لیجیے جناب! جرمنی نے امریکا کے خلاف اعلان

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جنگ کر ہی دیا۔ ریڈیو بتا رہا ہے۔ الزام یہ ہے کہ امریکا نے اپنی نو آبادیات کا خون زرعی اجناس کی صورت میں نچوڑنے کا جو ذلیل اقدام شروع کر رکھا ہے اسے اب زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس سامانِ خورونوش سے وہ درندہ صفت سپاہی پالے جا رہے ہیں جن کے رحم و کرم پر امن عالم کا انحصار ہوگا اور حال یہ ہے کہ جدید سائنٹیفک طریق پیدائش و تربیت اور عملِ جراحی سے ان میں رحم و کرم کی صفت رہنے ہی نہیں دی گئی۔

30 جون

آج پہلی بمباری سے نیو یارک کی تواضع کی گئی۔ چھاؤنی اور ہوائی اڈے پر چند بم گرے۔ پیدائش کا ایک کارخانہ بالکل تباہ ہوگیا۔

4 جولائی

امریکا کے ہائی کمانڈ کو سخت مشکلات کا سامنا ہے۔ آرمی کے مختلف شعبے احکام کا مشینی سا اتباع تو کر لیتے ہیں لیکن ان میں جذبات کی کارفرمائی بالکل برائے نام ہے۔ اس وجہ سے جرمنی کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔

26 جولائی

ادارۂ تحقیقاتِ تناسلی کے ہال میں آج جرمن پروفیسر کی تقریر ہوئی جو حیوانی طریقہ سے پیدا ہوا تھا۔ یہ پندرہ سال قبل یہاں آیا تھا اور اسے امریکا کا باشندہ ہونے کے حقوق حاصل تھے۔ تقریر میں بتایا گیا کہ جس شخص نے انسان کا آلاتی پیدائش کا طریقہ ایجاد کیا اس نے دنیا پر بڑا ظلم کیا ہے۔ کارخانے میں پیدا ہونے اور مشینوں میں پلنے والے بچے میں وہ جذبات کیسے پیدا ہو سکتے ہیں جو فطری طریقہ سے پیدا ہونے والے لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ ماں کی گود اور خاندان کا گہوارہ، بچے کے دل میں ماضی کی روایات کا خزانہ بھر دیتا ہے۔ یہ کام مشینوں کے بس کا نہیں۔ امریکا کے سپاہی کے جذبات کو نہ وطن کا نام اکسا سکتا ہے نہ نسل کا، نہ ماضی کی تاریخ اسے سرگرم عمل کر سکتی ہے، نہ مستقبل کی فکرِ تعمیر! پھر ان میں پیدائشی نقائص کی اتنی کثرت ہے کہ امریکا ان کے بل پر جرمنی کی چوٹ نہ سہ سکے گا۔ اب ایک ہی راستہ ہے جیت کا اور یہ راستہ میں امریکا کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ میں اس کی فضا میں دس سال تک امن کی سانس لیتا رہا ہوں۔ اسی حق کو ادا کرنے کے لیے میں یہ مشورہ پیش کرتا ہوں کہ آسٹریلیا سے مدد طلب کی جائے۔ اگر وہ رضا مند ہوگیا تو جرمنی کا سیلاب جنگ رک سکتا ہے کیونکہ فطری انسان کا مقابلہ فطری انسان ہی سے ممکن ہے۔

31 جولائی:

امریکا کے ساحل پر جرمن فوج بلا کسی مزاحمت کے اتر گئی۔ امریکی فوج پیچھے ہٹ گئی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ امریکن سپاہ ہائی کمان کی مرضی کے برعکس لڑنے پر آمادہ نہیں ہے۔ تقریباً تین ہزار سپاہی تو بھاگ کر جرمنوں کی قید میں چلے گئے۔

2/اگست:

حکومت امریکا نے میری درخواست پر بین الاقوامی قانون کے ماتحت مجھے وطن میں واپس پہنچانے کا انتظام مکمل کر دیا ہے۔

6/اگست:

2259ء کے امریکا! الوداع!

8/اگست:

1944ء میں اپنے زمانہ حال کے وطن میں ہوں۔ معلوم ہوتا ہے سو کر اٹھا ہوں۔ دماغ سخت تھکا ہوا ہے۔ اب میں ڈاکٹر احتشام کے ہاں جا رہا ہوں تاکہ بروقت کوئی دوا لے سکوں۔ بشکریہ نوید اسلام صدیقی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

انوکھا تصویری جوڑا

میں اس جوڑے پر کامیابی کی شرط لگانے کو کیوں تیار ہوں

صدیق سالک

یہ عروسی جوڑا سب سے انوکھا ہے، کیونکہ یہ دونوں میاں بیوی خاصے قدیم دکھائی دیتے ہیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ انھوں نے شادی کی آخری سالگرہ کے طور پر یہ تصویر چھپوائی ہے۔ لیکن تصویر کے نیچے جب ایڈیٹر کی تحریری شہادت پڑھی تو پتا چلا کہ ان کی شادی خانہ آبادی حال ہی میں بخیر وخوبی انجام پائی ہے۔ ویسے اپنی عمریں کم دکھانے کے لیے انھوں نے بڑا اہتمام کیا ہے۔ دلھن نے اپنے مشاق ہاتھوں سے لیپ پوت کر کے اپنی بوسیدہ عمارت کے کھنڈر چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن آنکھوں کی بے نوری اور گلے کے گوشت اور ہڈیوں کا عدم توازن بتا رہا ہے کہ وہ دولھا سے کچھ سینئر ہی ہوگی۔ دولھا نے بھی ڈاڑھی اور مونچھوں کی بیخ کنی کے علاوہ سر کے بالوں کی ہستی ونیستی کا راز چھپا رکھا ہے۔ لیکن اس کی موندی موندی آنکھیں بتا رہی ہیں کہ اس نے محض فوٹو کھچوانے کے لیے اپنی نظر کی عینک اتاری ہے اور اب دیکھنے سے معذور ہے۔

دل لگی در کنار ویسے اگر ان سب جوڑوں میں مجھے کسی کی شادی کی کامیابی کی شرط لگانا پڑے تو میں اس جوڑے پر لگاؤں گا، کیونکہ اوّل تو انھوں نے جوانی جیسا جذباتی اور متلون دور گزر جانے کے بعد یہ سماجی عہد کیا ہے، دوسرے اب ان کی زندگی کا اتنا مختصر سا حصہ باقی ہے کہ قبل اس کے کہ یہ معاہدہ ان کے لیے بوجھ بنے، وہ خود بار زندگی اتار پھینکیں گے۔

اس البم میں یہ واحد تصویری جوڑا ہے جو حیرت سے دنیا کو تکنے کی بجائے ایک دوسرے کو دیکھ رہا ہے جس سے کم از کم یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ ان میں حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ ہے۔ انھیں پہلو بدل کر آمنے سامنے بیٹھا دیکھ کر مجھے کبوتروں کا وہ جوڑا یاد آ رہا ہے جو منڈیر پر بیٹھ کر دنیا کو کوؤں، چیلوں، کتوں اور بلیوں سے پاک کرنے کے منصوبے بناتا ہے، لیکن کسی قابل عمل نتیجے پر نہ پہنچ کر غٹرغوں کی لے میں کھو جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس جوڑے کے چہروں پر بھی غٹرغوں کی سی کیفیت طاری ہے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

حبیبی حی حی

(ڈاکٹر انعام الحق جاوید)

حبیبی حی حی حبیبی حی حی
اب بھی نہیں لگایا فائل کو تو نے پہیہ
اور مفت میں نہ ہو گا یہ کام میرے بھیا
ہے اب بھی وقت کر لے چپ چاپ ٹک مکیا
پھر بعد میں نہ کہنا جب ڈوب جائے نیا
حبیبی حی حی حبیبی حی حی
بہتر ہے اب سیاست کا ہی لگا لے ٹھیا
اس کاروبار میں ہے چوکھا ہی گھم گھمیا
لاگت تو ہے چونی اور آمدن روپیا
اوپر سے ہر سہولت ہو گی تجھے مہیا
حبیبی حی حی حبیبی حی حی
پولیس کر رہی ہے تھانے میں ٹھک ٹھکیا
یا گا رہا ہے ڈھولک کی تھاپ پر گویا
یہ راز کھولنے کا جس نے کیا تہیہ
رویا وتا ویا رویا وتا ویا
حبیبی حی حی حبیبی حی حی
بیٹھی رہے گی کب تک تیرے لیے ثریا
ملتان جانے والوں کا آ چکا ہے لیہ
اب بھی جو تو نے اپنا بدلا نہیں رویہ
"تے فیر ایہہ پکی گل ای پئی او ہتھوں گئی آ"
حبیبی حی حی حبیبی حی حی

چرائی نہیں ہوتی

جس شخص کی اوپر کی کمائی نہیں ہوتی
سوسائٹی اس کی کبھی ہائی نہیں ہوتی
تب تک تو بھری بزم میں لگتا ہے معزز
جب تک کہ غزل اس نے سنائی نہیں ہوتی
کرتا ہے اسی روز وہ شاپنگ کا تقاضا
جس روز مری جیب میں پائی نہیں ہوتی
پولیس کرا لیتی ہے ہر چیز برآمد
اُس سے بھی کہ جس نے یہ چُرائی نہیں ہوتی

مجھے ڈر ہے

پروفیسر ہی جب آتے ہوں ہفتہ وار کالج میں
تو اونچا کیوں نہ ہو تعلیم کا معیار کالج میں
کچھ ایسے بھی پڑھاکو پنچھیوں کو ہم نے دیکھا ہے
کہ پر دفتر میں پنجے شہر میں منقار کالج میں
اگرچہ دوسرے مشروب بھی مہنگے نہیں ملتے
مگر چلتا ہے اکثر شربت دیدار کالج میں
وہ ڈگری کی بجائے میم لے کر لوٹ آیا ہے
ملا تھا داخلہ جس کو سمندر پار کالج میں
مجھے ڈر ہے کہ ہم دونوں کہیں سمدھی نہ بن جائیں
تری گلنار کالج میں میرا گلزار کالج میں

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جہاں سلطان پڑھتی تھی

سرفراز شاہد

(اختر شیرانی کی روح سے معذرت کے ساتھ)

وہ اس کالج کی شہزادی تھی وہ شاہانہ پڑھتی تھی
وہ بے باکانہ آتی تھی وہ بے باکانہ پڑھتی تھی
بڑے مشکل سبق تھے جن کو وہ روزانہ پڑھتی تھی
وہ لڑکی تھی مگر مضمون سب مردانہ پڑھتی تھی
یہی کالج ہے وہ ہمدم جہاں سلطانہ پڑھتی تھی

جماعت میں ہمیشہ دیر سے وہ آیا کرتی تھی
کتابوں کے تلے فلمی رسالے لایا کرتی تھی
وہ جب دورانِ لیکچر بور سی ہو جایا کرتی تھی
تو چپکے سے کوئی تازہ ترین افسانہ پڑھتی تھی
یہی کالج ہے وہ ہمدم جہاں سلطانہ پڑھتی تھی

کتابیں دیکھ کر کڑھتی تھی محوِ یاس ہوتی تھی
بقول اس کے کتابوں میں نری بکواس ہوتی تھی
تعجب ہے کہ وہ ہر سال کیسے پاس ہوتی تھی
جو علم، علم کو، مولانا کو "ملوانہ" پڑھتی تھی
یہی کالج ہے وہ ہمدم جہاں سلطانہ پڑھتی تھی

بڑی مشہور تھی کالج میں چرچا عام تھا اس کا
جوانوں کے دلوں سے کھیلنا بس کام تھا اس کا
یہاں کالج میں پڑھنا تو برائے نام تھا اس کا
کہ وہ آزاد لڑکی تھی وہ آزادانہ پڑھتی تھی
یہی کالج ہے وہ ہمدم جہاں سلطانہ پڑھتی تھی

عجب انداز کے عشاق تھے اس ہیر کے ماے
کھڑے رہتے تھے پھاٹک پر کئی ماجھے گئی گامے
جو اس کے نام پر کرتے تھے جھگڑے اور ہنگامے
وہ اس طوفان میں رہتی تھی طوفانانہ پڑھتی تھی
یہی کالج ہے وہ ہمدم جہاں سلطانہ پڑھتی تھی

وہ سلطانہ مگر پہلی سی سلطانہ نہیں یارو
سنا ہے کوئی بھی اب اس کا دیوانہ نہیں یارو
کوئی اس شمع خاکستر کا پروانہ نہیں یارو
خود افسانہ بنی بیٹھی ہے جو افسانہ پڑھتی تھی
یہی کالج ہے وہ ہمدم جہاں سلطانہ پڑھتی تھی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تیرا ککھ نہ رہے

حسن کی توپ کا گولا مارا، تیرا ککھ نہ رہے
تجھ پہ گر جائے قطبی تارا، تیرا ککھ نہ رہے
بلنگ کونسل والے تیری ہر شے قرقی کر دیں
چڑھ جائے تجھ پہ قرضہ بھارا، تیرا ککھ نہ رہے
سردی اندر نہر کے بنّے ساری رات کھلوتے
تُو نہ آئی لایا لارا، تیرا ککھ نہ رہے
دل کی چوری کے الزام پولیس کا چھاپہ پڑ جائے
پھڑیا جائے ٹبر سارا، تیرا ککھ نہ رہے
ساری غزل سنا کر بھی نہیں ساڑا دل کا مکیا
ساڈا ہے بس اکو ای نعرہ، تیرا ککھ نہ رہے

مارا جائے گا

اُس نے مجھ کو دب لتاڑا مارا جائے گا
پھر اُس کے ابے نے جھاڑا مارا جائے گا
اُس لڑکی نے کھڑکی وچوں مجھ کو تڑی لگائی
تُو نے آیندہ مجھ کو تاڑا مارا جائے گا
افلاطون نے خواب میں مجھ کو یہ نقطہ سمجھایا
جو بندہ بھی ہو گا ماڑا مارا جائے گا
حاکمِ شہر نے وقت کے مجنوں کو یہ نوٹس دتا
تُو نے آیندہ جھگا پاڑا مارا جائے گا
ایک پیو نے اپنے کنوارے پُتر کو سمجھایا
جس دن بھی تُو بنیا لاڑا مارا جائے گا

لچ لفنگ Elect ہوا ہے انھے واہ
بیبا فیر Reject ہوا ہے انھے واہ
سوئی میں دھاگا ڈالنے والی نوکری پہ
انھا ایک Select ہوا ہے انھے واہ

☆

اُس کا رشتہ نہ ہونے کا باعث اُس کا ابا تھا
سب حیران تھے اُس نے ایسا ابا کہاں سے لبا تھا
سمجھ نہیں آتی بتی دھاریں وہ کس سے بخشائے
اُس کی ماں تو فیڈر تھی اور سکے دودھ کا ڈبا تھا
اوس جگہ پر کافی لوکی منتیں مانگنے پہنچے
پچھلے ورہے جہاں پر ہم نے مویا ککڑ دبا تھا

☆

اوکھا ہویا ہم سے اکڑا کیہہ کریے
ایسے گل پر ہو گیا جھگڑا کیہہ کریے
جی کرتا ہے اوس رقیب کی گدڑ کٹ لگائیں
لیکن ہے وہ ہم سے تگڑا کیہہ کریے

(خالد مسعود خان)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مسکراہٹیں کرکٹ کے میدانوں میں

رانا محمد شاہد

مشتاق محمد اور انجکشن کا خوف

انگلینڈ کے مشہور کرکٹر ٹونی گریگ اپنی یادوں کے تذکرے میں پاکستان کے سابق کپتان مشتاق محمد کے بارے میں کہتے ہیں۔ ''ورلڈ سیریز کرکٹ میں وہ میری کپتانی میں کھیل رہا تھا۔ ایک میچ میں مجھے اس کی اشد ضرورت تھی جبکہ اس کی ایڑی میں چوٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ شدید تکلیف کی حالت میں تھا اور منہ بسورے ڈریسنگ روم کے آس پاس ٹہل رہا تھا۔ میں نے میچ سے ایک روز قبل اپنے فزیو کو فون کیا اور اس سے پوچھا کہ تم کل مُشی کا علاج کرو گے۔ وہ بڑا سا ٹیکہ اپنے ساتھ لانا جو تمھارے بیگ میں ہوتا ہے۔ چناں چہ اگلے روز مُشی فزیو کے سامنے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور یہی کہہ رہا تھا کہ وہ ان فٹ ہے۔ فزیو جب بھی اس کی ایڑی دباتا تو وہ کراہنے لگتا۔ ''اب صرف ایک ہی طریقہ ہوسکتا ہے۔'' فزیو نے یہ کہتے ہوئے اپنے بیگ سے کوئی ایک فٹ لمبا ٹیکا باہر نکالا اور اس طرح لہرایا کہ مُشی اسے دیکھ لے۔ مُشی نے ایک نظر ٹیکے کو دیکھا اور بولا: ''اچھا، ٹھیک ہے، میں کھیلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اب درد نہیں ہو رہا۔'' مجھے لگ رہا تھا کہ وہ یہی کہے گا۔ وہ ایک اچھا ٹیم ممبر، ایک زبردست لڑاکا اور مرد آدمی تھا۔

کرکٹ نہیں..... فٹ بال

برطانیہ میں ساتواں کرکٹ ورلڈ کپ جاری تھا۔ ایک کے بعد ایک فتوحات سمیٹتی پاکستانی ٹیم کے کھلاڑی ڈریسنگ روم میں خوش گپیوں میں مشغول اور اپنی پُرلطف باتوں سے محفل کو کشتِ زعفران بنائے ہوئے تھے۔ ایسے میں لیگ اسپنر مشتاق احمد فٹ بال کے ساتھ مختلف کرتبوں کا مظاہرہ کرنے میں مصروف نظر آئے۔ وہ فٹ بال کو کبھی دائیں پاؤں کی انگلیوں کی مدد سے اوپر اچھالتے اور کبھی بال لے کر تھوڑا آگے بڑھاتے، کبھی ڈربل کرتے اور یونہی کھیلتے کھیلتے ان کے ذہن میں نجانے کیا بات آئی کہ انھوں نے ساتھی کھلاڑیوں کو متاثر کرنے کے لیے (کہ میں کرکٹ کے علاوہ فٹ بال بھی بہت اچھی طرح کھیل سکتا ہوں) فٹ بال کو کِک لگا دی۔ بال ہوا میں بلند ہوئی اور زوردار دھماکے کے ساتھ شیشے سے جا ٹکرائی۔ چھن کی آواز آئی اور شیشہ اور ٹیوب لائٹ کرچی کرچی ہوگیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ مشتاق احمد کو اپنی شوخیوں کا خمیازہ ساتھی کھلاڑیوں کے قہقہوں کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

کھلاڑیوں کی پہچان میں پریشانی

1983ء کے ورلڈ کپ میں شامل پاکستانی کھلاڑی شاہد

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سنت نبوی ﷺ میں شفاء ہے

سرکہ بہترین سالن ہے۔ اے اللہ تو سرکہ میں برکت ڈال کہ یہ مجھ سے پہلے نبیوںؑ کا سالن تھا اور وہ گھر غریب نہ ہوگا جس میں سرکہ موجود ہے۔ (ابن ماجہ)

T.M.
Doctor's

Unpasteurized, Unfiltered & Living

Natural
APPLE CIDER VINEGAR
With Mother
100% Pure

انتہائی خالص اور پاک وصاف
WONDERFUL DRUG OF YESTERDAY & TODAY

کھٹاس بڑھانے کیلئے تیزاب یا ترش اشیاء سے پاک بغیر کسی مصنوعی خوشبو اور رنگ کی آمیزش کے صاف ستھرے پھلوں سے تیار کردہ۔

بہترین قدرتی اینٹی آکسیڈنٹ اور اینٹی کینسر اجزاء کے ساتھ

آسان ترکیب روزانہ ایک سے تین بار کھانے سے آدھا گھنٹہ پہلے دو ڈھکن A.C.V ایک گلاس پانی میں ڈال کر پینے سے بھی۔

- وزن کم کرتا ہے پیٹ اور کولہوں کی فالتو چربی تحلیل کر کے سمارٹ بناتا ہے۔
- کولیسٹرول کم کر کے بلڈ پریشر امراض دل اور فالج سے بچاؤ میں معاون ہے۔
- شوگر کنٹرول کرنے میں مدد کرتا ہے۔
- نظام انہضام، جگر اور پتہ کی اصلاح کرتا ہے۔
- ACV کا روزانہ استعمال جسم کو چستی اور توانائی دیتا ہے۔
- Osteoporosis اور جوڑوں کے درد میں کمی کرتا ہے۔

چہرہ کی خوبصورتی اور کینسر سے بچاؤ میں معاون انتہائی خالص اور پاک وصاف قدرتی انگوری سرکہ بھی دستیاب ہے۔ شوگر کنٹرول اور دیگر فوائد کیلئے انتہائی خالص اور پاک وصاف قدرتی سرکہ جامن استعمال کریں۔

پاکستان کے ہر شہر سے ڈسٹری بیوٹرز کی ضرورت ہے۔

گجرات 0333-8781266 0344-0344587			
وہاڑی 0300-7722899 067-3362310	اسلام آباد 0321-4585442 0512558079	کراچی 0300-2486243	لاہور 0321-9785644
جہانیاں 0306-7821929	پشاور 0300-9596240 0344-3202020	دینہ 0300-9518621	ڈسکہ 0321-6144189

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

محبوب اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "ورلڈ کپ میں جو پاکستانی ٹیم حصہ لے رہی تھی۔ اس میں پانچ کھلاڑی ایسے تھے جن کی ڈاڑھی تھی۔ ان میں میرے علاوہ اعجاز فقیہ، وسیم راجا، طاہر نقاش اور راشد خان شامل تھے۔ انگلش کمنٹیٹرز کو پاکستانی کھلاڑیوں کو پہچاننے میں بڑی پریشانی کا سامنا تھا۔ ان کو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کون بالنگ کر رہا ہے اور کون کس جگہ فیلڈنگ کر رہا ہے۔ ہم پانچوں میں قدر مشترک یہ تھی کہ تمام ہی بالر تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ طاہر نقاش کے خلاف رنز بنتے تو کمنٹیٹرز شاہد محبوب کا نام لے رہے ہوتے۔ پورے ورلڈ کپ کے دوران انگلش کمنٹیٹرز کو یہی مشکلات پیش آئیں۔"

فیلڈ میں جمائیاں

مشہور آف اسپنر توصیف احمد 1987ء کے ورلڈ کپ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "لاہور میں کھیلے جانے والے سیمی فائنل میں آسٹریلیا کے ہاتھوں پاکستانی ٹیم کی شکست کے بعد لاتعداد الزامات لگائے گئے۔ کیونکہ لاہور اور پاکستان کے لوگ اس غیر یقینی شکست کے لیے تیار نہ تھے۔ کسی نے کہا کھلاڑی ساری رات جاگتے رہے، صبح کیسے کھیل سکتے تھے۔ اس وقت تو ہمارے ملک میں رات کو گیارہ، بارہ بجے سونے کا رواج عام تھا۔ سیمی فائنل کے بعد لاہور میں میرا دوست جاوید آیا اور کہنے لگا کہ رات کو باہر چل کر ہوٹل میں نہاری کھاتے ہیں۔ میں نے اسے منع کیا کہ ہماری شکست کے واقعہ کو چند گھنٹے گزرے ہیں اور لوگ باتیں کریں گے۔ اس لیے آج باہر نہیں جائیں گے۔ جاوید کہنے لگا لوگوں کا سامنا آج بھی کرنا ہے اور کل بھی تو آج ہی کیوں نہ کر لو۔ ہوٹل پہنچے تو وہاں چار لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر کہنے لگے کہ جب ہمارے پلیئر ہی راتوں کو اتنی دیر تک جاگیں گے تو میچ کس طرح جیتیں گے۔ یہ توصیف احمد بھی فیلڈ میں جمائیاں لے رہے تھے۔ مجھے ان کی بات سمجھ میں نہ آسکی۔ بعد میں، میں نے جاوید سے پوچھا کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے تھے تو جاوید نے کہا کہ تمھاری جمائی کا ذکر کر رہے تھے۔ کیونکہ ایک بار جب تم کیمرا پر آئے تھے تو تم پورا منہ کھول کر جمائی لے رہے تھے اور ان لوگوں کو باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ جبکہ جمائی لینے کی وجہ شب بیداری نہیں تھی بلکہ وہ دن ہی ہماری ٹیم کے لیے اچھا نہ تھا۔

سر پر انڈے

ہاکی کے کھلاڑی محمد سرور اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ گھر والوں نے انھیں بازار سے انڈے لانے کے لیے بھیجا۔ وہ انڈے خرید کر واپس لوٹ رہے تھے کہ گلی میں کھیلتے دوستوں نے روک لیا۔ محمد سرور نے انھیں دھمکی دی کہ اگر مجھے نہ جانے دیا تو سارے انڈے تمھارے سر پر مار کر توڑ دوں گا۔ ایک لڑکا فوراً بولا: "ہمت ہے تو مار دو۔"

محمد سرور نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک ایک کر کے سارے انڈے لڑکے کے سر پر مار دیے۔ انڈے ٹوٹ چکے تو وہ لڑکا ہنستا ہوا اٹھا اور بولا۔ "واہ بھئی آج تو سر پر خوب شیمپو لگا ہے۔ نہانے میں بہت مزا آئے گا اور بال بھی روشن و چمک دار ہو جائیں گے۔" یہ سن کر محمد سرور کو احساس ہوا کہ وہ اپنا ہی نقصان کر بیٹھے ہیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

گوشی......

پاکستان کے سابق فاسٹ بالر رانا نوید الحسن اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔ ''جنوبی افریقا میں چیمپئن ٹرافی کھیلی جارہی تھی۔ ہمارے شہر شیخوپورہ سے بھی لوگ پڑھائی اور بزنس کی غرض سے گئے ہوئے تھے۔ جس کا مجھے علم نہ تھا۔ میں میچ کھیل رہا تھا تو پیچھے سے مجھے رانا، رانا کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے توجہ نہ دی کہ میچ چل رہا ہے۔ اچانک مجھے آواز آئی ''گوشی......'' اس نام سے مجھے گھر میں پکارا جاتا ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ہمسائے کا لڑکا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگا اور جب اوور ختم ہوا تو میں اس سے ملنے بھی گیا۔''

بستر میں کنگرو

آسٹریلیا کے مشہور وکٹ کیپر ای ین ہیلی بتاتے ہیں کہ ''میں سوتے میں چلنے کا عادی رہا ہوں۔ 1993ء میں آسٹریلیا کی انڈر 19 ٹیم کے ہمراہ انگلینڈ کے دورے پر تھا۔ میں رات کو سویا اور سوتے میں اُٹھ کر چلنے لگا۔ ہماری ٹیم ساؤتھمپٹن میں ٹھہری ہوئی تھی۔ میکڈرمٹ میرا روم میٹ تھا۔ اس نے مجھے چلتے دیکھا تو کافی پریشان ہوگیا کیونکہ میں سو رہا تھا۔ میکڈرمٹ نے مجھے جگانے کی کوشش کی تو مجھے ہوش آگیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں بستر سے نکل کر سیر کیوں کر رہا تھا تو میں نے اسے بتایا کہ میں خواب دیکھ رہا تھا کہ میرے بستر میں ایک بڑا کنگرو گھس آیا ہے اور میں خوفزدہ ہوکر بستر سے نکل بھاگا۔''

ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ آسٹریلیا میں رہنے والوں کے خواب میں کنگرو ہی آکر ان کی ہوائیاں اُڑا سکتے ہیں۔

جاوید میانداد کی چھلانگیں

بھارت کے خلاف عالمی کپ کے ایک میچ میں جاوید میانداد بلے بازی کرنے گئے۔ اس دن جاوید میانداد مکمل فٹ نہیں تھے۔ بھارتی وکٹ کیپر کرن مورے مخصوص انداز میں اُچھل اُچھل کر اپیل کیا کرتا تھا۔ اس دن بھی وہ وکٹوں کے پیچھے خوب بول رہا تھا۔ جاوید میانداد کو تنگ کرتا رہا۔ آخر تنگ آکر جاوید میانداد اپنی خراب حالت کے باوجود 3 مرتبہ اُچھل اُچھل کر اس کے اپیل کرنے کے انداز کی نقل کی تو پورا اسٹیڈیم قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ مورے یہ دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اسے دوبارہ جاوید میانداد کو تنگ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اپنی خراب حالت کی وجہ سے جاوید میانداد کو اُچھلنے سے تکلیف تو ہوئی۔ لیکن انھوں نے مورے کو سبق سکھا دیا کہ پورا اسٹیڈیم اس پر ہنسنے لگا۔

مینڈک کھا گئے......

پاکستان کے مایہ ناز بالر سرفراز بیتے دنوں کے قصے چھیڑتے ہوئے کہتے ہیں: ''1977ء میں دورۂ ویسٹ انڈیز کے دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے میں کبھی نہیں بھلا پایا۔ جمیکا میں رات کے کھانے میں فہرست طعام (menu) پیش کی گئی تو اس میں "Mountain chicken" کے نام سے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اِنتہائی نادار بچیوں کا اِدارہ

ہم ضلع قصور کی دور افتادہ تحصیل چونیاں میں مفلس اور نادار گھرانوں کی بچیوں کے لیے بیک وقت دینی اور دنیوی تعلیم کا ادارہ چلا رہی ہیں۔ یہ صرف بچیوں کا اسکول ہے۔ طالبات سے کوئی فیس نہیں لی جاتی ہے، بلکہ قرآن مجید، تفاسیرِ قرآن، کتب حدیث، سپارے اور نورانی قاعدے بھی مفت دیے جاتے ہیں۔

بچیوں اور بچوں کے لیے معمول کی تعلیم بشمول انگلش میں بھی ایک شعبہ کام کر رہا ہے جس میں نرسری سے لے کر مڈل تک تعلیم دی جا رہی ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ اس شعبے میں داخل بچوں اور بچیوں سے کتنی فیس لی جا رہی ہے؟ (صبح 6 بجے سے شام 7 بجے تک) صرف 150 روپے ماہوار یعنی 5 روپے یومیہ، 60 بچیاں اور 20 بچے تو یہ معمولی فیس دینے کی استعداد رکھتے ہیں، لیکن مزید 125 بچے (زیادہ تر بچیاں) اس شعبے میں داخلے کے خواہش مند ہیں۔ ہم انھیں بھی داخل کرنا چاہتی ہیں، لیکن مطلوبہ سٹاف وغیرہ مزید وسائل کے بغیر فراہم نہیں کیے جاسکتے۔

کوئی صاحب خیر بہن، بھائی انتہائی پسماندہ علاقے اور محروم بچیوں کے اس اِدارے کی مدد کرنا چاہے، تو اس کی یہ صورتیں ہیں (125 چھوٹی کرسیاں، ٹیبل 125 عدد پلاسٹک یا لکڑی کے) بڑی کرسیاں برائے سٹاف 4 عدد، ٹیبل چھوٹے 4 عدد پلاسٹک یا لکڑی کے اور چند چٹائیاں۔ آپ یہ خود خرید کر ادارے میں آکر دے جائیں اور کام ہوتا بھی دیکھیں، اگر تشریف لانا ممکن نہ ہو، تو ہمیں حکم دیں ہم بندہ بھجوا دیں گے اگر اپنے صدقات و خیرات وعطیات و زکوٰۃ فنڈ سے نقد بھجوانا چاہیں، تو بذریعہ منی آرڈر بنام اِدارہ بھجوادیں جزاکم اللّٰہ تعالیٰ۔

دعوت

آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ یا سوائے اتوار کے کسی بھی دِن کسی بھی وقت جس میں آپ کو آسانی ہو ادارے کا وزٹ فرمائیں، ہمارے کام تعلیم القرآن وعصری تعلیم کو چیک کریں اگر دل گواہی دے کہ کام احسن طریقہ سے ہو رہا ہے، تو مدد فرما کر عنداللّٰہ ماجور ہوں۔

رابطہ کے لیے: رضیہ پروین: ایم اے: پرنسپل آمنہ جنت فاؤنڈیشن گرلز ماڈل اسکول چونیاں ضلع قصور
0300-4735932/0322-7614497

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بھی ایک ڈش موجود تھی۔ میں اس ڈش کی حقیقت سے آگاہ تھا۔ مگر وہ جونیئر کھلاڑی مثلاً جاوید میانداد اور ہارون الرشید وغیرہ جو پہلی بار ویسٹ انڈیز کا دورہ کررہے تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ ماؤنٹین چکن تو کوئی کافی بڑی ڈش ہوگی اور اس کا آرڈر دے دیا۔ جب وہ سیر ہو کر کھا چکے تو میں نے ان سے کہا کہ جانتے ہو کہ تم لوگوں نے کیا کھایا ہے؟ وہ حیرت سے مجھے تکنے لگے تو میں نے بتایا کہ ماؤنٹین چکن تو مینڈک ہوتا ہے اور یہ ادھر کی خاص ڈش ہے۔ اس پر وہ سمجھے کہ شاید میں مذاق کر رہا ہوں۔ اپنی تسلی کے لیے انھوں نے ویٹر کو بلایا تو اس نے میری بات کی تصدیق کی اور انھیں بتایا کہ ماؤنٹین چکن بہت بڑا مینڈک ہوتا ہے۔ یہ جان کر جاوید میانداد اور ہارون الرشید کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوگئی اور وہ باتھ روم میں جا کر اُلٹیاں کرنے لگے۔

سر! ایک لڑکا غائب ہے

ویسٹ انڈیز کو دو دفعہ عالمی چمپئن بنوانے والے کرکٹ کے عظیم کھلاڑی کلائیو لائیڈ پہلے عالمی کپ کا ایک واقعہ سناتے ہوئے کہتے ہیں۔

''بین الاقوامی ایک روزہ عالمی کپ 1975ء میں شرکت کے لیے جب ہم انگلستان پہنچے تو وہاں ہوائی اڈے پر ہمارے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ کسٹمز اور دیگر امیگریشن کے معاملات سے فارغ ہونے کے بعد جب ہماری 15 رکنی ٹیم ہوائی اڈے سے باہر آئی تو وہاں عالمی کپ انتظامیہ نے ہمارا خیر مقدم کیا اور ہمیں ہوٹل پہنچانے کے لیے ایک وین میں سوار کرا دیا گیا۔ وین کے چلنے سے قبل ہمارے ٹیم منیجر نے ہمارے ایک ساتھی بوائس جو کہ ٹیم کے اسسٹنٹ منیجر اور خزانچی کی ذمہ داریاں بھی نبھا رہے تھے، سے کہا کہ لڑکے گن لو، سب وین میں سوار ہوگئے ہیں؟ بوائس نے لڑکے گننا شروع کیے۔ اسی دوران ڈرائیور وین چلاتے ہوئے سڑک پر لے آیا۔ ہم سب آرام و سکون سے ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک بوائس چلا اُٹھے ''سٹاپ، پلیز سٹاپ دی بس۔'' بوائس خوفناک انداز میں چلائے تو ڈرائیور نے گھبرا کر بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ ہم سب حیرت سے بوائس کی طرف دیکھ رہے تھے۔'' ''سر کوئی لڑکا غائب ہے؟'' بوائس نے ٹیم منیجر کو مخاطب کیا۔ اب ہم سب گننے لگے اور حیرت انگیز طور پر لڑکے پورے 15 تھے یعنی ٹیم کی تعداد پوری تھی۔ ٹیم منیجر بوائس کی بے وقوفی بھانپ گئے اور پوچھا۔ ''کون سا لڑکا غائب ہے؟'' بوائس بولا ''سر یقیناً ایک غائب ہے، جولین بھی ہے، لائیڈ بھی ہے اور کنگ بھی...... مگر پھر بھی ایک غائب ہے۔'' اس دوران روہن کنہائی جو ہمارے سب سے سنیئر رکن تھے۔ اُٹھ کر بوائس کے پاس گئے اور اس کا کان پکڑ کر بولے ''پندرھواں لڑکا یہ ہے۔'' دراصل بوائس گنتی کرتے ہوئے اپنا شمار کرنا بھول جاتے تھے۔ سارے رستے سب نے اُس کا خوب مذاق اُڑایا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ایک بلا کا تذکرہ جو تھوڑی بھی ملے تو کافی لگتی ہے

کیا خبر اس سے خوش ہو جائیں

اپنے میاں کی دوری سے نالاں ایک بیوی کا ماجرا

تنویر قریشی

میرے میاں ایک پروفیسر ہیں اور پروفیسر بھی انگریزی کے۔ باتیں اتنی کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ! ایسی ایسی فلسفے اور حکمت کی باتیں کرتے ہیں کہ مجھے تو ان کا جواب ہی نہیں آتا۔ اس پر مزید غضب یہ کہ صاحب جی ٹیوشن بھی پڑھاتے ہیں۔ ٹیوشن پڑھنے والوں میں اکثریت لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ پتا نہیں ان کو یہ کیا پڑھاتے لکھاتے ہیں کہ وہ بس ان کا ہی کلمہ پڑھتی ہیں۔ مجھے کئی لڑکیوں سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے

بس یہی کہتی ہیں ''سر بہت اچھے ہیں اور بہت اچھا پڑھاتے ہیں۔'' مجھے تو شادی کے بیس سالوں میں ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی جو ان کو نظر آتی ہے۔ میں نے جب بھی دیکھا سر کے بالکل قریب ہو کے بیٹھی ہوتی ہیں کہ ہم نے سر سے ٹینس (Tense) سمجھنے ہیں۔ پھر ٹیوشن کے ٹائم سے گھنٹا پہلے ہی دروازہ توڑنا شروع کر دیتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کو گھر میں چین نہیں آتا جب تک سر سے نہ مل لیں اور تو اور ٹیلی فون پر بھی آرام نہیں کرنے دیتیں۔ چھٹی والے دن بھی امن نہیں کرتیں۔ میں ان سے لاکھ پوچھوں کہ مجھے بتا دو سر سے کیا کام ہے لیکن کبھی نہیں بتائیں گی۔ بس ایک ہی رٹ لگاتی ہیں ''سر نال گل کرنی اے۔''

جب سے میرا دشمن موبائل فون آگیا ہے ان کی اور موج ہوگئی ہے۔ سر کے فون کی گھنٹی ہر وقت بجتی رہتی ہے۔ یہ اتنی چالاک ہیں کہ اگر کبھی میں فون اٹھا لوں، تو میری آواز سنتے ہی فون بند کر دیتی ہیں۔ پتا نہیں وہ کون سی بات ہے جو یہ مجھے نہیں بتا سکتیں۔ اب تو میں یہ الفاظ سن

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سن کر تنگ آ گئی ہوں۔ میرا بس چلے تو میں ان مصیبتوں کو سر کے قریب نہ پھٹکنے دوں، لیکن کیا کروں، ٹیوشن کے بغیر تنخواہ میں گھر کا خرچہ بھی تو نہیں چلتا۔ رات کے وقت بھی ایس ایم ایس کی گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں۔ میں تنگ آ جاتی ہوں۔ پوچھوں تو کہتے ہیں عید کی مبارک باد کے میسج آتے ہیں۔ اگر میں انگریزی پڑھ سکتی تو ان عید کے پیغامات کا پول کھل جاتا جو ان کو سارا سال آتے رہتے ہیں۔ میں نے تو میٹرک کے امتحان میں انگریزی کے مضمون میں کمپارٹ آنے کے بعد پڑھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب مجھے پتا چلا کہ انگریزی پڑھنا کتنا ضروری ہے۔ لیکن ''اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔''

آپ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کس قسم کی زنانی ہے جس کو اپنا میاں اچھا نہیں لگتا اور ہر وقت اس کی شکایتیں کرتی رہتی ہے۔ یہ بات نہیں! مجھے اپنا میاں بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے اپنے علاوہ کسی اور کا اپنے میاں کے پاس بیٹھنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ یہاں تک کہ مجھے تو اپنی ساس بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی جب وہ میرے میاں کا منہ سر چومنا شروع کر دیتی ہے۔ صاحب جی کی اور تو ساری باتیں ٹھیک ہیں لیکن جب میرے پاس آتے ہیں تو ان کو چپ سی لگ جاتی ہے۔ کہتے ہیں میرا باتیں کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ میں تھکا ہوا ہوں۔ مجھے آرام کرنے دو، لیکن مجھے اتنا پتا ہے کہ اگر کسی لڑکی کا فون آ جائے، تو گھنٹا گھنٹا کھڑے ہو کر باتیں کر لیتے ہیں۔ یہی نہیں ان کا کوئی دوست آ جائے تو پھر ان کو کھانا پینا بھی بھول

کھڑا ڈنر

کھڑا ڈنر ہے غریب الدیار کھاتے ہیں
بنے ہوئے شتر بے مہار کھاتے ہیں
اور اپنی میز پر ہو کر سوار کھاتے ہیں
کچھ ایسی شان سے جیسے اُدھار کھاتے ہیں
شکم غریب کی یوں فرسٹ ایڈ ہوتی ہے
ڈنر کے سائے میں فوجی پریڈ ہوتی ہے
کھڑے ہیں میز کنارے جو اک پلیٹ لیے
انہی نے کوفتے اپنے لیے لپیٹ لیے
اِدھر اُدھر کے جو کھانے تھے سب سمیٹ لیے
کھڑا تھا پیچھے سو میں رہ گیا پلیٹ لیے
یہ میز ہو گئی خالی اب اور کیا ہو گا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گا
تھی ایک مرغ کی ٹانگ وہ رقیب لے بھاگا
مرا نصیب بھی جاگا پر دیر سے جاگا
کباب اُٹھایا تو اس میں لپٹ گیا دھاگا
ڈنر یہ کیا کہ نہ پیچھا ہے جس کا نہ آگا
یہ کیا خبر تھی میں آیا تھا جب ڈنر کھانے
''حقیقتوں کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے''
یہ ایک میز خواتین گرد صف آرا
لبوں سے ان کے رواں گفتگو کا فوارہ
میں ایک گوشے میں سہما ہوا ہوں بے چارہ
کہ یہ ہٹیں تو اُٹھاؤں میں نان کا پارہ
اسیر حلقۂ خوباں جو مرغ و ماہی ہیں
تو ہم شہید ستم ہائے کم نگاہی ہیں

(سید محمد جعفری)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جاتا ہے۔ قہقہے لگاتے ہیں۔ شعر اور لطیفے ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ لیکن اُدھر دوست باہر نکلا اور میں سامنے آئی، تو ساتھ ہی ان کو سانپ سونگھ جاتا ہے (خدا نہ کرے)۔ اگر کبھی میرے ساتھ بات کرتے ہی ہیں، تو وہ بھی جی کو جلانے اور دکھ دینے والی۔ میرے بڑے بیٹے کا قد ان کی طرح ٹھگنا رہ گیا ہے اور چھوٹے بیٹے کا ماشاءاللہ میری طرح لمبا ہو گیا ہے۔ اب ان کو جب بھی موقع ملتا ہے حتیٰ کہ مہمانوں کے سامنے بھی کہنے سے نہیں چوکتے کہ یہ بڑے بیٹے کو کھانے کو کم دیتی تھی، اس لیے اس کا قد نہیں بڑھا۔

مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ میرے ساتھ ان کے اس تلخ رویے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کوئی ان کو میرے خلاف سکھاتا پڑھاتا ہو۔ شادی کے وقت میری ایک پھوپھی نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ اپنے میاں کو نہ کبھی اکیلے رہنے دینا اور نہ کہیں جانے دینا۔ میں نے اس نصیحت کو پلّے باندھ لیا اور آج تک ان کو کسی رشتے دار کے ہاں حتیٰ کہ ماں باپ کے پاس بھی اکیلے نہیں جانے دیا۔ میری اس عادت کی وجہ سے کبھی کبھی مجھے چڑانے کے لیے صاحب جی سُر لگاتے ہیں۔ ''گوریے میں جاناں پردیس'' تو میں چڑنے کی بجائے خوش دلی سے تان اڑاتی ہوں ''میں جاناں تیرے نال'' میں نے اپنی نندوں کو شروع سے ہی دبا کے رکھا ہوا ہے اس لیے ان کو کبھی میرے گھر میں آ کر ایک آدھ دن سے زیادہ رہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں نے ان کو منہ سے کبھی کچھ نہیں کہا، پھر بھی جو میں چاہتی ہوں سمجھ جاتی ہیں۔ لیکن یہ گتھی آج تک نہیں کھل سکی کہ صاحب کو کیا پریشانی ہے۔ یہ میرے ساتھ کھل کر بات کیوں نہیں کرتے۔ ہر وقت ماتھے پر تیوری کیوں چڑھائے رکھتے ہیں۔ لگتا ہے جیسے کسی نے ان کے گھر میں ہنسنے بولنے پر بندش لگائی ہوئی ہے۔ میں نے تو جادو ٹونہ بھی آزما کر دیکھ لیا ہے۔ نکڑ والی آپی جی ان کاموں میں بہت سیانی اور تجربہ کار ہیں۔ انھوں نے مجھے پانی دم کروا کے اور زمین میں دبانے کے لیے ایک گنڈا لا کر دیا تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ الٹا ان کا غصہ کم ہونے کی بجائے کچھ اور بڑھ گیا۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ میری قسمت میں یہی کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں جب دوسرے شادی شدہ جوڑوں کو ہنستے کھیلتے دیکھتی ہوں، تو میرے دل سے ہُوک سی اٹھتی ہے۔ پھر میں صبر شکر کا گھونٹ پی کر خاموش ہو جاتی ہوں۔ پتا نہیں میرے اندر کس چیز کی کمی ہے۔ مجھ سے تو کتابیں اور اخبارات ہی اچھے ہیں جن کو یہ اپنا وقت دیتے ہیں۔ میرے لیے ان کے پاس کوئی وقت نہیں۔ میں لاکھ بلاتی رہوں میری طرف کبھی نہیں دیکھیں گے۔ اگر ان کو ٹی وی پر حدیقہ کیانی کا گانا ''بوہے باریاں تے نالے کندھاں ٹپ کے...... آواں گی ہوا بن کے'' لگا ہوا مل جائے، تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کو دیکھتے ہیں۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ دریا میں چھلانگ لگا دوں۔ پھر میں سوچتی ہوں صاحب جی کے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ اس لیے اب میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا ہے۔ پھر بھی میں دنیا بھر کی عورتوں کو یہی نصیحت کروں گی کہ وہ کم از کم ایسی غلطی نہ کریں جو مجھ سے ہوئی ہے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

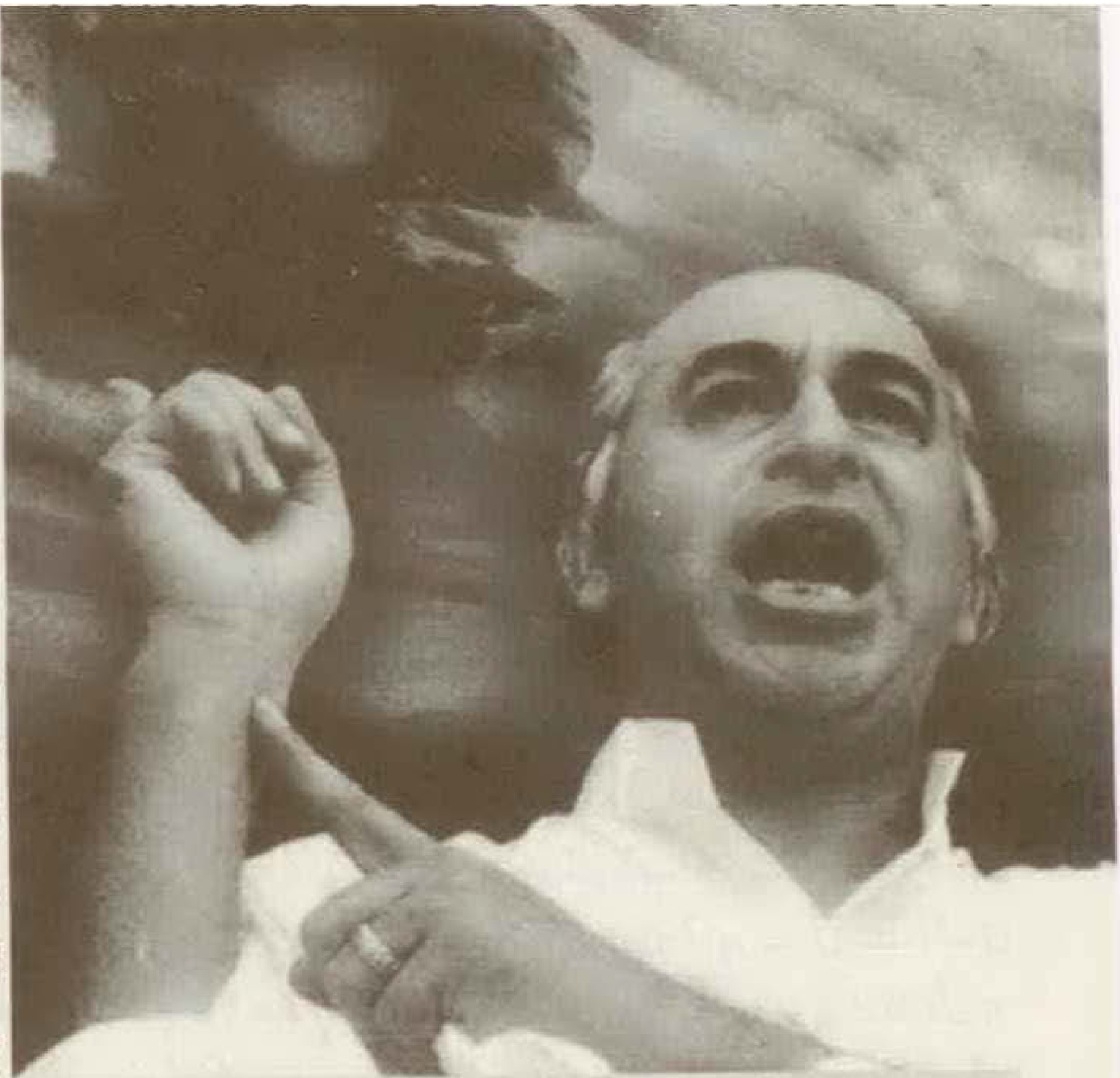

پاکستانی عوام کے مزاج کو یا بھٹو صاحب نے سمجھا
یا اداکار رنگیلا نے

دیکھنا تقریر کی دہشت

ذکر مصروف لوگوں کی اداکاری اور ڈراموں کا جو وہ اپنی تقاریر کے دوران کرتے رہے

ڈاکٹر ایس ایم قریشی

ایک صاحب تقریر سے جی چراتے تھے (جی ہاں، آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں)۔ ان کا کہنا تھا کہ حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ تقریر کے بغیر کام چلا سکتے ہیں۔ ان کے دوستوں نے ان سے ایک ہزار روپے کی شرط لگائی کہ وہ انھیں تقریر کرنے پر مجبور کر دیں گے۔ چناں چہ ایک جلسۂ عام کا اہتمام کیا گیا اور ان صاحب کو اس کا صدر بنا دیا گیا۔ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے چند مقررین نے اپنی اپنی حسرت نکالی۔ پھر جلسے کے ناظم اعلیٰ نے صدر کی شان میں خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور انھیں خطاب کی دعوت دی۔

کم گو صاحب بڑی شان کے ساتھ مائک پر تشریف لائے اور مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر کہا ’’خواتین و حضرات! آج کل کے جو سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی حالات ہیں وہ تو آپ سب کو معلوم ہی ہیں۔‘‘ سامعین نے رسماً ہاں میں سر ہلا دیا۔ اس پر انھوں نے کہا ’’پھر میرے بولنے کی کیا ضرورت ہے۔‘‘ اس مختصر تبصرے کے بعد وہ اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گئے اور جلسہ برخاست ہو گیا۔ ان کے دوست شرط ہار چکے تھے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تقریر وہ فن ہے جو خاص مہارت، ذہانت، حاضر دماغی اور بعض اوقات شعبدہ بازی کا متقاضی ہے۔ اچھا مقرر جلسہ کی بوجھل اور بے جان فضا میں زندگی کی روح پھونک سکتا ہے۔ تاریخ عالم جوشیلے مقررین کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

ماضی قریب میں برصغیر پاک و ہند کے زعما میں نواب بہادر یار جنگ، مولانا محمد علی جوہر، عطاءاللہ شاہ بخاری اور علامہ مشرقی وغیرہ فن تقریر کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ مغرب میں چرچل، ہٹلر اور خروشیف کی آواز پر دنیا لرز اٹھتی تھی۔ ''ماسکو سے علیحدگی'' نامی کتاب میں اپنے دور کے مشہور روسی منحرف اراکاری شیف چینکو نے خروشیف کی شعلہ بیانی کا ایک واقعہ درج کیا ہے جس کے باعث ایک بار اقوام متحدہ میں ہلچل مچ گئی تھی۔

جنرل اسمبلی کے ایک اجلاس کے دوران سابق سوویت یونین کے آنجہانی وزیراعظم خروشیف نے اسپین کے صدر جنرل فرانکو پر کڑی نکتہ چینی کی۔ اسپین کے وزیر خارجہ فرنانڈو کاسٹیلا نے جواب کا حق استعمال کرتے ہوئے نہ صرف جنرل فرانکو کا دفاع کیا بلکہ خروشیف اور سوویت یونین کو بھی ہدف تنقید بنایا۔

خروشیف سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ انھوں نے اپنی نشست سے اٹھ کر کاسٹیلا کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ وہ پوری قوت کے ساتھ چیخ رہے تھے اور غصے سے بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنا جوتا نکال کر اسے ڈیسک پر دھم دھم مارنا شروع کر دیا۔ اسمبلی میں موجود لوگ ان کی اس حرکت پر دم سادھے بیٹھے ہوئے تھے۔

خروشیف نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی کرسی سے اچھل کر باہر آگئے اور باکسروں والے انداز میں اسپینی وزیر خارجہ کی ٹھکائی کرنے کے لیے اس کی طرف بڑھے۔ دبلا پتلا اور پستہ قد فرنانڈو کاسٹیلا جس نے اس سے پہلے صرف زبانی حملوں کے مظاہرے دیکھے تھے اس غیر متوقع جسمانی حملے سے بچاؤ کے لیے اپنی ڈیسک کے نیچے دبک گیا۔ خروشیف نے جو بنکارتے جا رہے تھے اسے وہیں جا دبوچا۔ اسی اثنا میں سکیورٹی گارڈز لپک کر آئے اور انھوں نے کاسٹیلا کو خروشیف کی گرفت سے آزاد کیا۔

روسی وفد کے ارکان جب اس ہنگامے کے بعد اپنی قیام گاہ پر واپس آئے، تو ان کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ وفد میں آندرے گرومیکو بھی شامل تھے جو آگے چل کر سوویت یونین کے صدر بنے۔ وہ انتہائی مضبوط اعصاب اور سخت گیر طبیعت کے مالک تھے۔

ایک بار ایک مغربی اخباری نمایندے نے ان سے سوال کیا ''کیا آپ کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہیں آ سکتی؟'' گرومیکو نے اسے یہ مختصر جواب دیا تھا ''آ سکتی ہے، مگر وہ مصنوعی ہوگی۔'' لیکن اس روز گرومیکو کا چہرہ بھی سفید ہو رہا تھا۔

ہر شخص کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ اتنے خراب موڈ کے ساتھ خروشیف کا رویہ اس کے ساتھ کیسا ہوگا۔ لیکن سب یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے کہ خروشیف بالکل نارمل حالت میں تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ لطیفے بازی کر رہے تھے اور زوردار قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک ذاتی معتمد کے پوچھنے پر خروشیف نے بتایا ''اس وقت ایوان پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر ماحول میں زندگی پیدا کرنے کے لیے یہ چال چلی تھی۔'' یہ کہہ کر انھوں نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اس قسم کی ڈرامے بازی سے بعض مقررین اپنے پروگرام یا دلیل کے لیے حمایت حاصل کر لیتے تھے۔ ہم نے ایک لیبر لیڈر کو دیکھا۔ وہ تقریر کا آغاز بڑھے دھیمے سُروں میں کرتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ ان کی آواز اونچی ہوتی جاتی، چہرے کے عضلات سکڑتے، ناک کے نتھنے پھولتے، آنکھیں قہر آلود ہوتیں اور وہ ہوا میں مکے لہرا لہرا کر فل گیئر میں چنگھاڑنے لگتے۔ ہر چھوٹے بڑے کی حسب استطاعت خبر لینے کے بعد ان کی تقریر اس وقت نقطۂ عروج پر پہنچتی جب وہ غیظ و غضب کے عالم میں اپنی قمیص کا گریبان چاک کرتے۔ بقول شاعر

؎ اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

اس کے ساتھ ہی وہ اپنا چشمہ چہرے پر سے کھینچ کر اسے جوتوں سے اس طرح کچلتے جیسے کسی بچھو کو صفحۂ ہستی سے مٹا رہے ہوں۔ اس وقت تک مجمع کے جذبات اپنی انتہا کو پہنچ چکتے۔ ایسے نازک مرحلے پر موصوف ایک جملے میں وہ بات کہتے جس پر تائید درکار ہوتی تھی۔ جواباً ''زندہ باد'' اور ''آوے ای آوے'' کی فلک شگاف صدائیں بلند ہوتیں۔ جذبات سے معمور اس فضا میں سامعین کو مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپتا چھوڑ کے وہ اپنی کار میں (جو ان کی ہدایت کے بموجب پہلے سے اسٹارٹ ہوتی تھی) بیٹھ کر یہ جا، وہ جا۔ گاڑی میں عموماً ان کے دو ایک مصاحبین اور محافظین بھی موجود ہوتے جن کے ساتھ وہ خوش گپیاں کرتے ہوئے جاتے تھے۔ ایسی ہی کیفیت کے لیے شاعر نے کہا ہے (ہماری مراد حمایت علی شاعر سے ہے کہ)

؎ خسن بھی چاہیں اک نئی صورت بنالیتے ہیں لوگ

پلس نوں آکھاں رشوت خور

پلس نوں آکھاں رشوت خور تے فیدہ کی
پچھوں کردا پھراں نکور تے فیدہ کی
جھاڑو نال بناون مور تے فیدہ کی
بوتھی ہو جائے ہور دی ہور تے فیدہ کی
کولوں پان بناون چور تے فیدہ کی
پھڑ کے اندر دین دھسور تے فیدہ کی
اک سونو وچ پھڑ دے نیں، تے پھڑ دے رہین
ست اکو نجا جڑدے نیں تے جڑدے رہین
میں جے چیکاں پاواں شور تے فیدہ کی
پچھو کردا پھراں نکور تے فیدہ کی
بستاں لٹیاں جاندیاں نیں تے صبر شکر
سنگھیاں گھٹیاں جاندیاں نیں تے صبر شکر
گتاں پٹیاں جاندیاں نیں تے صبر شکر
عزتاں لٹیاں جاندیاں نیں تے صبر شکر
جے میں آکھ دیاں کجھ ہور تے فیدہ کی
پچھوں کردا پھراں نکور تے فیدہ کی
کلی پولیس دے وچ ای رشوت خوری نہیں
کہڑا شعبہ اے جتھے ایہہ کمزوری نہیں
کہڑے مال گودامے ہوندی چوری نہیں
کہڑے امبر سر وچ گنج دی موری نہیں
افسرے جے نہ ورتن زور تے فیدہ کی
پلس نوں آکھاں رشوت خور تے فیدہ کی
پچھوں کردا پھراں نکور تے فیدہ کی

(عمیر ابوذری)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ

ایک مرتبہ تخلیے میں انھوں نے ہمیں بتایا کہ جس دن انھیں یہ ڈراما رچانا ہوتا ہے وہ اپنی کوئی بوسیدہ قمیص پہن کر آتے ہیں اور کھوڑی گارڈن سے ایک پرانا چشمہ منگواتے ہیں (آخر مزدور رہنما کا حلیہ بھی تو بنانا ہوتا تھا) ان کے اصلی چشمے کے فریم کی قیمت ڈیڑھ ہزار روپے بتائی جاتی تھی۔

یہ تھے ہمارے بھٹو صاحب

ہمارے ایک سابق وزیراعظم بھی فنِ تقریر کے بادشاہ تھے۔ اپنی کتاب ''دیدہ ور'' میں مولانا کوثر نیازی نے (جو خود بھی گفتار کے غازی تھے) ان کی اس خصوصیت (اور دیگر بے شمار خصوصیات) کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ مذکورہ وزیراعظم جب چاہتے تھے اپنے زورِ بیان کی بدولت حساس سے حساس مسائل پر عوام سے ''منظور ہے، منظور ہے'' کے نعرے لگوالیا کرتے تھے۔ وہ عوام کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ ان کے دورِ حکمرانی میں یہ فقرہ بہت مشہور ہوا تھا کہ پاکستانی عوام کے مزاج کو یا تو انھوں نے سمجھا ہے یا فلم اسٹار رنگیلا نے۔

ہوا یوں کہ ان کی حکومت نے بلوچستان سے سرداری نظام کے خاتمے کا فیصلہ کیا جس کے اعلان کے لیے کوئٹہ میں ایک بہت بڑا جلسۂ عام منعقد کیا گیا۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعظم صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں پہلے لوگوں کے جذبات کو ابھارا اور انھیں اپنے ''انقلابی اقدام'' کی پذیرائی کے لیے تیار کیا۔ جب انھوں نے اپنے طور پر اندازہ لگالیا کہ لوہے پر چوٹ لگانے کا وقت آگیا ہے، تو پورے جوش اور ولولے کے ساتھ بلند آواز میں کہا ''آج سے سرداری نظام ختم۔'' ان کا خیال تھا کہ لوگ پوری طرح گرمائے جا چکے ہیں لیکن شاید ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔ تمام حاضرین لاتعلق سے بیٹھے رہے۔

اس پر وزیراعظم نے مجمع کے دوسری جانب منہ کر کے زیادہ گرج دار صدا لگائی ''صدیوں سے قائم سرداری نظام کا آج خاتمہ ہوگیا ہے۔'' یہ کہہ انھوں نے ایک بار پھر حاضرینِ جلسہ کا جائزہ لیا جو یا تو اس اعلان کے دوررس نتائج سے بے خبر تھے یا اس کی صداقت کے بارے میں شکوک رکھتے تھے لہٰذا بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ لیکن ہمارا لیڈر بھی ہتھیار ڈالنے والا نہیں تھا۔ اس نے فوراً پینترا بدلا اور اگلے ہی سانس میں اعلان کیا ''کل پورے بلوچستان میں چھٹی ہوگی۔'' یہ سننا تھا کہ لوگ دیوانہ وار رقص کرنے لگے اور فضا ''زندہ باد'' اور ''جیوے جیوے'' کے نعروں سے گونج اٹھی۔ یہ سب تماشا بمشکل چند سیکنڈ میں وقوع پذیر ہوگیا۔

ہم نے اپنے بزرگوں سے قائداعظم کے جلسوں کے بارے میں سنا ہے۔ اکثر وہ انگریزی میں تقریر کرتے تھے۔ عوام ان کی بات نہیں سمجھتے تھے لیکن پوری توجہ سے سنتے اور مطلوبہ ردِعمل کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہیں سے ابلاغیات کے مشہور ماہر ایس آئی ہایا کاوا کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ ''الفاظ کے معنی الفاظ میں نہیں، خود ہم میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کوئی شخص ایک لفظ کا ابلاغ نہیں کرسکتا، پوری شخصیت اس کے ساتھ منتقل ہوتی ہے۔''

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کچھ سال پیشتر حکومتی پالیسی یا احکام اور اس سے متعلقہ تفصیلات ایک چٹھی پر تحریر کرائی جاتیں۔ چٹھی بہت سے سمجھ دار اور قابل افسران کی انگریزی کی چھلنی سے چھن کر ڈاک کے سپرد ہوتی۔ چار سے پانچ روز میں پیغام متعلقہ محکموں، افسروں اور اہلکاروں تک پہنچ جاتا۔ امور کی انجام دہی کے لیے بھی مناسب وقت دیا جاتا اور پھر کام کی انجام دہی کی رپورٹ بھی انہی مراحل سے گزر کر حکامِ بالا کے ہاتھوں میں ہوتی۔ اب اس کمپیوٹر، ای میل، فیکس، موبائل میسجز نے کام اور پیغام کی رفتار تیز ترین کر دی ہے۔ افسرانِ بالا بھی چٹھی لکھتے ہی کام کی انجام دہی کی رپورٹ وصولنے کو بے قرار اور کمپیوٹر مکمل گراف بنانے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ بس درمیان میں متعلقہ محکمے کے کارکنان کی بے بسی دیدنی ہوتی ہے۔ جو فون پر پوچھ رہے ہوتے ہیں کہ جناب 'ای میل' پہنچی کہ نہیں۔ اب آگے والے جواب دیتے ہیں نہیں۔ پھر بھیجو! اگر درست بھیجی ہوتی تو پہلے نہ پہنچ جاتی! رفتار تیز ہوتے ہوتے اب اتنی تیز ہو گئی ہے کہ لگتا ہے معاملہ رپورٹنگ، رپورٹنگ اور رپورٹنگ کا ہی رہ جائے گا۔ ہاں دیے گئے کاموں کی انجام دہی کے لیے وقت البتہ ڈھونڈنا پڑے گا۔

صحرائی تحصیل میں 300 جوہڑ کیسے بنے؟

گزشتہ برس حکومت پنجاب ڈینگی کی سرکوبی کے لیے کمر کس کے میدان میں کودی۔ اب ہر تحصیل سے اس میں موجود پانی کے کھلے جوہڑوں کی تعداد مانگی گئی۔ دس افسران سے رپورٹ جمع ہو کر جو

دیکھتے ہیں کارروائی ڈالنے کے ماہر اہلکار اس کا کیا توڑ نکالتے ہیں۔

بے چارے سرکاری ملازمین

اتنا کام کرنے پر نہیں جتنا اس سے بچنے کے بہانے ڈھونڈنے پر وقت لگاتے ہیں

صالحہ محبوب

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

صوبائی سیل میں پہنچی تو ایک تحصیل کے جوہڑ تین سو سے تجاوز کر گئے۔ جب کہ متعلقہ تحصیل مکمل صحرائی علاقے پر مشتمل تھی۔ ہوا یوں کہ ہر افسر نے رپورٹ میں کمی بیشی کے خطرے کے پیشِ نظر دس سے بیس جوہڑوں کا اضافہ کر دیا تھا۔

سبزی منڈیوں میں ہیلتھ ڈیسک کا لطیفہ

حکومت کا حکم آیا کہ سبزیوں کی قیمتوں کو کم رکھنے کے لیے سستے بازار لگائے جائیں جن میں عوام کے لیے ہیلپ ڈیسک ہونے چاہئیں۔ اب یہ پیغام بذریعہ فون تحصیلوں تک پہنچا اور ہیلپ ڈیسک وہاں تک پہنچتے پہنچتے ہیلتھ ڈیسک ہو گیا۔ سستے بازار میں ایمبولینس اور ڈاکٹر کی ضرورت سمجھ سے بالاتر تھی۔ پھر مسئلہ بھی تھا کہ صحت کی سہولیات فراہم کسے کی جائیں۔ سبزیوں اور پھلوں کو یا دکانداروں اور گاہکوں کو۔ اگر ڈاکٹر جا کر بازار بیٹھ جائے تو پولیو مہم کی نگرانی کون کرے۔ جب تشویش بڑھی تو ڈرتے ڈرتے معاملہ پھر حکامِ بالا تک پہنچا، تب جا کر ہیلتھ اور ہیلپ کا فرق واضح ہو پایا۔

اے سی صاحب! کمپیوٹر پہچاننے سے انکاری

سبزیوں کی قیمت میں اضافہ کیا ہوا، انتظامی افسران کی مشکلات مزید بڑھ گئیں۔ حکم ہوا کہ تمام اعلیٰ انتظامی افسران منڈیوں میں خود کھڑے ہو کر بولیوں کا جائزہ لیں، نگرانی کریں اور نہ ہونے کی صورت میں کرائیں۔ کہاں ہمارے سول سروس کے افسر اور کہاں سبزی منڈی کے آڑھتی! بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے! اس حکم پر عمل درآمد کے مفید نتائج کیا برآمد ہوئے اراکین صوبائی اسمبلی کی ڈیوٹیاں بھی افسران کے ساتھ لگا دی گئیں۔ ہر ضلعے کا رکن دوسرے ضلع میں نگرانی کرے گا۔ ساتھ میں ہر ذمہ دار افسر اور ایم پی اے کی تصویر بھی کھینچ کر رپورٹ کے ساتھ بھیجی جائے گی۔ سردی کی ایک دھند زدہ یخ صبح ایک تحصیل میں سرزنش کے فون نے متعلقہ اعلیٰ افسر کو ایسا حواس باختہ کیا۔ عمل درآمد کے بعد الٹی سرزنش کی گئی کہ موصوف نے جعلی بندہ کھڑا کر کے تصویر کھنچوا کر بھیجی ہے۔ تفتیش پر معلوم ہوا کہ روزانہ تو موصوف نہا دھو کر تیار ہو کر نماز کے بعد منڈی پہنچتے تھے۔ اس روز ٹھنڈ اور خرابی طبع کے پیشِ نظر موصوف محض اپنی گرم چادر اچھی طرح لپیٹ کر بغیر تیار ہوئے منڈی پہنچ گئے۔ اب روایتی چادر کی بُکل مارے اے سی صاحب کو کمپیوٹر پہچان ہی نہیں پایا اور دھوکہ دہی کے الزام کے ساتھ موصوف کو لاہور سے تنبیہ کی گئی۔ پھر اے سی صاحب کی وضاحت اور منڈی میں موجود دیگر لوگوں کی گواہیوں نے معاملہ واضح کیا۔

دفتروں میں بیٹھ کر اب رپورٹنگ کیسے ہو گی؟

کمپیوٹر کے بعد موبائل اور اس Android موبائل نے تو بے چارے افسران کی مشکلات میں بے تحاشا اضافہ کر دیا ہے۔ ہر کام کی انجام دہی کی رپورٹ کے ساتھ حکم ہوتا ہے کہ متعلقہ مقام کی تصویر کھینچ کر سسٹم پر اپ لوڈ (Upload) کی جائے۔ تصویر میں مقام اور جائے وقوع دونوں واضح ہوں۔

سو اب دفتر میں بیٹھ کر رپورٹنگ کرنا بھی ناممکن ہو گیا ہے اور افسران کا مبالغہ آرائی کرنا بھی کہ کام کا پتا چل جاتا ہے اور مقام کا بھی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

گڈ گورننس کے نام پر ستم در ستم

پرانے نظام کے تحت بھرتی شدہ افراد کا سروس ریکارڈ اور تنخواہ کے نظام کو گڈ گورننس کے نام پر کمپیوٹرائزڈ کرنا حکومت کا ایک اور ستم ہے۔ پہلے ملازمین ریٹائرمنٹ کے وقت شناختی کارڈ میں تاریخ پیدائش میں کمی کرا کے ملازمت کا دورانیہ بڑھا لیتے تھے اور کئی سال مزے سے نوکری جاری رکھتے۔ اب ہر تنخواہ کے ساتھ تاریخ ریٹائرمنٹ ملازم کو ہر وقت اپنا آخری سال دکھاتی اور یاد دلاتی رہتی ہے۔ متعلقہ تاریخ کے بعد تنخواہ کا اکاؤنٹ خود بخود بند ہو جاتا ہے اور ہزار دہائیوں کے باوجود ملازم کو ریٹائر ہونا ہی پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ کئی بار لوگوں نے 2022ء تک سپریم کورٹ کے کتنے ہی چیف جسٹسوں کو ریٹائر کرا کے لسٹ بھی شائع کر دی ہے۔

حاضری کا بائیومیٹرک نظام۔ کیا نئی مصیبت ہے!

صوبائی حکومت کے حاضری کے نظام کو بائیومیٹرک کرنا بے شک ایک کارنامہ ہے۔ جس کے نفاذ کے آگے ہر ایسوسی ایشن نے بند باندھنے کی کوششیں کیں۔ حکومت نے یہ نظام نافذ کیا کہ ہر سرکاری ملازم صبح حاضری کے لیے کمپیوٹر کے سامنے کھڑا ہو، چھٹی کے وقت بھی۔ ہمارے کچھ نہ کرنے والے اہلکار اس حاضری میں شروع دن سے بے عزتی محسوس کر رہے تھے۔ افسران بھی نالاں تھے اور چھوٹا اسٹاف درجہ چہارم بھی ناخوش، ٹینشن زدہ ہونے کا بہانہ بنایا گیا اور جان کو خطرے کا بھی...... مگر پھر کمپیوٹر جیت گیا۔ ملازم بے چارے لائن بنا روز اس کے آگے کھڑے ہو کر حاضری لگوانے پر مجبور ہیں...... اور بہت سوں کو اب مجبوراً کام کا وقت بھی پورا کرنا پڑتا ہے۔

پٹواریوں پر کیا بیتی

آسمان تو بے چارے پٹواریوں کے سروں پر بھی خوب گرا جن کے تمام اختیارات، صوابدید، بستہ سب دورِ جدید کی ایجاد نے چھین لیا ہے۔ کہیں نادرا ہر شہری کو اس کا شجرۂ نسب کھول کھول کر دکھا دیتا ہے اور نقلی محرم بن کر جانے والے عمرہ اور حج زائرین موقع پر ہی پکڑے جاتے ہیں اور کہیں ون ونڈو آپریشن میں مہینوں نہ ہونے والے کام جیسے زمین کی فرد انتقال دس سے پندرہ منٹ میں ایسے ہو جاتے ہیں جیسے کوئی جن آپ کے ساتھ تھا۔ اسی طرح بچوں کی تاریخ پیدائش میں کمی بیشی پر بھی پابندی کا سامنا ہے۔ چند سالوں میں خاموشی سے اتنی بڑی تبدیلی رونما ہو گئی ہے کہ یار لوگوں کو یقین ہی نہیں آتا۔ بہرحال حکومت خراماں خراماں دورِ جدید میں داخلے میں کامیاب ہو رہی ہے۔ کارنامہ اس کا یہ بھی ہے کہ سادہ، پرانے، فرسودہ پرزوں کو بھی اس سفر میں ٹریننگ کرا کرا کر اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہے۔ ملازم اور افسر بھی خواہی نخواہی اب اس کمپیوٹر، ای میل، فیکس اور (انرائڈ Anroid) ٹیلی فون سے مانوس ہونے لگے ہیں۔ کارروائی ڈالنے کے ماہرین بہرحال مشکل میں ہیں۔ دیکھتے ہیں وہ نئی ٹیکنالوجی کا کیا توڑ نکالتے ہیں۔ اکثر ملازمین بیچارے اتنا کام کرنے پر نہیں جتنا اس سے بچنے کے بہانے ڈھونڈنے پر وقت لگا دیتے ہیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

انجام

فیصل اُس کمرے سے باہر نہیں نکلتا۔ نہ ٹیلی وژن دیکھتا ہے، نہ اخبار پڑھتا ہے۔ کسی کو فون نہیں کرتا، کسی سے رابطہ نہیں رکھتا۔ اُس کی بیوی سلیمہ کو گلا گھونٹ کو مارا گیا تھا۔ سفاکانہ قتل کے بعد فیصل کو اپنا انجام بھی معلوم ہوگیا تھا۔ اُسے پتا ہے، ایک دن اُس کی جان بھی لے لی جائے گی۔ اب وہ اُسی کمرے کے اندر خیالات میں گم رہتا ہے، وہیں سوتا ہے۔ اُس کے لیے کھانا وہیں پہنچا دیا جاتا ہے۔ دن مہینے سال اسی طرح گزر رہے ہیں۔ اُس کی پھانسی میں ابھی دو سال باقی ہیں۔

الم ناک کہانی

کتنی الم ناک کہانی ہے!

مکیش کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا تھا۔

منیشا بھری جوانی میں بیوہ ہوگئی۔ اُن کا کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔ دل کو ڈھارس دینے والی واحد بات یہ تھی کہ مکیش کی جائداد کروڑوں روپے کی تھی۔ منیشا کو اب تنہا کسی بھی طرح اُس دولت کو سنبھالنا تھا، اُسی میں سے خرچ کرنا تھا۔ لیکن سیانے سچ کہتے ہیں، سب کچھ توقع کے مطابق نہیں ہوتا۔ آخری رسومات کے وقت جب پنڈت نے اعلان کیا کہ بیوہ آگے آجائے، تو منیشا نے نوٹ کیا کہ اُس کے ساتھ قطار میں سترہ خواتین تھیں۔

نمک پارے

100 لفظوں کی مکمل کہانیاں مسکراتی، کھلکھلاتی، گدگداتی کہیں کہیں منہ بسورتی، انھیں مبشر نے لکھا ہے ایک محبت بھری نظر ڈالیے۔ ممکن ہے آپ کے لیے بھی اس میں کوئی خبر ہو

مبشر علی زیدی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

الف لیلہ

سب جانتے ہیں کہ وہ بادشاہ ہر رات شادی کرتا اور صبح بیوی کو قتل کرا دیتا تھا۔ ملکہ شہرزاد نے پہلی رات ایک کہانی سنانے کی اجازت مانگی۔ وعدہ لیا کہ قصہ مکمل ہونے تک اُسے قتل نہیں کرایا جائے گا۔ یہ داستان ہزار راتوں تک چلتی رہی۔

لوگ جھوٹ کہتے ہیں کہ وہ داستان مکمل ہوگئی تھی۔ دراصل ہزار راتوں کے بعد ملک شہریار نے اعلان کرایا تھا...... ”آج شہرزاد کو چپ نہ کرایا تو قیامت تک عورتیں ہر رات اپنے شوہروں کے کان کھاتی رہیں گی۔“

یہ اعلان تاریخ سے مٹا دیا گیا۔ البتہ قول سچا ثابت ہوا۔

قیدی

اُس نے اپنے عقب میں دروازہ بند ہونے کی آواز سنی اور سمجھ آگئی کہ اب وہ قیدی ہے۔ آزادی ہمیشہ کے لیے اُس سے روٹھ چکی تھی۔ اُس کے ذہن میں بہت سے باغیانہ خیالات آئے لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ اُسے چاروں طرف سے گھیرا جا چکا تھا۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُس کے ہاتھ بھی رنگے ہوئے تھے۔ ہتھیار ڈالنے کا وقت آگیا ہے، اُسے خیال آیا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار وہ کھو چکی تھی۔

آخر اس نے نکاح نامے پر دستخط کر دیے۔

پناہ گزیں

سوزی مجھے اچھی لگتی تھی۔ میں بے گھر تھی۔ اُس نے مجھے اپنے گھر میں رکھا، سب کچھ دیا۔ میں اظہار تشکر کرنا چاہتی تھی لیکن زبان کا مسئلہ آڑے آجاتا۔ ہم ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ میں کیسے اُسے بتاتی کہ اُس کا شوہر بے وفا ہے۔ اُس دن بھی وہ کسی کے ساتھ کمرے میں تھا۔ سوزی اچانک گھر آگئی۔ میں نے اُس کی توجہ بٹانے کی کوشش کی لیکن وہ سیدھی وہیں جا رہی تھی۔ آخر میں اُس سے لپٹ گئی لیکن اُس نے مجھے پیار سے جھٹک دیا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے بولی......

”شرارتی بلی۔“

سفید پٹی

میرے کبوتر کی طبیعت خراب تھی۔ اُسے پرندوں کے ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر صاحب ایک آپریشن میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد ایک پنجرہ لے کر باہر نکلے۔ پنجرے میں بڑا سا خوب صورت میکاؤ طوطا تھا جس کے پیٹ پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے وہ پنجرہ ایک مضطرب نوجوان کے حوالے کر دیا۔ اُس کے بعد ایک چھوٹا پیکٹ دیا جس میں کوئی چیز لپٹی ہوئی تھی۔ ”کچھ یہ ہضم کر چکا ہے، باقی اس میں موجود ہے۔“ اُنھوں نے اُسے مطلع کیا۔

اُسی وقت میں نے دیکھا، اُس نوجوان کا انگوٹھا غائب تھا۔ سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔

ترمیم

سنہ 2047ء سے گھڑ دوڑ مقابلوں کو نیا عروج ملا ہے۔ ہر سال نئے ریکارڈ بنتے ہیں۔ ہر بار زیادہ رقوم لگتی ہیں۔ گھوڑے ایسے دوڑتے ہیں جیسے موت پیچھے لگی ہو۔ بالکل سچ!

سنہ 2029ء میں دنیا بھر میں پروٹین کے بحران کے بعد نیا قانون بنایا گیا تھا۔ جیتنے والے گھوڑے پر رقم لگانے والوں کو ہارے ہوئے گھوڑے کا گوشت پیش کیا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جاتا تھا۔ اٹھارہ سال تک یہ کھیل بہت مزے سے چلتا رہا۔ اُس کے بعد قانون میں ترمیم ہوئی۔

اب جو حشر گھوڑے کا ہوتا ہے، وہی اُس کے سوار کا ہوتا ہے۔

اطلاع

جیسے ہی حادثہ ہوا، میں سیدھا گھر بھاگا تاکہ اپنی بیوی کو اس کی اطلاع دوں۔ لیکن گھر پہنچ کر میرے مُنہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکا۔ میری بیوی بھی اپنے خیالات میں گم تھی۔ وہ بالکونی میں کھڑی تھی۔ سامنے سورج غروب ہو رہا تھا۔ پتا نہیں کیا سوچ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کیسے بتاؤں؟ میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اُسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔

میری بیوی چونکی اور اُس نے کال ریسیو کی۔ پھر فون اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میرے مرنے کی خبر سن کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کون

دنیا کا آخری آدمی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔

آخری آدمی...... جس کے پاس سب کچھ تھا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ پوری دنیا کی دولت کا تنہا مالک تھا اور پوری دنیا میں کوئی اُس کا جوڑی دار نہیں تھا۔ ایک وقت تھا کہ دنیا کی آبادی آٹھ ارب تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن پھر ایک الم ناک حادثے نے یہ رنگین دنیا اجاڑ دی۔ سات ارب ننانوے لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے افراد فنا ہوگئے۔ بس ایک بچا۔ وہ آخری آدمی اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

آپ کے ہونٹوں پہ جو مسکان وغیرہ

مرد ہوتی چاہیے، خاتون ہونا چاہیے
اب گریمر کا یہی قانون ہونا چاہیے
نرسری کا داخلہ بھی سرسری مت جانیے
آپ کے بچے کو افلاطون ہونا چاہیے
رات کو بچے پڑھائی کی اذیت سے بچے
ان کو ٹی وی کا بہت ممنون ہونا چاہیے
دوستو انگلش ضروری ہے ہمارے واسطے
فیل ہونے کو بھی اک مضمون ہونا چاہیے
صرف محنت کیا ہے انور کامیابی کے لیے
کوئی اوپر سے بھی ٹیلی فون ہونا چاہیے

☆

ہے آپ کے ہونٹوں پہ جو مسکان وغیرہ
قربان گئے اس پہ دل و جان وغیرہ
بلی تو یونہی مفت میں بدنام ہوئی ہے
تھیلے میں تو کچھ اور تھا سامان وغیرہ
بے حرص و غرض فرض ادا کیجیے اپنا
جس طرح پولیس کرتی ہے چالان وغیرہ
اب ہوش نہیں کوئی کہ بادام کہاں ہے
اب اپنی ہتھیلی پہ ہیں دندان وغیرہ
کس ناز سے وہ نظم کو کہہ دیتے ہیں نثری
جب اس کے خطا ہوتے ہیں اوزان وغیرہ
ہر شرٹ کی بُشرٹ بنا ڈالی ہے انور
یوں چاک کیا ہم نے گریبان وغیرہ

(انور مسعود)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

نظارہ

ٹرین چھک چھک کرتی دوڑتی چلی جارہی تھی۔ اُس کا خوب صورت انجن غراتا جارہا تھا، چمنی سے دھواں اُگلتا جارہا تھا۔ پندرہ بوگیوں کی ڈوریں اُس سے بندھی ہوئی تھیں۔ تمام بوگیوں پر رنگین نقش بنے ہوئے تھے۔ دونوں جانب دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں پھولوں کے قطعے بچھے تھے۔ نیلے آسمان پر سُرمئی بدلیاں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ اُس جنت نظیر وادی سے گزرنے والے مسافروں کا تجربہ خوش گوار رہا ہوگا۔ اُن کے منہ سے تعریفیں نکل رہی ہوں گی اور میرے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں، کیونکہ میں پٹڑی پر بندھا ہوا تھا۔

پُرامن

کوئی اخبار والوں کو جا کر بتائے! آج شہر میں قتل کی ایک بھی واردات نہیں ہوئی۔ کوئی بینک نہیں لوٹا گیا۔ کسی شخص سے موبائل فون نہیں چھینا گیا۔ کوئی بھتا وصول کرنے نہیں آیا۔ کہیں دستی بم نہیں پھینکا گیا۔ ہوائی فائرنگ تک سنائی نہیں دی۔ ایک بار بھی ایمبولینس کا سائرن نہیں گونجا۔ سڑکوں پر کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ آخری حادثہ آج سے تین دن پہلے ہوا تھا۔ اُس کی تفصیل تو کسی کو معلوم نہیں......

لیکن کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ......

شہر میں قائم ''پُرامن ایٹمی مرکز'' میں......

پتا نہیں کیسے ایک بم پھٹ گیا تھا!

میاؤں

''مجھے مانو بلّی چاہیے۔'' میں بچپن میں امی سے ضد کیا کرتا تھا۔ مجھے بلّیاں اچھی لگتی تھیں۔ امی نے کبھی میری بات نہیں مانی۔ میں نے بلّیوں کی تصاویر والی بہت سی کتابیں جمع کر لیں۔ اسکول کے زمانے میں ایک بلّی کے بارے میں کہانی بھی لکھی تھی۔ میری پہلی کہانی کا عنوان تھا ''میاؤں۔'' برسوں بعد میری امی اور بہنوں نے میرے لیے ایک لڑکی پسند کی۔ میں نے پوچھا، ''اُس لڑکی کا نام کیا ہے؟''

''نام تو تسنیم بانو ہے۔'' ایک بہن نے بتایا۔

''لیکن بلّی آنکھوں والی اُس لڑکی کو گھر میں سب ''مانو'' کہتے ہیں۔''

نیا ڈومین

وہ انٹرنیٹ کمپنی کے دفتر پہنچا اور ڈومین نیم رجسٹر کرانے کی خواہش ظاہر کی۔ ''آپ کس نام سے رجسٹر کرانا چاہیں گے؟'' بکنگ منیجر نے پوچھا۔ ''اپنے ہی نام سے۔'' ''کیا نام ہے آپ کا؟'' ''رشید خان۔''

''رشید خان ڈوٹ پی پی پی دستیاب نہیں ہے۔''

''ڈوٹ پی پی پی دستیاب نہیں ہے۔''

''ڈوٹ پی ایم ایل این؟''

''وہ پہلے سے کسی اور کے پاس ہے۔''

''ڈوٹ ایم کیو ایم؟''

''آئی ایم سوری۔''

''ڈوٹ اے این پی؟''

''آپ نئے ڈومین کے بارے میں کیوں نہیں سوچ رہے؟''

''نیا ڈومین؟ مثال کے طور پر؟''

''رشید خان ڈوٹ ٹی ٹی پی۔''

''اں! اچھا! ٹھیک ہے۔ کتنے پیسے ہوئے؟''

مہم جو

مجھے خطروں سے کھیلنے کا شوق ہے۔ 2009ء میں الپس کی چوٹی سر کرتے ہوئے پھسل گیا تھا۔ دس بارہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ہڈیاں ٹوٹیں۔ ایڈونچر کا جذبہ سلامت رہا۔

2010ء میں لندن گراں پری موٹر ریس میں شرکت کی۔ گاڑی میں آگ لگنے سے بُری طرح جھلس گیا۔ ریس ہار گیا لیکن زندگی جیت گیا۔

2012ء میں جنوبی افریقا کے جنگل میں دو شیر شکار کیے، ایک چیتا مارا، خوں خوار ریچھ کے ہاتھوں مرتے مرتے بچا۔ اس سال پاکستان جا رہا ہوں۔

لانڈری

سرکاری افسر کے بیٹے نے تھیلا لانڈری شاپ کے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ بڑے میاں نے تھیلے میں جھانک کے دیکھا اور اسے نیچے ڈال دیا۔

انھوں نے نوجوان کو کوئی رسید نہیں دی۔ اعتبار بڑی چیز ہوتا ہے۔

''پرسوں شام پانچ بجے کے بعد آنا۔''

سرکاری افسر کا بیٹا اُس دن شام ساڑھے چھ بجے آیا۔ بڑے میاں نے اُسے گتے کے دو ڈبے دیے، جو پانچ پانچ ہزار روپے کے نئے نوٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ ایک قانونی کاروبار کا قانونی منافع تھا، رسیدوں کے ساتھ۔

بہت سے احمق اُس لانڈری میں کپڑے دھلوانے بھی آجاتے ہیں۔

دل

پہلے میں بہت نرم دِل والا تھا۔ کاروبار سے جتنی آمدنی ہوتی تھی، اُس کا بڑا حصہ غریبوں میں بانٹ دیتا تھا۔ ایک دن میرا بونڈ لگ گیا۔ ساڑھے سات کروڑ روپے کا۔

اتفاق سے اُسی دن کسی نے میرا دِل چوری کر لیا۔

ڈاکٹر نے کہا، ''اگر پرانا دِل مل بھی گیا، تو نصب ہونا مشکل ہے۔ آپ کو نیا دِل لگوانا پڑے گا۔''

کئی طرح کے دِل دستیاب تھے۔ فوم کے، مٹی کے، سونے کے، ہیرے کے۔ میرے پاس بہت پیسے تھے اس لیے ہیرے کا دِل خرید لیا۔

پتا نہیں کیوں، لوگ اب مجھے سنگ دل کہتے ہیں!

مقابلہ

ٹیک آف ٹھیک نہیں ہوا تھا، کمپیوٹر نے بتا دیا تھا۔

لیکن ہوائی جہاز میں ریورس گیئر نہیں ہوتا۔

آگے بڑھنے کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

پرواز ناہموار تھی۔ موسم کا ارادہ بھی اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

اُس نے تشویش سے اسکرین پر جلتی بجھتی بتیاں دیکھیں۔ پھر ایک دھماکا سنائی دیا اور طیارہ ڈولنے لگا۔ عقب میں نہ جانے کیوں شور ہونے لگا۔ اُس کے ماتھے پر پسینا آگیا، اعصاب جواب دینے لگے۔ وقت کم تھا اور مقابلہ سخت! پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

کمپیوٹر اسکرین پر لکھا ہوا آگیا، ''ٹائم آؤٹ، گیم اوور۔''

اَن ہونی

''وہ کبھی مجھے اپنی بانہوں میں ایسے نہیں لے گا جیسے اس گٹار کو لیتا ہے۔'' اُس نے مایوسی سے سوچا اور اُس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

پھر اُسے کوئی خیال آیا۔ اُس نے آنکھیں صاف کیں اور گٹار لے کر بیٹھ گئی۔ پورا دن ان ہونی کو ہونی کرنے میں لگی رہی۔

اُس نے اپنا آپ مٹا ڈالا اور گٹار کے اندر چھپ گئی۔

اُس نے سوچا، اِس طرح وہ ایک بار محبت سے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مجھے اپنی بانہوں میں لے گا۔

شام ہوئی اور وہ خوشی سے آوازیں لگاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ ''ڈارلنگ، دیکھو میں نیا گٹار خرید لایا ہوں۔''

آخری الفاظ

وہ تیز رفتاری کی ساری حدیں توڑتی ہوئی ہسپتال پہنچی۔ اُس کا شوہر ایک حادثے میں شدید زخمی ہوگیا تھا۔ فون کرنے والے نے کہا تھا کہ جلدی پہنچیں۔ اُسے سمجھ آگئی تھی کہ جلدی پہنچنا کیوں ضروری ہے۔

ڈیوٹی ڈاکٹر اُسے ایمرجنسی وارڈ کے باہر مل گیا۔

''مجھے بہت افسوس ہے۔'' وہ سچ مچ بہت غم زدہ لگ رہا تھا۔ ''انھوں نے آپ کو بہت یاد کیا۔ اُن کے آخری الفاظ تھے، مجھے تم سے محبت ہے جمیلہ۔''

اُس کی آنکھیں جلنے لگیں، اُن میں گرم پانی بھر گیا اور پھر شکیلہ تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل آئی۔

کیش

شوہر کے مرنے پر انشورنس کے بیس لاکھ اُسے ملنے تھے۔ وہ کبھی ایسا نہ سوچتی۔ اُس بد دماغ آدمی کے ساتھ کسی نہ کسی طرح گزارا کر رہی تھی۔ لیکن مالی مشکلات کا حاصل ضرب بہت سی تلخیاں تھیں۔ اُس نے کریڈٹ کارڈ سے رقم نکالی اور کرائے کے قاتل کو ادا کر دی۔ شوہر کے مرنے کے بعد وکیل نے بتایا، وہی ہر چیز کی وارث تھی۔

''لیکن انشورنش کے کاغذات نہیں مل رہے۔ کیا وہ آپ کے پاس ہیں؟''

اُس نے پوچھا۔

''نہیں، انشورنش پالیسی تو انھوں نے مالی مشکلات کے سبب کیش کروالی تھی۔ آپ کو نہیں بتایا؟''

ہمارے جیسا

وہ سیارہ بالکل ہمارے جیسا ہے۔

اپنے ستارے سے انتہائی مناسب فاصلے پر۔

آکسیجن بھی ہے اور پانی بھی۔

پہاڑ اور صحرا بھی، دریا اور جنگل بھی۔

کچھ رینگنے والے، اُڑنے والے اور تیرنے والے جان دار بھی۔

لگتا ہے وہاں کوئی ذہین مخلوق بھی رہتی تھی۔

لیکن اُس کی پوری نسل کسی آفت میں ماری گئی۔

یہ سیارہ ہمارے لیے قدرت کا تحفہ ہے۔

وہ مخلوق زندہ ہوتی تو کیا پتا ہماری دشمن بن جاتی!

سچ کہتا ہوں، وہ سیارہ بالکل ہمارے جیسا ہے۔

ہاں! ایک فرق ہے۔

ہمارے سیارے کے تین چاند ہیں اور اس کا صرف ایک!

خیر مقدم

پندرہ امیر ترین افراد نے ایک ایک ارب ڈالر کا ٹکٹ خریدا تھا۔ خلائی جہاز کی منزل لاکھوں میل دور تھی۔

اس وسیع کائنات میں صرف دوسرا مقام، جہاں زندگی کا سراغ مل گیا تھا۔ ایک بڑے سے سیارے کا چاند، جہاں پانی بھی تھا اور اُسے پینے والے بھی۔

سوال تھا، ''خلائی مخلوق سے پہلا رابطہ کون کر کے تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا؟''

جواب ملا ''راکٹ کی تیاری میں مالی تعاون کرنے والے۔''

راکٹ پر لگے ہوئے کیمروں نے سارا منظر زمین والوں کو تقریباً براہِ راست دکھایا۔ خلائی مخلوق صرف پندرہ منٹ میں پندرہ انسانوں کو کھا گئی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ادیبوں کی حیران کر دینے والی عجیب عادات

شاہد محمد شاہد

ادب کا انسان کے ساتھ بہت گہرا رشتہ ہے۔ ہر دور کا ادب اپنے عہد کا آئینہ ہوتا ہے۔ کامیاب ادیب اسی کو کہا جاتا ہے جو اپنی تحریروں میں اپنے اردگرد پیش رُونما ہونے والے واقعات، معاشرتی رویوں اور بدلتے رجحانات کی تہذیبی اقدار اور طرزِ زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کی بھرپور عکاسی کر سکے۔ شاید اسی لیے ادیب کو اپنے عہد کا حقیقی عکاس سمجھا جاتا ہے۔ ادیب اور قاری کا رشتہ اسی صورت میں مستحکم ہو سکتا ہے جب پڑھنے والے کو اس کی تحریروں میں اپنی زندگی کی تصویر نظر آئے اور وہ ان تحریروں کو اپنے دل کی آواز سمجھے۔

وہ لوگ جو ادب سے لگاؤ رکھتے ہیں اور مطالعے سے جن کو خاص شغف ہے وہ یقیناً مشہور و معروف ادیبوں کی کتابوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہیں۔ لیکن لکھتے وقت یہ بڑے ادیب جو عجیب و غریب طریقے اختیار کرتے ہیں، ان سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ حالانکہ وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ یہ ادیب لکھتے وقت نہایت منفرد اور دلچسپ انداز اختیار کرتے تھے اور عام قاری بھی یقیناً جاننا چاہتا ہے کہ اُس کا پسندیدہ ادیب کیسے اتنی منفرد و شاہکار تحریریں تخلیق کر ڈالتا ہے۔

ادیبوں کے منفرد انداز

اس مضمون میں ہم ان چند مشہور ادیبوں کے متعلق جاننے کی کوشش کریں گے جو بڑے انوکھے انداز سے اپنے ادبی شہ پارے تخلیق کرتے تھے۔

اُردو کے مشہور اور منفرد افسانہ نگار سعادت حسن منٹو لکھتے وقت صوفے پر بیٹھ کر دونوں گھٹنے سکیڑ لیتے اور ایک چھوٹی سی پنسل سے لکھتے۔ افسانہ شروع کرنے سے پہلے وہ 786 ضرور لکھتے تھے جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔

اُردو کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار کرشن چندر تنہائی میں کمرا بند

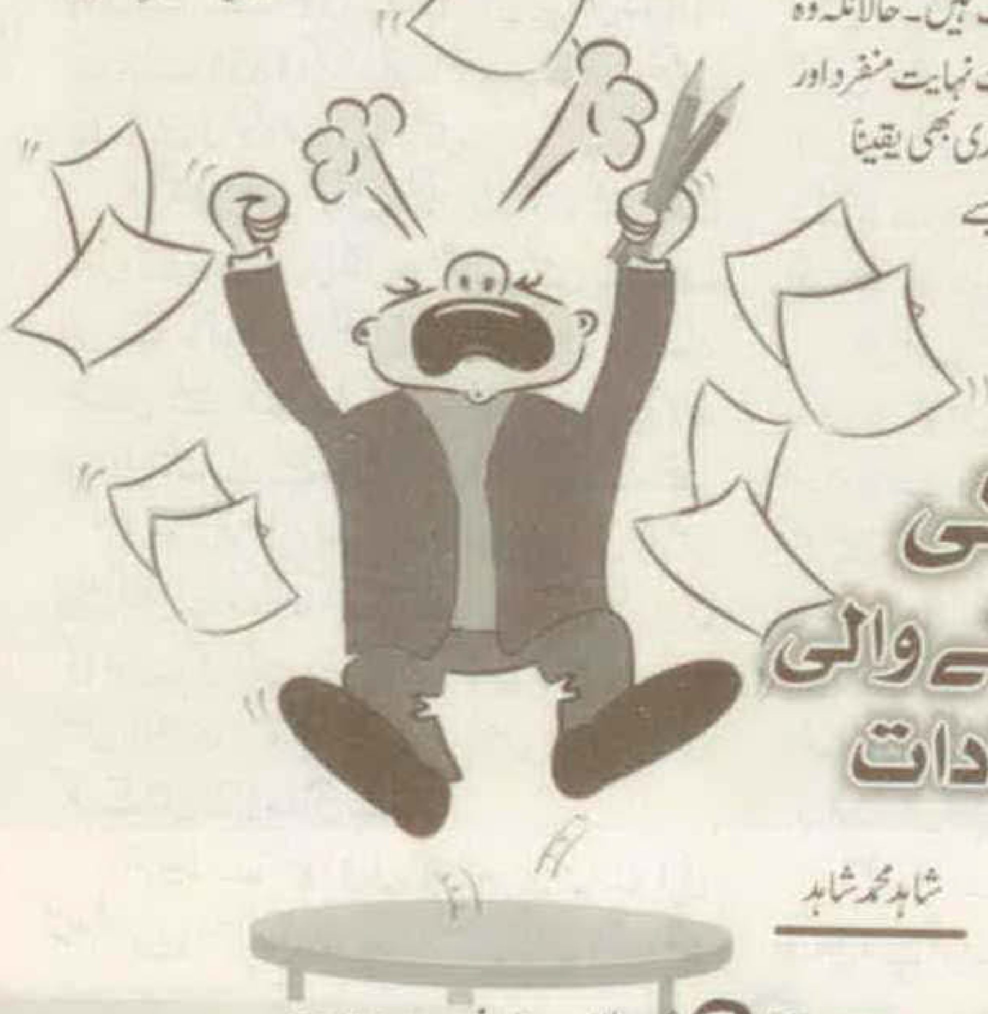

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کر کے لکھتے تھے۔ ایک بار ان کی بیگم نے چپکے سے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ بتاتی ہیں کہ کرشن چندر ارد گرد سے بے خبر اپنے لکھنے کے پیڈ پر جھکے ہوئے تھے۔ اس لمحے ان کا چہرہ بہت گمبھیر، بھیانک اور اجنبی سا لگا، تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں، ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ میں قلم خنجر کی طرح نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد کرشن چندر کمرے سے نکلے اور سیدھے کھانے کی میز کی طرف آئے۔ اس وقت ان کا چہرہ پُرسکون، تازہ اور بہت معصوم تھا۔

فرانسیسی ناول نگار وکٹر ہیوگو کی یہ عادت تھی کہ وہ لکھتے وقت سیدھے کھڑے ہوجاتے اور لکھنے کے لیے اپنے کندھے جتنی اونچی میز (ڈیسک) استعمال کرتے۔ ونسٹن چرچل بھی ابتدا میں لکھتے وقت اسی قسم کا انداز اپناتے تھے۔

انگریزی کے مشہور ادیب آسکر وائلڈ تو سب سے بازی لے گئے۔ انہوں نے اپنا سالِ پیدائش 1854ء کے بجائے 1856ء کرلیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں کے سامنے خود کو کم عمر ثابت کرسکیں۔

فرانسیسی ناول نویس الیگزینڈر ڈوما لکھتے وقت لیموں کے علاوہ اور کسی پھل کا مشروب نہیں پیتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ الیگزینڈر ڈوما رسالوں کے لیے مضامین لکھتے وقت گلابی کاغذ، اپنی شاعری پیلے کاغذ اور ناول کے لیے نیلے رنگ کا کاغذ استعمال کرتے تھے۔

اردو کے منفرد اور ممتاز مزاح نگار شفیق الرحمٰن ہمیشہ کھڑے ہوکر لکھا کرتے تھے۔ اسی طرح انگریزی کی ادیب کیرولین وتیج وڈ کہتی تھیں کہ لکھتے ہوئے بعض اوقات ریڈیو سُننے سے انہیں خیالات مجتمع کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

آئرلینڈ کے مشہور ناول نگار جیمز جوائس نے اپنی تمام تحریریں بستر پر اُلٹے لیٹ کر لکھیں۔ ان کا کہنا تھا:

”میں اس طریقے سے لکھتے ہوئے آرام محسوس کرتا ہوں۔“

بچوں کے عظیم محسن حکیم محمد سعید عام طور پر رَف لکھتے وقت اشتہارات کے پچھلے حصے کا اِستعمال کرتے تھے۔ یہ اشتہارات مختلف اخبارات میں ہوتے تھے یا عموماً ایڈورٹائزنگ کے لیے لوگ ان کا اِستعمال کرتے تھے۔ حکیم صاحب کے بقول۔ ”یہ قوم ابھی اتنی امیر نہیں ہوئی کہ بہترین کاغذ کا استعمال کرسکے۔“ حالانکہ حکیم صاحب کے پاس کِس چیز کی کمی نہ تھی لیکن اُن کی یہ بات اِس قوم کو سادگی اور کفایت شعاری کا درس دیتی ضرور نظر آتی ہے۔

کئی ادیب و شاعر لکھتے وقت سگریٹ کا اِستعمال کرتے تھے کیونکہ اُن کے مطابق سگریٹ اُن کے دماغ کو متحرک رکھتی ہے۔ حالانکہ اسی سگریٹ نوشی کی وجہ سے وہ مہلک بیماریوں میں مبتلا رہے۔

میں ایک بک سٹال پر کھڑا تھا۔ اسی دوران ایک شخص سے مختلف ادیبوں کے حوالے سے بات چیت شروع ہوگئی۔ جب اُسے پتا چلا کہ میں لکھتا ہوں، تو اُس نے سگریٹ سُلگائی اور مجھے آفر کی۔ جب میں نے کہا بھائی صاحب میں سگریٹ نہیں پیتا، تو کہنے لگا۔ ”حیرت ہے، آپ لکھتے ہیں مگر سگریٹ نہیں پیتے۔“

اسی طرح بعض ادیب لکھتے ہوئے چائے پینے کے عادی ہوتے ہیں۔ مشہور ادیب ایڈگر رائس اپنی دلچسپ اور چونکا دینے والی کہانیاں چائے کی بے شمار پیالیاں پی کر لکھتے تھے۔ فرانسیسی ادیب بالزاک چائے کے بجائے کافی پیتے تھے۔ وہ آدھی رات سے لے کر اگلے دن کی دوپہر تک لکھا کرتے تھے۔ اس دوران وہ کافی کی لاتعداد پیالیاں پی جاتے۔ ایک دفعہ انہوں نے مذاقاً کہا تھا۔ ”میں کافی کی دس ہزار پیالیاں پی کر مروں گا۔“

بعض ادیب ایسے بھی گزرے ہیں جو لکھنے کے دوران اپنے قریب سیب یا شہد رکھتے تھے۔ اس کی وجہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

یہ تھی کہ سیب یا شہد کی خوشبو سونگھنے سے ان کے خیالات کو تحریک ملتی تھی۔

ایک زمانہ تھا، جب ادیب اتنے نازک مزاج ہوتے تھے کہ بلی کی میاؤں میاؤں اور مُرغ کی کُکڑوں کوں سے پریشان ہوجاتے اور ایک دم ان کے قلم رُک جاتے۔ آپ اسے ملکہ وکٹوریہ کا دور کہہ سکتے ہیں۔ تاہم آج کے بیشتر ادیب لکھتے وقت اردگرد ہلکا پھلکا شور گوارا کرلیتے ہیں، شاید وہ شور کے عادی ہوگئے ہیں۔

معروف ادیب جے بی پریسٹلے صرف کسی تحریر کو درست کرنے یا دستخط کرنے کے لیے پنسل استعمال کرتے تھے۔ اس کے برعکس لارڈ ڈیوڈ سسلی نے اپنی طویل سوانح عمری پنسل سے لکھی تھی۔

اُردو کی مشہور افسانہ نگار، ڈراما نگار عصمت چغتائی اوندھی لیٹ کر لکھتی تھیں اور لکھتے ہوئے عموماً برف کی ڈلیاں چباتی جاتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ڈلیاں چبانے سے میرے ذہن میں نت نئے خیالات آتے ہیں۔

مشہور انگریز ادیب جارج برنارڈ شا ابتدا میں اس قدر شرمیلا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کو ملنے سے بھی گھبراتا تھا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ اپنے دور کا بہترین مقرر تھا۔

انگریزی کے ادیب ڈیکسٹر اپنی تحریر میں کاما، فل اسٹاپ اور ڈیش وغیرہ نہیں لگاتے تھے۔ وہ اپنی تحریر میں انگریزی لکھائی کے اس قاعدے کا بھی لحاظ نہیں رکھتے تھے کہ ہر نیا جملہ بڑے حروفِ تہجی سے شروع ہو۔ اس وجہ سے ان کی تحریر ایک طویل ترین جملہ لگتی تھی۔ ان کی کتاب کے ناشر نے ایک دفعہ پریشان ہوکر انہیں لکھا کہ اس میں نہ تو کاما ہے، نہ فل اسٹاپ، میں کیا کروں؟ ڈیکسٹر کو تاؤ آگیا۔ انہوں نے کچھ کاغذوں پر بے شمار کاما، ڈیش، فل اسٹاپ وغیرہ لکھے اور انہیں ناشر کو اس نوٹ کے ساتھ روانہ کردیا کہ جہاں جہاں ضرورت ہو، وہ اس کاغذ سے کاما، ڈیش اور فل اسٹاپ وغیرہ لے لے۔

برطانیہ کے معروف ادیب کومپٹن میکنزی لکھتے وقت پس منظر میں کلاسیکی موسیقی کی دُھنیں سُنا کرتے تھے۔ میکنزی کا کہنا تھا کہ ایسی موسیقی اس کے خیالات کو توانائی بخشتی ہے۔

اب تو کمپیوٹر کا دور آگیا ہے، لیکن اگلے وقتوں میں تحریر صاف رکھنے کے لیے عموماً ٹائپ رائٹر استعمال کیا جاتا تھا۔ مشہور ادیب چارلس ڈکنز اس کا استعمال نہیں جانتے تھے، اس لیے ڈکنز کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں پڑھنا بہت دشوار ہوتا تھا۔ ان کی تحریریں خاردار تاروں کی طرح اُلجھی ہوئی نظر آتیں۔ یقیناً ڈکنز کی تحریروں نے ناشرین کو بڑا پریشان کیا ہوگا۔ چارلس ڈکنز کے بارے میں یہ پڑھ کر آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ اگر اس کے بستر کا رُخ شمال کے بجائے مشرق یا مغرب کی طرف کر دیا جاتا، تو اسے نیند ہی نہیں آتی تھی۔ وہ تمام رات جاگ کر گزار دیتا لیکن جب بستر کا رُخ شمال کی طرف کردیا جاتا، تو وہ گہری نیند سو جاتا تھا۔

سب سے عجیب عادات و حرکات اُن ادیبوں کی تھیں جو خاص قسم کے ماحول میں خاص قسم کا لباس پہن کر لکھتے تھے۔ مثلاً مشہور ادیب ڈیوما لکھتے ہوئے ایک اونچی لمبی ٹوپی، پھول دار جاپانی چوغے کے ساتھ پہنتے۔ وہ کہتے تھے:

”میرے آدھے خیالات اس ٹوپی کے اندر ہوتے ہیں اور آدھے اِس چوغے میں، جو میں روحانی مناظر لکھتے وقت پہنتا ہوں۔“

مختصر افسانے کے بانی مشہور مصنف ایڈگر ایلن پو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ لکھتے وقت اکثر اپنی پالتو بلی کو کندھے پر بٹھالیتا تھا۔

○○○

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اتاتُرک

ائیر پورٹ پر جونہی میری متجسس آنکھوں نے دائیں بائیں اور مضطرب قدموں نے منی چینج آفس کی تلاش میں آگے پیچھے ہلنے کی کوشش کی تو سیما پیروز نے کسی قدر خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

’’کمبخت ذرا دم تو لے لو۔ چھری تلے گردن آ گئی ہے تیری کیا۔ رات بھر کے سفر نے ادھ موا کر دیا ہے۔ ہوٹل والوں کا کوئی بندہ بھی باہر انتظار میں ہوگا۔ چھوڑ گیا تو اور سیاپا پڑ جائے گا۔ پہلے ٹھکانے پہنچو صورت حال کو واضح ہونے دو۔ یورو (یورپین کرنسی) ڈالر کا پتا تو چلے۔ ریٹ کیا ہیں؟ ناواقفیت میں کہیں ہاتھ ہی نہ ہو جائے۔‘‘

بات تو ٹھیک ہی تھی۔ سو ٹھک سے دل کو لگی۔ ’’چلو اچھا‘‘ کہتے ہوئے میں نے ٹرالی کا رُخ باہر جانے والے راستے کی طرف موڑ دیا۔

آر بوائے ہوٹل میں ریسپشن پر کھڑی لڑکی بڑی چھمک چھلو قسم کی چیز تھی آنکھیں تو گویا ماتھے پر رکھی ہوئی تھیں۔ کسی لگی لپٹی اور لحاظ کے بغیر صورت حال کو واضح

لُٹنا میرا استنبول کے کیپلی کارسی میں

ایک سادہ دل سیاح کا ماجرا
اس کا واسطہ ایک چور سے پڑ گیا تھا

سلمٰی اعوان

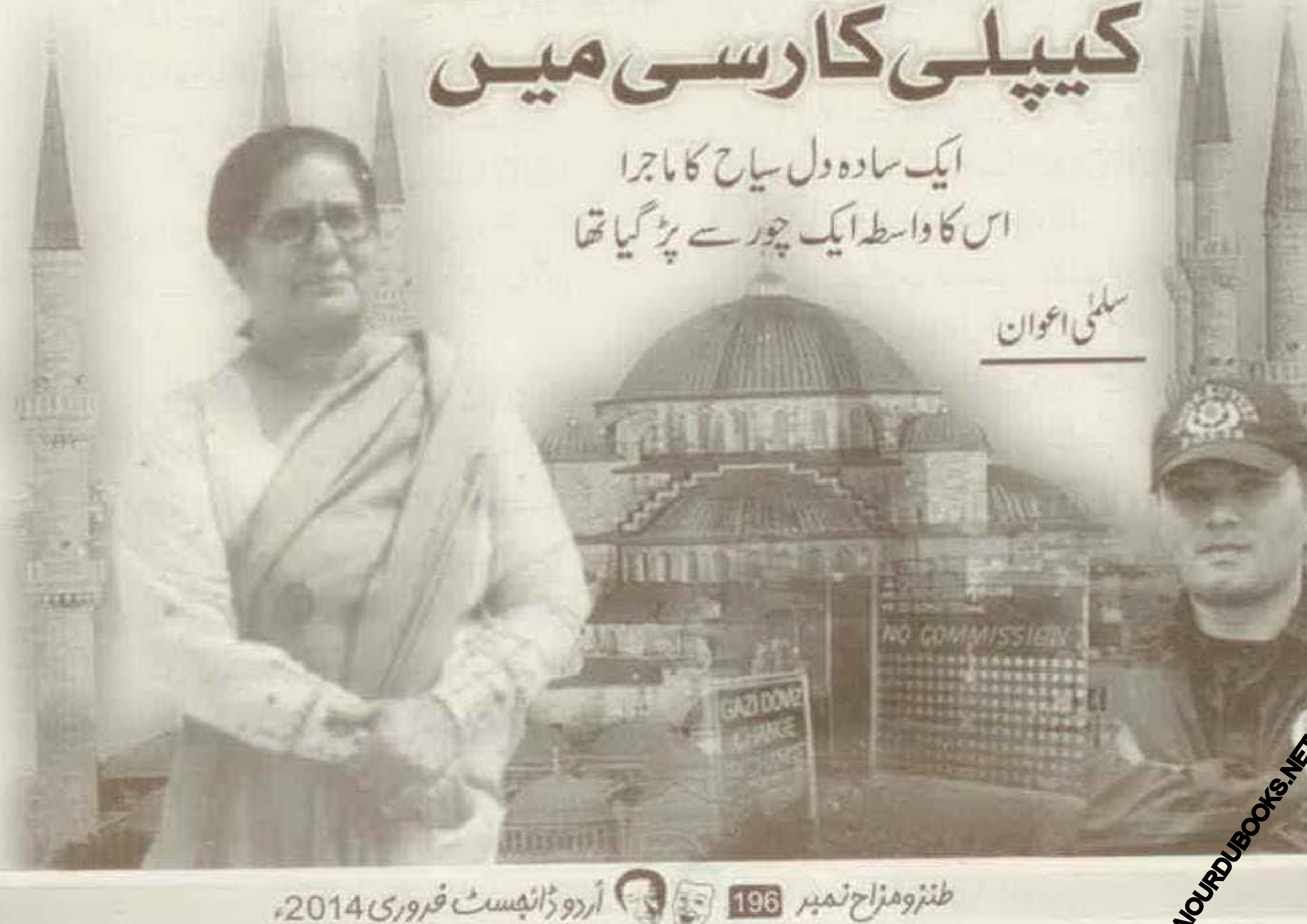

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کر دیا۔ ایک یورو 1.74 اور ایک ڈالر 1.35 ۔ جبکہ بینک سے اس کا 1.85 اور 1.45 ملنے کا امکان تھا۔ لیکن دن اتوار کا تھا اور بینک بند۔ سیما نے سو یورو کو بدلوایا اور کھاتے کو مشترکہ کر دیا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مزار کی زیارت اور شام کو باسفورس کے آخری دہانے پر بیٹھ کر ہواؤں کے جھلار میں آبنائے کے اندر سٹیمر جہازوں میں لوگوں کی لدلدائی اُترائی اور اُس کے دونوں کناروں پر پھیلے ایشیا اور یورپ کی خوبصورتیوں سے اپنی آنکھیں سینکتے اور اپنے ارد گرد پھیلی مچھلی ، برگر، اُبلے بھٹوں اور بہت سی ایسی دوسری چیزوں جن کے ذائقوں اور ناموں سے شناسائی نہ تھی، کی خوشبوئیں سونگھتے مجھے احساس ہوا تھا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی خریداری کے لیے بیگ میں سے نوٹ نکالنے، دینے، لینے، ہتھیلی پر رکھی غیر ملکی ریزگاری گننے اور حساب کتاب کرنے میں تھوڑا سا بھیجا لڑانے کا تو ایک اپنا چارم ہے۔

سورج کی الوداعی کرنیں تاحدِ نظر پھیلے پانیوں کو زرنگار بنانے کے بعد اب کہیں اور اپنی جلوہ گری کی نمائش کے لیے رُخصت ہوگئی تھیں۔

اذان کی دلکش آواز نے میرے سارے شریر میں وہ لطیف اور گداز سا ارتعاش پیدا کیا تھا جس نے مجھے وحدت ملّتِ اسلامیہ کی اُس زنجیر میں پروئے ہوئے ہونے کا احساس دیا جو رنگ نسل اور جغرافیائی حدوں سے بالا ہے۔

یہی وہ وقت تھا جب میرا مُومُو عدنان میندریس کا شکر گزار ہوا جس نے اقتدار میں آنے کے بعد عصمت انونو کے ترکی زبان میں دی جانے والی اذان کے حکم کو ختم کیا۔

”اب اگر یہ اس وقت ترکی زبان میں ہوتی تو میرے پلّے کیا خاک پڑنی تھی۔ اس اجنبی سرزمین پر اپنائیت کی میٹھی سی جذباتی کیفیت بھلا کیوں کر پیدا ہوسکتی تھی؟“

اللہ اکبر اللہ اکبر میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ میں نے اُٹھتے ہوئے سیما سے کہا۔

”آؤ سجدہ کریں۔ قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کی اُس سرزمین پر جس کی فتح کی بشارت میرے پیارے نبیؐ نے دی تھی۔“

اور جب میں ایمی نونینی جامع (مسجد) کے اندر اُس کے طرزِ تعمیر اور تزئین کاری کے حُسن و جمال کو دیکھتی تھی، مجھے کچھ یاد آیا تھا۔

”ہاں سیما دیکھو صبح سب سے پہلا کام کرنسی بدلوانے کا کرنا ہے۔“

جب رات کو ٹرام میں سفر کے مزے لُوٹتے ہوئے ہم واپس ہوٹل پہنچے ۔ ریسپشن پر کھڑے لڑکے نے ایک بروشر ہمارے ہاتھوں میں تھما دیا۔ جس میں شہر کی خوبصورت جگہوں کی سیر کا پیکیج تھا۔

میں نے بے اعتنائی سے اُسے دیکھا۔ چھوٹتے ہی انکار کر دیا اور آگے بڑھ گئی۔ کسی بھی جگہ کی سیر کے لیے میرا طریق کار ہمیشہ ذرا مختلف رہا۔

پر مجھے مڑ کر دیکھنا پڑا تھا۔ سیما اپنی جگہ جمی کھڑی تھی۔ حسین تھی، چہرے پر غصے اور رعونت کے آڑھے ترچھے عکس بکھرے ہونے کے باوجود بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ کہیں میرے جیسی صورت

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ہوتی تو نری چمارن لگتی۔ وہ غرائی تھی۔

"نہ تمہیں خجل خوار ہونے کا بڑا چاؤ ہے نہ تو وہ بھی ہولیں گے پر رکو تو سہی ذرا۔ شتر بے مہارو کی طرح ادھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے چلو کسی گروپ کے ساتھ نتھی ہو جائیں اور قاعدے طریقے سے کچھ دیکھ لیں۔"

اُس کے پاس باتوں اور دلائل کا ایک ڈھیر تھا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ سب میرے نزدیک فضول تھے۔ دیکھو نہ کتنے لوگ دھڑا دھڑ بکنگ کروا رہے ہیں۔ یہ سب پاگل تو نہیں۔

بہر حال میں نے اُس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے 50 یورو فی کس کے حساب سے ایک دن کے پروگرام پر ٹک لگا دی۔ اب پھڈا تو ڈالنا نہیں تھا۔

یہ گائیڈ لوگ بھی بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ ٹورسٹوں کو اپنی مرضی سے پٹخنیاں دیتے ہیں۔ پہلے دو ڈھائی گھنٹے اُس نے کارپٹ اور ہینڈی کرافٹ کی اُن دکانوں میں دستی کاریگری دکھانے میں لگائے جن سے یقیناً اُس کا کمیشن طے تھا۔

مٹی سے ظروف سازی اور اس پر تزئین کاری کا عمل بھی ہمارے ہاں کے کمھاروں جیسا ہی تھا۔ وہی چاک پر مٹی کے لوتھڑے کو گھمانے اور اُسے شکل دینے کا عمل۔ تاہم یہاں کام میں جدت اور ماڈرن ازم تھا۔ کمرے میں رکھی گئی نمائشی اشیا نے رنگ و نور کی بارش برسا رکھی تھی۔

میرے صبر کا پیمانہ اُس وقت لبریز ہو گیا جب ایا صوفیہ کو دیکھنے کے لیے صرف آدھ گھنٹا ملا۔ ایا صوفیہ سے میری جذباتی وابستگی زمانوں سے تھی۔ اس کی فینٹسی نے ہمیشہ مجھے مسحور رکھا۔

ترکی قالین واقعی بے مثال تھے۔ پر سب سے بڑا کمال تو سیلز مینوں کی مہارت تھی کس خوبی اور سٹائل سے وہ بھاری بھرکم قالین ہاتھوں میں لہراتے اُنہیں چکریاں دیتے زمین پر گراتے تھے۔

مجھے بے اختیار وسطی پنجاب کے گاؤں کی وہ الھڑ مٹیاریں یاد آئی تھیں جو گندم کے آٹے کے پیڑوں کو منڈے (پھلکے) بنانے کے لیے ہاتھوں میں لہراتے گھماتے ہوئے اسی دلربایانہ انداز میں توی پر پکنے کے لیے ڈالتی ہیں۔

ساتویں جماعت میں پڑھنے والی وہ لڑکی ہمیشہ میری یادداشتوں میں محفوظ رہی جو اپنی اردو کی کتاب میں ایا صوفیہ کی کہانی پڑھ کر اپنی کلاس میں ہی بیٹھی رہی۔ تصویر کو دیکھتی اور سر عبدالقادر کا لکھا ہوا احوال پڑھتی رہی اورا سکول خالی ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی میں تھی اور ایا صوفیہ آج میرے سامنے مجسم تھی۔

ایا صوفیہ بہت سے پُر ہیبت طلسم سے بھری ادوار کی کہانیاں سُناتی ہے۔ وہ کہانیاں جنھیں سُننے کی مجھے شدید تمنا تھی۔ بازنطینی طرز تعمیر، مشرقی رومن ایمپائر کے دبدبے اور عظمت کی مظہر اس کی فضاؤں میں عثمانی سلاطین کی مذہبی رواداری کی خوشبو ہے۔ اس خوشبو کو محسوس کرنے اور سونگھنے کے لیے وقت درکار تھا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

میں ہجوم سے الگ ہو گئی تھی۔ میرے حسابوں آدھ گھنٹا تو اُونٹ کے منہ میں زیرے والی بات بھی نہ تھی۔ میں تھی اور ایا صوفیا تھی اور اندر باہر پاکستانی، پاکستانی کی سارے ہال میں ڈھنڈیا پڑی تھی۔ گائیڈ مجھے تلاش کرتے کرتے بے حال تھا۔

سیما میرے یوں ”گواچی گاں“ کی طرح مُنہ ماری پر تلملا رہی تھی۔ مجھے بھی تپ چڑھی ہوئی تھی۔ اسی لیے میں نے بس میں چڑھنے کے ساتھ ہی گائیڈ کو دیکھتے ہوئے زوردار آواز میں اعلان کر دیا تھا۔

”ہم آپ کا پیکج ہاف ڈے کا کر رہے ہیں۔ ہوٹل والوں کو مطلع کر دیجیے۔“

استنبول کی مشہور جگہیں ٹھنڈے روح افزا شربت کے وہ گلاس ہیں جنھیں مزے لے لے کر گھونٹ گھونٹ پینے کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ تو پورا گلاس سانس لیے بغیر حلق میں انڈیل دینا چاہتے ہیں۔ یوں تو اچھو لگ جائے گا۔ اپھارہ بھی ہو جائے گا۔ میں نے سیما کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا تھا۔

ہاف ڈے پیکج کا آخری آئٹم گرینڈ بازار کی سیر تھی۔

”چلو اچھا ہے کرنسی بدلوانے کی کوئی صورت تو نکلے گی۔“ میں نے خود سے کہا۔

گرینڈ بازار کے بیرونی دروازے کے ساتھ ہی منی چینج آفس تھا۔ میں اور سیما فوراً اُس میں گھس گئیں۔ جگہ تنگ اور لوگ زیادہ۔ میں آخری کونے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ شیشے کی چھوٹی سی دیوار میں بنے قوس نما کٹ میں سے سر کو جھکاتے ہوئے سیٹ پر

تم بھی حسابات کرو ہو

اک چھوڑو ہو اک اور مسمات کرو ہو
ہر سال یہ کیا قبلۂ حاجات کرو ہو
سمجھو ہو کہاں اوروں کو تم اپنے برابر
بس منہ سے مساوات مساوات کرو ہو
کیا حسن کی دولت بھی کبھی بانٹو ہو صاحب
سننے میں تو آیا ہے کہ خیرات کرو ہو
مل جاؤں تو کرتے ہو نہ ملنے کی شکایت
گھر آؤں تو خاطر نہ مدارات کرو ہو
ہم ذات شریف آئے ہیں اس در پہ یہ سن کر
تم ہنس کے شریفوں سے ملاقات کرو ہو
اُٹھے کہاں؟ بیٹھے کہاں؟ کب آئے؟ گئے کب؟
بیگم کی طرح تم بھی حسابات کرو ہو

(امیر الاسلام ہاشمی)

بیٹھے بائیس تیئس سالہ خوش شکل لڑکے سے میں نے ڈالر اور یورو کا ریٹ پوچھا۔

”1.42 اور 1.82“ جواب ملا۔

”پر یہ تو کم ہے۔ ریٹ تو 1.46 اور 1.85 ہے۔“

دفعتہً کچھ سوچتے ہوئے اپنائیت کے اظہار کے طور پر میں نے پاکستانی ہونے کا بتایا۔ لڑکا کھلکھلا کر ہنسا اور بولا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

"پھر تو 1.40 ہونا چاہیے۔"

میں کچھ حیرت زدہ سی ہوئی۔ تُرک پاکستان اور پاکستانیوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ سُنی سنائی اور پڑھی پڑھائی باتوں کے برعکس ہمارا ڈیڑھ دن کا تجربہ اگرچہ بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں تو مایوس کن بھی نہ تھا پر یہ تو خاصی دل شکنی والی بات تھی۔

تاہم میں نے سر جھکا اور نوٹ گننے لگی جو 1.42 کے حساب سے 284 لیرا ہی تھے۔

گرینڈ بازار الف لیلوی کہانیوں کی طرح تھا۔ بیضوی چھتوں کے ساتھ آگے اور دائیں بائیں اطراف سے محراب در محراب پھیلتا، ہلکے زردی رنگ میں ڈوبا ہوا جس پر شوخ رنگوں کے نقش و نگار اُسے بازاروں کی دنیا میں ایک انفرادیت دیتے تھے۔ برقی قمقموں کی تیز جگمگاتی روشنیوں میں اس کی سجی ہوئی دکانیں سیاحوں کے دلوں پر برق بن کر گرتی ہیں۔

284 لیرے جو پرس کی اندرونی جیب میں آسانی سے کھڈے لائن لگ گئے تھے۔ دوسو ڈالر کی تو میرے ملک میں نوٹوں کی اچھی خاصی تھدّی بنتی ہے۔ بیرون ملک بیشتر پاکستانیوں کی طرح میرے سینے سے بھی لمبی لمبی آہیں نکلتی ہیں۔ مقابلوں اور موازنوں میں "کاش" کی ہُوک کلیجا تڑپاتی ہے۔

شاپنگ کبھی میرا کریز نہیں رہا۔ سیما جب دکانیں جھانکتی تھی۔ میں شیشے کے چھوٹے سے گلاس میں بغیر دودھ کے کسیلا قہوہ جسے میں نے پانچ چھے چینی کی کیوبز سے میٹھا کر لیا تھا پیتی تھی۔

دوسو چوراسی لیرے چار دن چلے۔ پانچویں دن توپ کاپی سرائے میوزیم کی آرمینیائی طرز تعمیر کی خوبصورتیوں اور حرم کی پچی کاری و تزئین کاری کی ہوش رُبا رنگینیوں سے طلسم زدہ سے باہر آئے تو ٹانگیں ٹوٹنے کے قریب تھیں اور کسی بینک کو کھوجنے کی ہمت نہ تھی۔

عام طور پر تُرک انگریزی بولنا پسند نہیں کرتے۔ آتی بھی ہو تو غچہ دے جاتے ہیں مونڈھے مار کر چہرے پر ایسے تاثرات بکھیرتے ہیں کہ بندہ حیران سا ہو جاتا ہے۔ اور اُس وقت (body language) کے استعمال پر میری طبیعت قطعی آمادہ نہ تھی اور گرینڈ بازار سے ملحق منی چینج آفس کا لڑکا انگریزی سمجھتا تھا۔

وہیں پہنچے پیارا سا خوش شکل لڑکا دیکھ کر ہنسا۔ سو ڈالر کا نوٹ سوراخ سے اندر گیا۔ پیسے لیے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل آ گئے۔

ہوٹل کے سامنے رُک کر جب ادائی کے لیے میں نے پرس کھولا تو تہ کیے ہوئے سارے لیرے ہاتھ میں آ گئے۔ میں نے انہیں کھولا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہلکے نیلے رنگ کے ایک نوٹ کو چھونا چاہا تو میں نے بھی اس کا نوٹس لیا۔ یہ نامانوس سا نوٹ تھا۔ میں نے نوٹوں کو مٹھی میں بند کر لیا۔ سیما کو ادائی کے لیے کہا اور بدحواس سی دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ خوش گوار ٹھنڈی ہوا نے میرے اڑتے حواسوں کو ذرا معتدل کیا۔ ہوٹل کے ریسپشن پر کھڑے لڑکے کو نوٹ دکھائے۔ اس نے نیلے نوٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تو متروک ہو چکا ہے۔"

میں نے پلکیں جھپکائیں اور یہ سوچنا چاہا کہ کاونٹر

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پر پیسے لیتے وقت میں نے انہیں دیکھا تھا کیا؟ اور یہ کس قدر حیرت انگیز بات تھی کہ مجھے اپنی ذہنی سکرین پر اپنے چیسٹ بینک سے سو ڈالر کا نوٹ نکالنے کا عمل اپنی پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔ وہ چھوٹی سی خالی جگہ کیش کاونٹر تک جانے، لڑکے کے ہنسنے، نوٹ دینے لینے کے سب مراحل متحرک تصویروں کے مانند سامنے تھے۔ پراگلے منظر پر دبیز دھند تھی۔

اب بہت سے سوال تھے جو میرے ذہن میں اُبھرے۔ میں نے نوٹوں کو ہاتھ میں پکڑا۔ انھیں گنا تھا؟ کیا مجھے اُن میں کوئی خاص چیز نظر آئی؟ لیروں سے تو میں پہلے ہی دن شناسا ہو گئی تھی۔

میری ذہنی سلیٹ صاف تھی اور اُس پر ان میں سے کسی کا جواب نہیں تھا۔ میں گُم سُم سی کھڑی تھی۔ ایک سو تیس لیروں کے ساتھ ہاتھ ہو گیا تھا۔ گویا تقریباً پانچ ہزار پاکستانی روپے کو ٹھک لگ گیا تھا۔

جاپان اور تائیوان کے سیاح لاؤنج میں میرے قریب ہی کھڑے اس مسئلہ کو خاصی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اُن میں سے کسی نے کہا۔ فوراً پولیس اسٹیشن رپورٹ کریں۔

''میں اگر لڑکے کے پاس جاؤں تو؟''

میں نے ریسپشنسٹ کی رائے لی۔

اُس کا بڑا حتمی جواب تھا۔ ''یہ زیادہ مناسب ہے پولیس کو رپورٹ کریں۔''

اس استفسار پر کہ پولیس اسٹیشن کہاں ہے؟ تائیوانی نے چھوٹا سا بازو پھیلا کر لاؤنج کے کونے کی طرف یوں اشارہ دیا جیسے پولیس اسٹیشن تو یہیں کونے

سائیڈ ایفیکٹس

سر درد میں گولی یہ بڑی زود اثر ہے
پر تھوڑا سا نقصان بھی ہو سکتا ہے اس سے
ہو سکتی ہے پیدا کوئی تبخیر کی صورت
دل تنگ و پریشان بھی ہو سکتا ہے اس سے
ہو سکتی ہے کچھ ثقل سماعت کی شکایت
بے کار کوئی کان بھی ہو سکتا ہے اس سے
ممکن ہے خرابی کوئی ہو جائے جگر میں
ہاں آپ کو یرقان بھی ہو سکتا ہے اس سے
پڑ سکتی ہے کچھ جلد خراشی کی ضرورت
خارش کا کچھ امکان بھی ہو سکتا ہے اس سے
ہو سکتی ہیں یادیں بھی ذرا اس سے متاثر
معمولی سا نسیان بھی ہو سکتا ہے اس سے
بینائی کے حق میں بھی یہ گولی نہیں اچھی
دیدہ کوئی حیران بھی ہو سکتا ہے اس سے
ہو سکتا ہے لاحق کوئی پیچیدہ مرض بھی
گردہ کوئی ویران بھی ہو سکتا ہے اس سے
ممکن ہے کہ ہو جائے نشہ اس سے ذرا سا
پھر آپ کا چالان بھی ہو سکتا ہے اس سے

(انور مسعود)

میں ہی ڈیرے ڈالے بیٹھا ہو۔

میں بھی حد درجہ احمق اور گھامڑ عورت کہ ساتھ چلنے کی درخواست کر بیٹھی اُس نے تو بڑا سا چہرہ فی الفور نفی میں ہلا دیا۔

میں اور سیما اب اس نئی مہم پر نکلیں۔ پُوچھتے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پُوچھاتے جب جائے مطلوبہ پر پہنچیں اس وقت ایا صوفیہ اور جامع (مسجد) سلطان احمد کے نوکیلے منار زرفشاں کرنوں میں چمک رہے تھے اور دونوں تاریخی جگہوں کے درمیان پارکوں میں ٹورسٹوں کے پرے مست خرام تھے۔

پولیس اسٹیشن میں سناٹا تھا اور ایک بے حد خوبصورت نوجوان ایک کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔

سلام کے جواب میں تپاک تھا۔ پاکستان کا جان کر لہجے میں محبت کا اظہار تھا۔ میں نے مسئلہ گوش گزار کیا تو سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔

''کیا وصولی کی کوئی رسید لی تھی۔''

میں نے ہونقوں کی طرح دیکھا اور سر نفی میں ہلایا۔

''جگہ پہچانتی ہیں، آدمی کو شناخت کرلیں گی؟''

دونوں سوال ظاہر ہے ایسے تھے کہ میرا جواب جوشیلی قسم کی ''ہاں'' میں تھا۔

''گھبرائیے نہیں آپ کے پیسے ضرور آپ کو ملیں گے۔''

پُر یقین لہجے سے چھلکتی اُمید کی آس نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔

''مگر''

میں نے گھبرا کر اُسے دیکھا۔

''یہ چُونکہ Criminal case ہے۔ آپ کو کریمنل پولیس اسٹیشن جانا ہوگا۔ یہ ٹورازم پولیس اسٹیشن ہے۔ بیازت یہاں سے زیادہ دور نہیں۔''

اور جب وہ واکی ٹاکی پر غالباً بیازت والوں کو میرے بارے میں بتا رہا تھا میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

''ارے میں کون ہوں؟''

اس وقت مجھے یہ بھی احساس ہوا تھا کہ جیسے میں لاہور کے نولکھا پولیس اسٹیشن میں بیٹھی ہوں اور مجھے یہ کہا جا رہا ہے کہ محترمہ یہ کیس تو اچھرہ پولیس کا ہے۔ وہاں جائیے۔

گاڑی کے لیے معذرت ہوئی۔ ٹیکسی منگوا دی گئی اور یہ بھی تاکید ہوئی کہ اسے صرف پانچ لیرے دینے ہیں۔

اُس وقت مجھے پھر اپنی پولیس اس گمان کے ساتھ یاد آئی تھی کہ وہ یقیناً ایک غیر ملکی خاتون کو ٹیکسی میں رولنے کے بجائے گاڑی میں بھیجتی۔

ماشاء اللہ سے ٹیکسی ڈرائیور نے ہیرا پھیری میں پاکستانیوں کو بھی مات کر دیا تھا۔ اللہ جانے کن کن راستوں پر بگٹٹ بھاگا اور میٹر بڑھائے چلا جاتا تھا۔ جونہی ایک چوک پر گاڑی رُکی۔ ''تقسیم'' پر نظر پڑی۔ سیما نے بے اختیار اپنے گھٹنے پر دو ہتڑ مارا ''ارے دیکھو تو ذرا تقسیم پر لے آیا ہے۔'' وہ غصے سے چلائی۔ پر اس کا فائدہ۔ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔ ہماری بکواس کا کچھ اثر نہیں تھا اور وہ بڑے مزے میں تھا۔ باہر رات تاریک اور بتیاں روشن تھیں۔

تقسیم مرکزی چوک ہے جہاں سے مختلف جگہوں کو راستے نکلتے ہیں۔ ہاتھوں میں نقشے پکڑ کر صبح سے شام تک بسوں اور ٹراموں میں خجل خواریوں سے ہمیں شہر کے چہرے مہرے سے خاصی جان پہچان ہوگئی تھی۔

میٹر پچیس لیروں کی نشاندہی کر رہا تھا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پھر ایک جگہ گاڑی روک کر اُس نے سامنے بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت 34 لیرے روزِ روشن کی طرح میٹر پر جگمگا رہے تھے۔ ہم ٹیکسی سے اُترے۔ پانچ لیرے کا نوٹ میں نے فرنٹ سیٹ پر پھینکا اور جی داری سے کہا۔

''ہمیں یہی دینے کو کہا گیا تھا۔'' حلق کے اندر سے گھن گرج کے ساتھ آواز نکالی۔

سیما کا ہاتھ پکڑ کر تیر جیسی رفتار سے آگے بڑھتے ہوئے میں نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ گو تعاقب میں شور وغوغا تھا۔ للکارتی بھیانک سی آوازیں تھیں۔ اساطیری کہانیوں کی طرح پتھر بننے کا ڈر تو ہرگز نہیں تھا۔ بس جیب کہیں ڈھیلی نہ ہو جائے سارا رولا اسی کا تھا۔

سیڑھیاں شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھیں۔ استنبول کا سارا شہر کم بلندی والی ڈھلانی پہاڑیوں پر ایک مربوط اور خوبصورت ترتیبی صورت میں بکھرا ہوا ہے۔

برآمدوں اور راہداریوں کے چکر کاٹتے ہوئے مطلوبہ جگہ پہنچے۔

اب میری داستانِ امیر حمزہ پھر شروع ہوئی۔ یہ بھی مقامِ شکر تھا کہ پولیس افسر کے پاس انگریزی کا تھوڑا سا دال دلیہ تھا۔ تفتیشی سوالات ہوئے۔ ماشاء اللہ سے ہاتھ، آنکھیں م، زبان سب چلیں۔ یوں معاملے نے فہم وفراست کی منزلیں بڑی عمدگی اور حد درجہ تعاون سے طے کیں۔

اب خاموشی تھی نتیجے کا اعلان جو ہونا تھا۔

نتیجہ جو سُنایا گیا وہ کچھ یوں تھا کہ چونکہ اب رات کے آٹھ بج رہے ہیں اور آفس بند ہو گیا ہے لہٰذا کل نو بجے تشریف لائیے ہر ممکن مدد کی جائے گی۔

اُترائی کی مشقت اور ٹرام اسٹیشن تک پیدل چلنے کی صعوبت جھیل کر ہوٹل پہنچنے تک کے وقفے میں مجھے دو تین بار یہ خیال آیا کہ دفع کرو گولی مارو اس قضیے کو۔

سیما کا بھی کہنا تھا ''چل چھوڑ زندگی میں ہزار آئے اور ہزار گئے جان کا صدقہ سمجھ اور دفع دُور کر۔''

لیکن بستر پر لیٹنے اور تھوڑا سا ستا لینے کے بعد میرے اندر کا کہانی کار اور سیاح بھلا چین سے بیٹھتا اور اسے یونہی دفع دُور کر دیتا۔

''ناں جی ناں'' من چلے دل نے کہا۔

بات نکلی ہے تو دُور تلک جائے گی۔

بُرے کو بُرے کے گھر تک پہنچا کے آئے گی۔

صبح ناشتے کے بعد میں نے بالوں میں کنگھا چلایا۔ جُوتا پہنا۔ رات کے پہنے ہوئے کپڑوں کی سلوٹوں اور شکنوں کو ہاتھوں سے قدرے صاف کیا، بیگ کندھے سے لٹکایا اور سیما سے یہ کہتے ہوئے ''جانم میں ذرا پولیس اسٹیشن بھگتا آؤں، تب تک تم تیار ہو جانا۔''

سیما پوری بیگم ہے۔ نِک سک سے آراستہ ہوئے بغیر باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔

نو بجے جب میں مطلوبہ جگہ پہنچی۔ ماشاء اللہ سے سیٹ پر ایک نیا چہرہ بیٹھا تھا۔ دو نوجوان لڑکے کسی بات پر اُونچے اُونچے یوں بول رہے تھے۔ جیسے یہ تھانہ تو نہ ہو گلی محلے کی کوئی بیٹھک ہو۔ جہاں کسی بات پر تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی ہے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

لڑکوں کو بھگتا کر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ اب میرا بیان شروع ہوا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے سب ممکنہ سوالوں کے جواب بھی اس میں شامل کر دیے کہ فضول کی تفتیشی تکرار سے جان چھٹے۔

داستان گل بکاؤلی سُناتے، خطابت کے جوہر دکھاتے جب فراغت ہوئی۔ فاتحانہ شان کا پَرتو آنکھوں میں لیے جب میں نے اُسے دیکھا میرا جی اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا کہ میں نٹی تو اتنی دیر سے بھینس کے آگے بین بجا رہی تھی۔

وہ چہرے کے بائیں رُخ کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹکائے بٹر بٹر میرا منہ دیکھتا تھا۔ شدت سے ایک خواہش سینے میں مچلی کہ ایک کرارا سا جھانپڑ اُس کی گدی پر ماروں۔ تارے دِکھ جائیں دن میں یا پھر اپنے سر کو پھوڑ لوں جو یوں دیوانہ بنا چکریاں کاٹ رہا ہے۔

میں نے مارا، سر پر نہیں پاؤں پر۔ اٹینشن والے انداز میں پاؤں نے فرش بجایا اور گلے سے نکلتی کرخت آواز نے چھت پھاڑ دی۔

"ہے یہاں کوئی جو میری بات سُنے۔"

فوراً ہی سامنے والے بند دروازوں میں سے ایک دروازہ قدرے زوردار آواز سے کھلا اور ایک لڑکی بھاگنے کے انداز میں میرے سامنے آ کر بہت شُستہ انگریزی میں بولی۔

"بتائیے کیا بات ہے؟"

میری بولتی کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ آنکھیں، ناک، ہونٹ، صراحی دار گردن سے نیچے لشکارے مارتا اُس کا قدرے عریاں سینہ، ننگے سڈول بازو اور سرو جیسا قد میری آنکھوں میں فٹ ایکسرے مشین میں سے ہو کر گزرا۔

"اللہ یہ کمبخت اس حُسنِ جہاں سوز کے ساتھ پولیس اسٹیشن پر کیا کر رہی ہے؟" میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

اسے تو توپ کاپی سرائے پیلس یا دولما باشی جیسے محل منارے میں عثمانی سلطان کے مجید، حمید، نذیر کو سک

معشوق جو ٹھگنا ہے تو عاشق بھی ہے ناٹا
اس کا کوئی نقصان نہ اس کا کوئی گھاٹا
تیری تو نوازش ہے کہ تُو آ گیا لیکن
اے دوست مرے گھر میں نہ چاول ہے نہ آٹا
لڈن تو ہنی مون منانے گئے لندن
چل ہم بھی کلفٹن پہ کریں سیر سپاٹا
تم نے تو کہا تھا کہ چلو ڈوب مریں ہم
اب ساحل دریا پہ کھڑے کرتے ہو ٹاٹا
عشاق رہِ عشق میں محتاط رہیں گے
سیکھا ہے حسینوں نے بھی اب جوڈو کراٹا
کالا نہ سہی لال سہی تل تو بنا ہے
اچھا ہوا مچھر نے ترے گال پہ کاٹا
اس زور سے میں نے اسے چھیڑا تو نہیں تھا
جس زور سے ظالم نے جمایا ہے چماٹا
جب اس نے بلایا تو ضیا چل دیے گھر سے
بستر کو رکھا سر پہ لپیٹا نہ لپاٹا
(ضیاء الحق قاسمی)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

میں جام وسبو پیش کرتے ہوئے ہونا چاہیے تھا۔
لڑکی پھر بولی۔
''بتائیے کیا مسئلہ ہے؟''
''ٹھہر جاؤ۔ مسئلہ تو بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے تمہارے حُسن کو سراہ تو لوں۔''
لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور مجھے یوں لگا جیسے بند کلیوں نے چٹک کر اپنے منہ کھول لیے ہوں۔
حُسن کی فسوں خیزی سے نکلی تو اصل مسئلے کی طرف متوجہ ہوئی۔
چلیے جناب۔ کہانی میرے لُٹنے کی پھر دہرائی گئی۔
اُس نے یوں چٹکی بجائی جیسے انگلیوں کی پوروں میں طلسماتی جن مقید ہو۔
''ابھی یہ پولیس مین آپ کے ساتھ جائے گا اور سارا مسئلہ حل کر آئے گا۔ ذرا بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''
میں نے پولیس مین کو دیکھا جو ہمارے پاس ہی کھڑا تھا اور جس کی طرف اشارہ ہوا تھا۔ چُوچہ سا میرے اسکول کے دسویں جماعت میں پڑھنے والے لڑکوں جیسا جن کی مسیں ابھی بھیگتی ہی ہیں کہ وہ جوان دکھنے کے چکر میں گالوں اور ہونٹوں کے بالائی حصوں کو بلیڈ سے چھیل ڈالتے ہیں۔
میں نے بہت لمبی سانس بھری تھی۔ اس میں میری کل شام سے لے کر اب تک کی مشقت کا درد رچا ہوا تھا۔
قہر درویش بر جان درویش اس کے ساتھ چلنے کے سوا کوئی اور چارہ کار تھا کیا؟ سو چلی۔ بلڈنگ کی سیڑھیاں اُترنے کے بعد جب وہ مجھے اُس کھلی جگہ پر لایا جہاں گاڑیاں کھڑی تھیں مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ مجھے گاڑی میں بٹھائے گا اور گاڑی شور مچاتی، ہوٹر بجاتی، ہٹو ترکو، راستہ دو کا عملی مظاہرہ کرتی گرینڈ بازار میں داخل ہو کر منی چینج آفس کے سامنے رُکے گی۔
''واللہ کس قدر مسرور کن نظارہ ہوگا۔'' میں نے تصور میں اس منظر سے حظ اُٹھاتے ہوئے آنکھیں نچائیں۔
پر جب بڑا سا پُختہ میدان کراس کرنے کے بعد وہ اگلے ڈھلانی راستے پر اُترنے لگا تو بے اختیار میں رُک گئی۔ ''گاڑی کدھر ہے؟'' میں نے ہوا میں ہاتھ لہرائے۔
وہ ہونقوں کی طرح میری صُورت دیکھتا تھا اور میں اپنے آپ سے کہتی تھی۔
میرے ملک کی پولیس کتنی ہی بدنام سہی پر بے مروت تو ہرگز نہیں۔ چٹی چمڑی والوں کے تو آگے پیچھے پھرتی ہے۔
''ہائے ایہہ تے وڈی بدلحاظ اے۔''
میں نے اپنے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ اپنے پاؤں کو چھوا اور اشاروں سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ان میں درد ہے اور چلنا دُشوار ہے۔
اُس نے اشاروں کی اس زبان کو سمجھا اور اچھے بیٹے کی طرح مجھے بازو سے تھام کر چلانا چاہا۔ مجھے ہنسی آگئی تھی۔
''چلو میاں چلو''
میں نے خود کو تھپکی دی۔ بلا وجہ ہی گاڑی کی آس میں پاؤں بھاری کر لیے تھے۔ بھگاؤ دردوں وردوں کو اور بندوں کی طرح قدم اُٹھاؤ۔
استنبول کے سلطان احمد ایریا کی گلیوں اور چھوٹے چھوٹے بازاروں میں سے گزرتا ہوا وہ ایک جگہ آ کر رُک گیا۔
گرینڈ بازار۔ اُس نے سامنے بازار کی طرف اشارہ کیا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بازار چہرے مہرے سے تو ویسا ہی تھا۔ ''پر'' یہ 'پر' بڑا سا سوالیہ نشان تھا۔

اب میں دیدے پٹ پٹ گھماتی ہوں۔ بھونچکی سی پچاس گز ادھر پچاس گز اُدھر دیکھتی ہوں۔ نہ وہاں کوئی منی چینج آفس، نہ دوسری سمت خوبصورت مسجد، جس میں ہم نے عصر کی نماز پڑھی تھی۔ میں نے سر کا تولانفی میں ہلایا۔ اشاروں سے منی چینج آفس کی بائیں رُخ پر جائے وقوع کی وضاحت کی اور نور عثمانیہ مسجد دائیں ہاتھ۔ خوب اشارے بھی دیے اور زبان بھی چلائی سمجھانے میں جو جو ہاتھ پلا مار سکتی تھی مارا۔ چلو خیر کسی نے راہنمائی کی اور پھر چل پڑے۔

ہو بہو گرینڈ بازار جیسے ایک اور بڑی سی سرنگ نما دروازے کے نمودار ہونے پر بھی یہی صورت پیش آئی۔ پر اب اُس سُن وٹے پر انحصار کرنے کے بجائے میں خود بھاگی۔

نور عثمانیہ جامع ،نور عثمانیہ جامع (مسجد) کیا بات تھی میری۔ کیا ایکٹنگ تھی۔ آدھا بازار مجھے دیکھتا تھا۔

پھر کسی نے اُسے سمجھایا۔ ٹانگیں پھر چلیں۔ اب جس بازار میں داخلہ ہوا تھوڑا سا ہی چلنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم صحیح راستے پر ہیں اور جائے وقوعہ بس آنے ہی والی ہے۔

میرا قیافہ درست تھا۔ جونہی بازار کا اختتام ہوا نور عثمانیہ مسجد اور منی چینج آفس دونوں نظر آ گئے تھے۔ میں نے فوراً اُسے بازو سے تھاما۔ اندر لے گئی اور لڑکے کی سمت اشارہ کر دیا اور خود کونے میں بنے چھوٹے سے زینے کے دوسرے پورے پر کھڑی ہو کر کارروائی کے جائزے میں مصروف ہو گئی۔

ایک عجیب سی بات لڑکے نے صرف ایک چھل چھلاتی نگاہ سے مجھے دیکھا اور چہرہ جھکا لیا۔

اور جب پولیس مین اُس سے بات کرتا تھا۔ وہیں کونے سے ایک اونچا لمبا خوش شکل تیس کے ہیر پھیر میں نوجوان شکرے کی طرح اس پر جھپٹا۔ یقیناً وہ آفس کا انچارج ہو گا۔ اونچائی پر کھڑے ہونے سے ایک اور بات میرے مشاہدے میں آئی۔ اس کی گردن میں صلیبی کراس والی چین تھی۔ مجھے تھوڑا سا ذہنی جھٹکا لگا۔ یہ عیسائی ہے اور دوسرا لڑکا بھی یقیناً عیسائی ہو گا یا یہودی۔

استنبول میں یونانی عیسائیوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ اسپین پر کیتھولک عیسائی غلبے کے بعد جب یہودیوں اور مسلمانوں کو دیس نکالا دیا گیا تو عثمانی ترکوں نے کھلے دل سے یہودیوں پر اپنی مملکت کے دروازے وا کیے۔ تب سے آج تک وہ یہیں آباد ہیں۔

ذاتی طور پر میں بنی نوع انسان کے بشری تقاضوں، اُس کی فطری کمزوریوں اور بلند ظرفیوں کو مذہبی۔ لسانی اور تہذیبی خانوں میں بٹے ہوئے نہیں دیکھتی ہوں۔ ہر قوم ہر مذہب ہر فرقے اور ہر گروہ میں اچھے بُرے عناصر ازل سے موجود ہیں اور ابد تک رہیں گے کہ کائنات ہستی کا توازن اسی اصول میں مُضمر ہے۔ دھوکا دہی کے اس کیس میں انھیں اس حوالے سے دیکھنا مناسب ہی نہیں تھا۔

جو بات مجھے اُس لمحے کلک ہوئی تھی وہ لڑکے کے وہ الفاظ تھے کہ جب میں نے اُسے اپنے پاکستان سے تعلق کا حوالہ دیا تھا۔ اس کی طنزیہ ہنسی بھی مجھے یاد آئی تھی۔

تو کیا اُن کے ذہن اُس عالمی پروپیگنڈے سے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

متاثر ہیں جو اسلامی، عیسائی اور یہودی دُنیا میں اس وقت جاری ہے؟

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ تھوڑی سی گرما گرمی اور تُو تُو میں میں کے بعد پولیس مین مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔ گرینڈ بازار کے باہر ڈیوٹی دیتے وردی والے سپاہی اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہیں وہ مختصراً کچھ بتا کر سامنے والی دکان سے مترجم لے کر آیا جس نے مجھے بتایا کہ وہ تو یکسر انکاری ہیں۔

اپنے دفاع میں، میں نے دلیل دی کہ میں تین ستمبر کو استنبول میں داخل ہوئی ہوں۔ میرے پاس یہ متروک شدہ اتنا بڑا نوٹ کہاں سے آسکتا ہے۔

یہ بات پولیس مین کو سمجھائی گئی۔ وہ پھر اندر گیا میں بھی ساتھ تھی۔ اب پھر زوردار گفتگو شروع ہوگئی۔ مزے کی بات کہ لڑکے نے اس بار بھی مجھ سے آنکھ نہیں ملائی۔ چپ چاپ کھڑا سب دیکھتا تھا۔ پولیس مین بے چارہ بھیگی بلی اور وہ بُل ٹیریئر۔

پھر ہم دونوں باہر آگئے۔ مترجم آیا جس نے مجھے کہا کہ میں پولیس اسٹیشن جا کر تحریری درخواست دوں تا کہ اس پر ایکشن ہو۔

اتنی مشقت بھری خجل خواری کے باوجود میری ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ ہونٹوں اور آنکھوں میں بکھری اس ہنسی میں، میں نے بہت دور تک گرینڈ بازار کے نقش و نگار کی شوخیاں دیکھیں اور پھر دونوں ہاتھ مترجم کے سامنے جوڑتے ہوئے گویا ہوئی۔

جناب میں کیس کو ڈراپ کرتی ہوں۔ استنبول پولیس کی یہ آنیاں اور جانیاں بڑی دل خوش کُن ہیں۔ اس کی شاندار کارکردگی کو سلوٹ مارتی ہوں۔ جو کچھ جاننے کی خواہش مند تھی وہ جان گئی ہوں اور مزید جان کاری کی ہرگز متمنی نہیں۔ ہماری زبان کی ایک کہاوت ہے کہ پنڈ کا پتا روڑیوں سے لگ جاتا ہے۔

میں نے پولیس مین کے سینے پر محبت بھرا ہاتھ پھیرا اور کہا۔

''جاؤ بیٹا۔''

اور جب مجمع بکھر گیا پھر پتا نہیں مجھے کیا ہوا؟ میں کیوں منی چینج آفس میں چلی گئی۔ اُسی جگہ جا کر کھڑی ہوئی۔ اس بار دونوں نے مجھے دیکھا پر میں صرف لڑکے سے مخاطب ہوئی۔

تم تو بالکل مجھے اپنے بیٹے جیسے لگے تھے۔ پیارے سے چمکتی آنکھوں والے۔ بوڑھی عورتیں جو مائیں ہوتی ہیں انہیں تو دنیا بھر کے بچے اپنے بچوں جیسے ہی لگتے ہیں۔ تو میری جان اُن کے ساتھ ہیرا پھیری نہیں کرتے اور جو کرنے کو دل مچلے تو پھر یہ بانکی سجیلی لڑکیوں کے پرّے کیا کم ہیں اس کام کے لیے۔

اپنی کسی بھی بات کا ردّ عمل دیکھنے کے لیے میں رُکی نہیں تیزی سے باہر آگئی۔ سُورج کی آب و تاب ابھی اپنے جوبن پر نہیں آئی تھی۔ بازار کی رونقیں ابھی انگڑائیاں لے لے کر بیدار ہو رہی تھیں۔ ملحق سڑک پر چلتی میں گرینڈ بازار کے دوسرے دروازے کیپلی کارسی کے سامنے نفیس اور شاندار سے ریسٹورنٹ کے سامنے کمپاونڈ میں آگئی فراخ اور کشادہ کمپاونڈ میں دھری کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ کر برتقال (مالٹوں) کا جوس گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اپنے آپ سے کہتی تھی۔

چلو اچھی ایکٹویٹی رہی۔ 5200 پاکستانی روپوں میں پڑنے والی یہ کہانی کچھ ایسی بُری بھی نہیں۔ ○○○

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی چند مطبوعات

گھریلو تشدد اور اسلام	=/60	اسلام کا عائلی نظام	=/150
خانگی زندگی اور اُسوۂ حسنہ	=/40	خاندان کو لاحق خطرات اور ممکنہ لائحہ عمل	=/25
قرآن کا عائلی قانون	=/40	مسلمان عورت کے حقوق	=/200
مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	=/40	عورت اور اسلام	=/150
حضرت ثویبہؓ (رسول اکرمؐ کی رضاعی والدہ)	=/30	تحفظِ نسواں یا تحفظِ عصیاں بل	=/200
بچوں میں خوف	=/120	بچے اور اسلام	=/20
اسلام میں بچوں کے حقوق اور تحفظ	=/70	آزاد بچے، آزاد والدین	=/250
بچوں سے گفتگو کیسے کریں؟	=/160	باتیں سمندروں کی (بچوں کے لیے)	=/70
کھلتی کلیاں مہکتے پھول	=/60	تم بھی سوچو ذرا۔ ماحول بہتر بنائیں کس طرح	=/40
زبان کی آفتیں	=/25	فہم القرآن کورس	=/200

ابھی طلب کیجیے!

اکیڈمی بک سینٹر

ڈی۔۳۵، بلاک۔۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ
منصورہ، لاہور

اِدارۂ مطبوعاتِ طلبہ
A-1، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

میرے بچپن کے دن

شکر ہے خوف سے نکلی چیخیں سننے والا وہاں کوئی نہ تھا

آٹے کا کن کھجورا

بچپن کی شرارتی یادیں جو بھلائے نہیں بھولتیں

خالد محی الدین

گھر کا راشن لینے نکلا تو بیگم نے بچوں کی کاپیاں، پنسلیں، شارپنر، ربڑ، کالی و نیلی روشنائی اور چار چار اُردو اور حساب کے رجسٹر بھی لانے کو کہا۔ ابھی میری سماعت سے یہ چیزیں ٹکرا ہی رہی تھیں کہ سب سے چھوٹے عرشیان نے ''چائنہ مٹی'' اور ایک ریموور لانے کی فرمائش کر ڈالی۔

چائنہ مٹی کیا کرنی ہے، میں نے قدرے روکھے لہجے میں پوچھا۔

عرشیان بولا، پاپا! اس سے بڑی چیزیں بنتی ہیں جو دل چاہے بنا لو۔ اسکول میں سب بچوں کے پاس ہے۔ اس سے چڑیا بنا لو گھوڑا بنا لو یا سانپ بنا لو اور ہاتھ بھی گندے نہیں ہوتے۔ مختصر یہ کہ چائنہ مٹی لینے کے لیے چھوٹی سی جان نے خوب تمہید باندھی۔ یہ سن کر میرا لہجہ نرم اور تجسس بڑھ گیا کہ یہ چائنہ مٹی ہے کیا چیز......

میں جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتا گھر سے نکل پڑا مبادا کوئی اور فرمائش نہ کان میں پڑ جائے۔

گلی کی نکڑ ہی پر شاہ جی کا جنرل اسٹور ہے۔ میں نے سب سے پہلے شاہ جی سے چائنہ مٹی ہی مانگی۔

شاہ جی نے رنگ برنگی پلاسٹک کی بڑی ہی خوبصورت چھوٹی چھوٹی بالٹیاں میرے سامنے سجا دیں۔ وہ دیکھتے ہی میں آنکھوں کو بڑی بھلی لگیں۔

ان بالٹیوں میں آٹے کی طرح گوندھی ہوئی مختلف رنگوں میں چائنہ مٹی بھری تھی۔ واقعی حیرت انگیز طور پر وہ ہاتھوں سے نہیں چپکتی تھی۔

میں نے چالیس روپوں کے عوض چاروں بالٹیاں خرید لیں جنھیں پا کر عرشیان بہت خوش ہوا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

وہ اُسی وقت مٹی نکال کر کسی بُت تراش کی طرح مختلف جانور اور حشرات بنانے لگا جن میں ہاتھی، اونٹ اور گھوڑے کے علاوہ مچھلی، سانپ اور چھپکلی قابل دید تھی۔

اُنھیں دیکھ کر بے ساختہ مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ اُس دور میں ہم بچے سرخ چکنی مٹی گوندھ کر مختلف کھلونے بنایا کرتے تھے۔ مثلاً مٹی کا چولھا، ڈوئی، توا اور اسی طرح کی دیگر اشیا۔ مٹی زیادہ ہوتی تو مالٹا، سیب، آم، کیلا، اخروٹ اور بادام بھی بناتے۔ پھر دھوپ میں سوکھا کر مختلف رنگوں سے اُنھیں رنگ دینے کی اپنی سی کوشش کرتے۔

اسی طرح سگریٹ اور ماچس کی خالی ڈبیاں اکٹھی کر کے اُنھیں لئی کے ساتھ جوڑ کر صوفہ سیٹ، میز اور دو دومنزلہ مکان بناتے۔ اگر کوئی کھلونا اچھا بن جاتا، تو وہ گھر کے ڈرائنگ روم کی زینت بن جاتا اور گھر آئے ہر مہمان کو فخر سے دکھایا جاتا کہ یہ ہمارے فلاں بچے نے بنایا ہے۔ اب یہ باتیں عنقا ہیں۔ جدت پسندی نے ان کا وجود ہی مٹا ڈالا ہے۔

جب کبھی مٹی نہ ملتی، تو والدہ سے آنکھ بچا کر گوندھے ہوئے آٹے سے مٹھی بھر آٹا کھینچ لیتا۔ پھر خشک آٹا ہاتھوں کو لگا کر گوندھے ہوئے آٹے کی چھپکلی، چوہا اور سانپ بنا کر محلے میں ہم عمر بچوں کو ڈراتا۔ اُنھیں خوفزدہ ہوتے دیکھ کر میں خوب قہقہے لگاتا۔ پھر ایک دن میں نے بڑی محنت سے آٹے کا کن کھجورا بنایا۔ جب وہ سوکھ کر اکڑ گیا تو اس پر کالے، پیلے اور سبز رنگ سے اُس کے نقش و نگار بنائے۔ وہ میری اس قدر شاندار تخلیق تھی کہ پل بھر کو مجھے بھی اُسے چھوتے ہوئے خوف محسوس ہوا۔

دن بھر میں اُس کن کھجورے سے گھر والوں اور بچوں کو ڈرا کے خوب محظوظ ہوا۔ میں نے اپنا وہ شاہکار ضائع نہیں کیا بلکہ اگلے دن دوستوں کو ڈرانے کے لیے اُسے محفوظ کر لیا۔

ہمارے پڑوس میں شریف بھائی کا گھر تھا۔ یوں کہہ لیں کہ اُن کی اور ہماری دیوار مشترکہ تھی۔ دوسری طرف ہمارے محلے کے مشہور و معروف حکیم صاحب کا گھر تھا جن کے گھر والوں سے بات چیت کے لیے ہماری دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جس میں سے صرف سر ہی نکل سکتا تھا۔ انھوں نے گھر میں بھینس رکھی ہوئی تھی۔ گرمیوں میں ہم اکثر اُن کے گھر سے چاٹی کی لسی منگوایا کرتے تھے جو اُن کی بیگم ڈول بھر کر خوشی خوشی دیا کرتی تھیں۔ تیسرے پڑوسی نصیر صاحب تھے جو صرف اتوار کے دن ہی محلے میں نظر آتے۔ باقی چھ دن وہ کہاں گزارتے تھے ہمیں کچھ علم نہیں تھا نہ ہی کبھی ہم نے پوچھنے کی جسارت کی تھی۔

اگلے روز مصروفیت کچھ ایسی رہی کہ کن کھجورے کا خیال ہی نہ آیا۔ کئی دن ایسے ہی گزر گئے۔ میں اپنے تخلیق کردہ ''شاہکار'' کو بھول چکا تھا۔ پھر ایک دن کوئی چیز ڈھونڈتے ڈھونڈتے اُسی جگہ پہنچ گیا جہاں کن کھجورا رکھا تھا اور انجانے سے جو اُسے اُٹھایا تو میری چیخیں نکل گئیں۔ یہ شکر ہے کہ اُس وقت کمرے میں کوئی نہیں تھا ورنہ اپنا خوب تمسخر اُڑنا تھا۔

شریف بھائی کی بیگم کھانا پکانے سے پہلے مسالا سِل پر پیستی۔ پیاز، لہسن، ادرک، سوکھا دھنیا، ثابت لال مرچ حتیٰ کہ ہلدی بھی ثابت ہی ہوتی۔ ایک ایک کر کے باری باری وہ یہ اجناس سِل پر بٹے کی مدد سے ایسے پیستی جیسے آٹا گوندھا جاتا ہے، فرق صرف یہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تھا کہ آٹا گوندھتے ہوئے مٹھیاں بھینچ کر آٹے سے زور آزمائی کی جاتی ہے جبکہ سل پر دونوں ہاتھوں میں پتھر کا گول سا بٹا پکڑ کر آگے پیچھے جھولتے ہوئے اجناس کا ملیدہ بنایا جاتا ہے۔ اس دوران مختلف مسالوں کی خوب مہک اُٹھتی جو خوامخواہ بھوک چمکا دیتی اور جب یہ ملغوبہ سرخ رنگ آٹے کے پیڑے کی شکل دھار لیتا' تو مٹی کی کٹوری میں یہ ملغوبہ سل سے اُتار کر رکھ لیتی۔ پھر تھوڑا سا پانی سل پر ڈال کر اس سے چپکا ہوا مسالا بھی اُتار لیتی۔ میں قریب کھڑا یہ سب دیکھتا رہتا۔

اُس روز شریف بھائی کے گھر والوں نے ماش کی دال پکانی تھی جو میری وجہ سے نہ پک سکی۔ اُن کی بیگم نے ماش کی دال چھان کر پرات میں پانی ڈالا اور اُسے چند گھنٹوں کے لیے دھوپ میں دیوار پر رکھ دیا تاکہ دال نرم ہو جائے' تو ہاتھوں سے مَسل کر اس کے چھلکے اُتار لے۔ میری والدہ بھی ایسے ہی ماش کی دال پکایا کرتی تھیں کیونکہ بقول والد صاحب کے دھلی ہوئی ماش کے چھلکے کیمیکل ڈال کر اُتارے جاتے ہیں جو صحت کے لیے مضر ہے۔ اس لیے جب بھی ماش کی دال پکتی تو والدہ اُسے بھگو کر چھلکے اُتارتی۔ لیکن آج کل مصروفیت کے باعث کوئی یہ بات ماننے یا جاننے کے لیے تیار ہی نہیں۔

خیر بیگم شریف پرات دیوار پر رکھ کے دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئی جب کہ میرے ذہن میں بیٹھے بٹھائے شرارت سوجھی اور میں نے آنکھ بچا کر وہ تحلیق کیا ہوا آٹے کا کن کھجورا اڑوس پڑوس سے نظر بچا کر چپکے سے دال کے اوپر رکھ دیا جو قدرے پانی چوس چکی اور پھول کر پرات سے باہر آنے کو تھی۔

پھر اُن لوگوں کا ردعمل دیکھنے کے لیے میں چھت ہی پر چھپ کر بیٹھا رہا' مگر خاصی دیر گزرنے کے باوجود کوئی بھی دال والی پرات اُٹھانے نہ آیا اور میں مایوس ہو کر نیچے اُتر آیا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ شریف بھائی کی بڑی بیٹی صفیہ کی مجھے چیخ سنائی دی ''امی دال میں کن کھجورا۔''

بیگم شریف بھی دوڑی دوڑی آئی۔ جیسے ہی پرات میں جھانک کر دیکھا' تو کراہت سے چھاتی پر دوہتڑ مار کر ساری دال کوڑے کی ٹوکری میں اُلٹ دی۔

میں کھڑے کھڑے کانپنے لگا' مبادا اگر اُنھیں پتا چل گیا کہ یہ شرارت میری ہے' تو گھر والوں کو دال کی اُجرت دینا پڑے گی اور ابو سے میری دُھنائی الگ ہو گی۔

جیسے تیسے میں نے چپ سادھے رکھی اور آج تک اپنی اس شرارت کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔

آخر انہوں نے بازار سے حلیم منگوا کر دوپہر کی روٹی کھائی......

دوسری شرارت جو میرے ذہن میں آج بھی محفوظ ہے وہ یہ کہ ہماری گلی میں کمہار اپنے گدھوں پر سرخ مٹی کے بورے لاد کر بیچنے کے لیے آیا۔ اُن دنوں زیادہ تر گھروندے کچے ہی ہوا کرتے تھے۔ پکا مکان کسی کسی کا ہوتا تھا۔ کوئی اپنا کوٹھا لیپنے کے لیے مٹی خریدتا اور کوئی اپنا صحن اونچا کرنے کے لیے۔ خواتین پیتل' تانبے' سلور اور مٹی کی ہانڈیوں کے تلوے پونچھنے کے لیے بھی کمہار سے مٹی خریدتیں اور مٹی سے کھلونے بنانے کا ذکر تو میں کر چکا ہوں۔ بس یہ ہی مصرف تھے اُس مٹی کے یا کچھ بزرگ وٹوانی کے لیے مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیلے بنا کر غسل خانوں میں رکھا کرتے تھے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اتفاق سے میں گلی ہی میں موجود تھا۔ جیسے ہی گدھے کمر پر مٹی کے بورے لدے میرے قریب سے گزرے مجھے اُس مٹی کے اندر کیچوے سرکتے ہوئے نظر آئے۔ یہ بھی عجیب و غریب قسم کا کیڑا ہے۔ اِس کے دو ٹکڑے بھی کر دیے جائیں' تو اس کی موت واقع نہیں ہوتی بلکہ دونوں حصے الگ الگ سمتوں میں چل پڑتے ہیں اور جہاں نرم مٹی ملی اُس میں گھس جاتے ہیں۔ ان کی چال سُنڈی جیسی ہوتی مگر شکل سانپ سے مشابہ ہوتی ہے۔

آنکھوں اور ناک سے محروم یہ کیڑا زمین کی زرخیزی کے لیے مفید ہے۔ شکاری مچھلی کا شکار کرنے کے لیے اسی بچارے کی ''خدمات'' مستعار لیتے ہیں۔

میں نے مٹی سے دو تین کیچوے نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیے تاکہ بچوں کو ڈرایا جا سکے۔ اسی اثنا میں مجھے شاہد نظر آیا۔ یہ میرے دوست عابد کا چھوٹا بھائی تھا۔ کیچوے ہاتھ میں لیے' میں اُس کے قریب گیا اور بڑی مہارت اور چالاکی سے اُس کی جیب میں ڈال دیے۔ لیکن اُسے پتا ہی نہ چلا اور وہ اپنی راہ چلتا گیا۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہوا کیونکہ میں تو اپنی شرارت سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ میں اُس کے قریب گیا اور اُسے مخاطب کرتے ہوئے اپنی جیب دیکھنے کو کہا۔ جب اُس نے اپنی جیب میں زندہ کیچوے رینگتے دیکھے' تو اُس کی حالت غیر ہو گئی۔ سارے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ بار بار اپنی گردن ایسے ہلاتا جیسے کوئی نفرت انگیز شے دیکھ کر اپنی گردن ہلاتا ہے۔ اسی حالت میں وہ غش کھا کر گر پڑا۔

یہ دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پہلے تو میں نے وہاں سے بھاگنا چاہا' لیکن چونکہ کچھ لڑکوں نے مجھے

شادی

محبت ماں سے اور بیوی سے جس کو پیار ہوتا ہے
گزارہ ایسے شوہر کا بہت دشوار ہوتا ہے
محبت کا مزہ ہوتا ہے شادی کے ارادے تک
پھر اس کے بعد جو ہوتا ہے سب بے کار ہوتا ہے
(ڈاکٹر انعام الحق جاوید)

شرارت کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے بھاگنا مناسب نہ سمجھا اور اُس کی جیب سے کیچوے نکال کر اُسے دلاسا دینے لگا۔ اُس کے ہاتھ اور پیروں کے تلوے اپنے ہاتھوں سے رگڑنے' مگر وہ کسی طرح ہوش میں نہ آیا۔

آخر نوبت ہسپتال تک جا پہنچی۔ ذرا سی شرارت کا وہ بتنگڑ بنا کی الامان الحفیظ۔ یہ بات چھپنے والی نہ تھی۔ شاہد کی دادی اماں ہمارے گھر شکایت لے کر پہنچ گئی۔ کہ آپ کے لونڈے نے میرے بچے کے ساتھ یہ شرارت کی ہے۔ والد صاحب بھی گھر پر موجود تھے۔ اگر یہ بات صرف والدہ تک پہنچتی' تو اپنی بچت ہو جاتی مگر چونکہ یہ ڈائریکٹ ابا جان تک پہنچی تھی اس لیے بچت کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اُس روز شاہد کی دادی کے سامنے ہی میری وہ دھنائی ہوئی کہ وہ بچاری بوڑھی میرے ابا سے کہنے لگی ''باؤ جی میں اپنی شکایت واپس لیتی ہوں خدا کے لیے آپ اس بچے کو چھوڑ دیں۔'' مگر ابا جان نے ایک نہ سنی کیونکہ اُن کی ڈکشنری میں معافی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

آخر محلے والوں نے جیسے تیسے ابا جان کے عتاب سے مجھے خلاصی دلائی۔ وہ دن اور آج کا دن پھر کبھی میں نے ایسی شرارت نہیں کی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

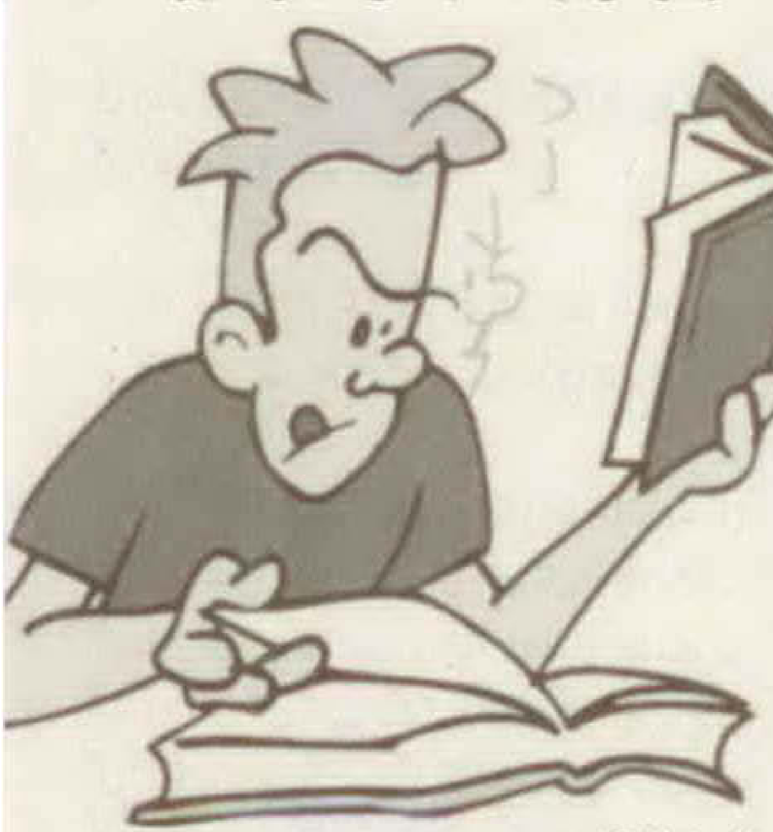

فہد میاں فیل کیوں ہوئے؟

ایک بچے کی ''ذہانت'' کا اعلیٰ ''شاہکار''
پرچے کے مندرجات نے ممتحن صاحب
کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی کھول دیں تھیں۔

سارہ الیاس

فہد میاں ماشاء اللہ ہمارے اسکول کے ذہین طالب علم ہیں۔ البتہ گھر والوں کے لیے ان کا نام ہی مسکراہٹ کا بہانہ ہے، دوست احباب سنا ہے کہ دیکھتے ہی ہنس پڑتے ہیں۔ امی سچ کہتی ہیں کہ ان کی نسل کی کسی کو قدر نہیں مغل دور میں ہوتے تو دربار شاہی کی رونق بڑھاتے کہ وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ واہ کیا ٹھاٹھ باٹ ہوتے، ذرا چشمِ تصور کو وا کیجیے اور دیکھیں لال لال موٹی ناک، پھندوں والی ٹوپی، ہاتھ میں جھنجھنا لیے کوئی لطیفہ سناتے یہ رہے حضرت فہد!

ابھی محترم اُردو کا ایک پرچہ شاہی مسخرے کی سی شان سے دے کر آئے ہیں نتیجہ نکلنے پر انتہائی معصومیت کے ساتھ اپنے فیل ہونے کی وجہ دریافت کر رہے تھے۔ آپ بھی ذرا ان کے جوابات ملاحظہ فرمائیں اور بتائیں کہ ''بیچارے'' فیل کیوں ہوئے......؟

سوال نمبر 1: جملے بنائیں۔

1۔ آب آب ہونا: اکرم نے اسلم پر پانی ڈالا تو وہ آب آب ہو گیا۔

2۔ منہ کا نوالہ چھیننا: بھوکی مانو میرے منہ کا نوالہ چھین کر کھا گئی۔

3۔ صبح تڑکے: امی دال کو صبح صبح تڑکے لگا رہی تھی۔

4۔ لے پالک: سبزی والے نے آواز لگائی لے، لے پالک، لے لے بھنڈی۔

سوال نمبر 2: اشعار کی تشریح کریں۔

؎ دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

فہد میاں کا کہنا ہے کہ ان کے استاد محترم نے بتایا تھا کہ جس بھی شعر میں شاعر کے نام کے سوا کوئی مونث نام موجود ہو بلا کھٹکے اختر شیرانی کا شعر قرار دے دو۔ چناں چہ نام ''بینا'' دیکھ کر ان کے دماغ کے نہاں خانوں سے یہ بات برآمد ہوئی اور وہ شاعر کا نام اختر ''شیروانی'' درج کر آئے۔

اب تشریح ملاحظہ فرمائیے:

شاعر کو دو موذی بیماریاں لاحق تھیں۔ ایک تو وہ نابینا تھے (غالباً پیدائشی) اور دوسرا دل کے مریض تھے۔ تو بینا نامی ایک محترمہ جاتے جاتے انھیں اپنی آنکھ عطیہ کرتی گئیں۔ مگر ناشکرا شاعر اس پر راضی نہ ہوا اور کہنے لگا کہ بیماری کے سبب بے نور دل کے ہوتے ہوئے آنکھ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کی بینائی کا کیا فائدہ اس لیے دُعا کرو کہ ڈاکٹر بینا کا دل بھی انھیں ٹرانسپلانٹ کر دیں۔

شعر نمبر2:

؎ وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

شاعر: میر تقی درد

تشریح: شاعر لوڈ شیڈنگ کا ستایا ہوا لگتا ہے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ فلاں اس محفل میں موجود تھے کہ نہیں اور کتنی دیر تک وہاں رہے تو وہ جواباً کہتا ہے کہ جب وہ محفل میں آئے تھے تب میری نظر ان پر پڑی تھی مگر پھر وہ وہاں ٹھہرے کہ نہیں یہ نہیں پتا کہ بتی چلی گئی تھی اور اندھیرا پھیل گیا تھا تو وہ نظر نہیں آئے۔

شعر نمبر3:

؎ اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

شاعر: ''مولانا'' اقبال

تشریح: شاعر مشرق سردی کے موسم میں چار چیزوں زندگی، محبت، معرفت اور نگاہ کی تلاش میں مدرسوں اور خانقاہوں کے یوں چکر لگا رہے تھے جیسے آج کل دہشت گردوں کی تلاش میں لگائے جاتے ہیں، تو انھیں ناک میں درد ہو گیا۔ میری حقیر رائے میں یہاں نم ناک ہونا چاہیے تھا یعنی انھیں زکام ہو گیا ٹھنڈ کے سبب۔

سوال نمبر3: محلّہ کی صفائی کے لیے چیئرمین بلدیہ کے نام درخواست لکھیے

جواب: بخدمت جناب چیئرمین بلدیہ، چیچوں کی ملیاں

جناب عالی!

التماس ہے کہ بارشوں کی مسلسل آمد کے باعث ہمارے محلّے کے تینوں گٹر بھر گئے ہیں ان میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں بچی کہ پانی...... میرا ''معرکتہ آرا'' شعر سنیے۔

؎ ان بارشوں سے کہہ دو کہیں اور جا کے برسیں
اتنی جگہ کہاں اس گٹر بدبودار میں

چناں چہ آپ سے پر زور فرمائش ہے کہ پمپ لگوا کر اس پانی کو نکلوا دیں۔ تا کہ مزید کی جگہ بن سکے۔ شکر گزار کیوں ہوں؟ یہ تو آپ کا فرض ہے۔

العارض

پپو اور اہلِ محلّہ

سوال نمبر4: والد کے نام رقم منگوانے کے لیے خط لکھیے:

از کمرہ امتحان

22/مارچ/14

میرے راج دُلارے ابا جان!

السلام علیکم! میں ٹھیک ہوں اُمید ہے آپ سب بھی ٹھیک ہی ہوں گے۔ میرا موبائل گم ہو گیا ہے اس لیے خط لکھ رہا ہوں۔

مجھے موبائل کے پیسے اور 200 روپے نصف جن کہ 100 روپے ہوتے ہیں لوڈ کے لیے بھجوا دیں۔ اس مہنگائی کے زمانے میں اتنی ہی رقم میں کوئی فضول خرچی نہیں کی جا سکتی چناں چہ بلا خوف و خطر رقم بھیج دیں۔ پیشگی شکریہ!!

آپ کا ذہین فطین

پپو

سوال نمبر5: علامہ اقبال پر مضمون تحریر کریں۔

جواب: جناب ممتحن صاحب...... میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ حکیم الامت شاعر مشرق کے بارے میں خامہ فرسائی کر سکوں البتہ اگر آپ ان کے حالات زندگی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو معاشرتی علوم کے پرچے کا سوال نمبر4 دیکھ لیں۔ بہت شکریہ

یہ حل شدہ پرچہ دیکھ کر فہد میاں تو یہ سوچ کر حیران ہو رہے تھے کہ وہ فیل کیسے ہوئے اور ہم پریشان تھے کہ انھیں یہ جو چند نمبر بھی ملے تو کیسے ملے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سجاد قادر

قصہ ہماری مونچھ تراشی کا

ایک نوجوان کا دلچسپ ماجرا

اس نے اپنی ''آنچ'' پر مونچھیں نہ اُگنے کا تہیّہ کرلیا تھا

مونچھیں ہمارے معاشرے میں مردانگی کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ یہ نہ صرف آج کے دور میں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں بلکہ زمانہ قدیم ہی سے لوگ مونچھوں کی اہمیت و افادیت سے بخوبی واقف ہیں۔ مونچھیں رُعب و دبدبہ ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ مردانگی کی شان بھی سمجھی جاتی ہیں۔ ہم نے چونکہ ایک ایسے ہی گھرانے میں نہ صرف آنکھیں کھولیں بلکہ ٹانگیں پساریں جہاں ہر طرف مونچھوں کا راج تھا۔ نائی کا استرا ہمارے خاندان کے کسی بھی فرد کی مونچھ کا کبھی کوئی بال بھی بیکا نہیں کرسکا۔

ہمارے ابا جی کی مونچھیں بھی کیا مونچھیں ہیں ان کی طوالت اور مضبوطی کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ بچپن میں جب ہم چھوٹے تھے تو چارپائی کا سہارا لے کر کھڑے ہونے کے بجائے ابا جی کی گود میں اُن کی مونچھیں پکڑ کر کھڑے ہوتے۔ کبھی کبھی عالم جوش میں ان کی مونچھوں کو پکڑ کر اٹھک بیٹھک کرتے اور کبھی تو ان کے ساتھ لٹک کر جھولے بھی لے لیا کرتے تھے۔ انہیں مونچھوں کو پکڑ کر ہم جوان ہوئے اور ہوتے چلے گئے۔

ہمارے ابا جی کی مونچھیں کوئی عام مونچھیں نہیں ہیں۔ جتنی شہرت ابا جی کو علاقے میں ان کی مونچھوں نے دلوائی، اتنا ان کے نام یا کام نے نہیں دلوائی۔ اپنے محلے، گاؤں تو دور کی بات پورے ضلع میں کسی سے ہمارے ابا جی کا نام پوچھ لو مگر ساتھ مونچھوں کا لاحقہ لگانا ضروری ہے۔ ہر کوئی آپ کو ہمارے گھر کا پتا بتا دے گا۔ بچپن

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

میں جب ہم کہیں جاتے، تو لوگ پوچھتے کس کے بیٹے ہو؟ ہم کہتے فلاں کے وہ کہتے کون فلاں؟ ہم پھر بتاتے جناب وہ فلاں جو وہ کام کرتے ہیں، تو وہ بڑی بھیانک سی ہنسی کے ساتھ قہقہہ بلند کرتے اور فرماتے، اچھا! وہ مونچھوں والے، اچھا اچھا! یوں کہو نا بھئی! آپ تو ہمارے بھتیجے ہیں، آؤ آؤ! بیٹھو وغیرہ وغیرہ۔ اور ابا جی کی مونچھوں کے صدقے ہماری خوب آؤ بھگت ہوتی۔

مونچھیں نہ صرف ابا جی کی ہیں بلکہ بڑے بھائی جان کی مونچھیں بھی کمال کی ہیں۔ بڑے بھائی نے بھی مونچھوں پر بڑی محنت کی، خوب کھلایا پلایا، دیسی گھی کی مالش کی، بادام روغن، گری کے تیل میں ملا کر مونچھوں پر لگایا۔ ابا جی سے اپنی مونچھیں دو ہاتھ لمبی کیں مگر جو نام ابا جی کی مونچھوں نے کمایا، وہ بھیا جی کی مونچھوں کو نصیب نہ ہوا۔ خیر تاحال مقابلہ جاری ہے، جانے کون ''گولڈ میڈل'' جیت پاتا ہے۔

مونچھوں سے ازلی شناسائی اور پیار محبت کے باوجود ہمیں مونچھوں سے خدا واسطے کا بیر تھا اور ہے۔ وجہ معلوم نہیں۔ ابا جی کی مونچھیں ہمیں پیاری ہی نہیں، آئیڈیل بھی لگتی ہیں، مگر خیال میں، لیکن جب ہم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے چہرے پر مونچھوں کا نقشہ کھینچتے ہیں، تو کچھ دہل سے جاتے ہیں۔ اپنے چہرے پر مونچھوں سے ہمیں ایسے نفرت ہے جیسے مور کو اپنے پیروں سے۔ اسی لیے آج تک اپنے چہرے کو شرمندۂ مونچھ نہیں ہونے دیا۔ جب ہم نے عالم شباب میں قدم رکھا اور چہرے پر ہلکی ہلکی مسیں بھیگنا شروع ہوئیں تو ابا کا سینہ فخر سے چوڑا اور اماں کا ماتھا خوشی سے دمکنے لگا کہ ہمارا پتر جوان ہو گیا ہے۔ جب کہ عین اسی وقت ہمارا سر جھکنا شروع ہو گیا کہ لوگ ہماری مونچھیں دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ کیونکہ تازہ تازہ نکلتی ہماری مونچھیں ایسے لگتی تھیں جیسے ریلوے لائن کے کنارے اُگے خودرُو سرکنڈے ہوں، ایک یہاں اور ایک وہاں!

ہم سارا سارا دن آئینے کے سامنے اپنی بُوتھی لے کر بیٹھے رہتے اور اپنی نئی نویلی مائل بہ روئیدگی مونچھوں کے ایک ایک بال کو گنتے رہتے۔ ارادہ تھا کہ موقع ملتے ہی ان کا قلع قمع کر دیا جائے، مگر اس سے پہلے کہ ہمارا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا ابا جی کو ہمارے خفیہ مشن کا پتا چل گیا کہ برخوردار اپنی معصوم مونچھوں کو ملیا میٹ کرنے والا ہے۔ بس پھر کیا تھا، ابا نے اپنی مونچھوں کو کھڑا اور آنکھوں کو بڑا کر کے ہمیں ہمارے کان سے پکڑ کے متنبہ کیا کہ اگر مونچھوں کے ساتھ کوئی غیر اخلاقی یا سفاکانہ حرکت کی، تو تمھاری ٹانگیں توڑ کے گھر سے نکال دوں گا۔ بس پھر کیا تھا ہماری ٹانگیں تو اسی وقت کانپنا شروع ہو گئیں۔ خیر! مونچھوں کے ساتھ ہم نے کوئی واردات تو نہ کی، مگر اندر ہی اندر ہماری مونچھ مخالف بغاوت پروان چڑھتی گئی۔

بی۔اے کر کے ہم اپنے ہی ضلع میں ملتان یونیورسٹی سے الحاق شدہ کالج میں ایم۔اے کرنے کی نیت سے داخل ہو گئے۔ کالج اپنے ہی علاقے میں تھا، اس لیے سارے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے واقف تھے۔ انگلش کی کلاس میں لٹریچر پڑھ کے ہمارے مونچھ مخالف جذبات شدت اختیار کر گئے۔ نہ صرف مونچھ مخالف جذبات بلکہ روایتی لباس شلوار قمیص کی جگہ پینٹ شرٹ سے بھی محبت کے جراثیم ہمارے نہاں خانۂ دل میں پرورش پانے لگے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ایم۔اے انگلش کی کلاس کے پہلے ہی سال ہماری پوری کلاس ٹرپ پر گئی۔ ہمارے استاد محترم نے دو دن پہلے تقریر کی کہ اس ٹرپ پر ہر لڑکا اور لڑکی بہت مختلف اور پہلے سے ذرا ہٹ کے نظر آنا چاہیے۔ بس پھر کیا تھا! ہم نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ برخوردار! اب وہ وقت آ پہنچا ہے کہ اپنی دیرینہ خواہش پوری کی جائے۔ پوری کلاس کو حیران کرنا اور لڑکیوں کو Impress کرنا ہے۔ دل اور دماغ دونوں نے ہماری تائید کی۔ دل کے ایک کونے سے سر سید احمد خان کا نعرہ گونجا ''اب یا پھر کبھی نہیں!'' ہم اپنے فیصلے پر ڈٹ گئے اور پوری کلاس کو مخاطب کر کے کہا کہ ٹرپ والے دن سب سے مختلف نظر آ کر آپ سب کو حیران کر دوں گا۔ سب نے پوچھا بھئی ایسا کیا کرنا ہے، ہم نے کہا یہ تو وقت ہی بتائے گا۔

ٹرپ سے ایک دن پہلے ہم اپنے دوست کے پاس پہنچے، جو Comset یونیورسٹی اسلام آباد میں کمپیوٹر انجینئرنگ کر رہا تھا۔ اسے ہم نے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا، تو اس نے بھی ہماری نہ صرف تائید کی بلکہ ہمارا ساتھ دینے کا بھی پورا پورا وعدہ کیا۔ فوری طور پر اندر کمرے میں جا کر اپنی ڈھیر ساری پینٹیں اور شرٹیں نکال لایا۔ ہم نے باری باری تمام شرٹس پہنیں جو ہمیں بالکل فٹ آتی چلی گئیں مگر جب پینٹ پہننے کی کوشش کی تو اس نے کولھوں سے اوپر جانے سے انکار کر دیا۔ آخر ایک دو پینٹوں کی زِپ خراب کرنے کے بعد ہمارے دوست نے کہا کہ لگتا ہے، تمھاری ویسٹ زیادہ ہے۔ چناں چہ نئی پینٹ خریدنے پر اتفاق ہوا۔ ہم نے بائیک اسٹارٹ کی اور بازار پہنچ گئے۔ دکاندار سے فرمائش کی کہ حضور پینٹ چاہیے۔ اس نے کہا ''جینز یا ڈریس!'' اس کی بات ہمارے سر سے گزر گئی۔ ہم نے کہا بھئی ہمیں پینٹ چاہیے جینز یا ڈریس سے کیا واسطہ! دکاندار سمجھ گیا۔ ''پینڈو نیا نیا، بابو بننے چلا ہے۔'' خیر اللہ اللہ کر کے پینٹ پسند کی وہیں پہن کر چیک کی اور بغل میں دبائے گھر آ گئے۔

صبح سویرے نائی کی دکان پر پہنچے۔ وہ بھی ہمارا ہمدرد نکلا۔ کہنے لگا برخوردار! گھبراؤ نہیں ایسی صفائی سے استرا چلاؤں گا کہ پتا ہی نہیں چلے گا۔ واقعی پتا ہی نہیں چلا اور کام ہو گیا۔ ہم نے آنکھیں بند کیں اور پھر بند ہی رہ گئیں، دوبارہ کھولنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ پہلے ہم نے ایک آنکھ کھولی پھر دوسری، جب دونوں آنکھیں کھولیں تو خود کو ڈھونڈنے لگے، آئینے کے سامنے تو کوئی اور بیٹھا تھا۔ ہم تو وہاں تھے ہی نہیں! بڑی پریشانی کا سامنا ہوا۔ خیر دوست نے بڑی بحث کے بعد آخر یقین دلا ہی دیا کہ جب 2 منٹ پہلے آپ کو یہاں بٹھایا تھا، تو اس کے بعد اب تک آپ ہی یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، تو پھر اور کون یہاں آ جائے گا۔ خیر ہم نے جب بغور اپنے نین نقش دیکھے تو یقین آ ہی گیا کہ ناک سے نیچے اور منہ سے اوپر کے علاوہ باقی تو سارا اپنا ہی ''تھوبڑا'' ہے۔

نائی کی دکان سے باہر آ کے ہم ایسے منہ چھپاتے پھر رہے تھے، جیسے پہلی رات کی سہاگن شرماتی پھرتی ہے۔ ہم بڑی شان سے کالج پہنچے کہ سارے فیلوز بلکہ ساری فیلوز دیکھتے ہی حیران ہو جائیں گی مگر وہاں تو کچھ اور ہو گیا۔ لڑکیاں ہمیں دیکھیں اور اپنے پلو میں منہ چھپا کے کھی کھی ہنسیں۔ ہم نے کہا کہ یہ کیا ہو گیا!

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

یہاں تو کچھ الٹا اثر ہو گیا ہے۔ خیر! جب وہ کھسیانی کھسیانی ہنسی، قہقہوں کا روپ دھارنے لگی، تو ہم جلال میں آگئے سب کو دو چار الٹی سیدھی سنائیں اور اپنا ٹرپ کینسل کر کے گھر آبراجمان ہوئے۔ مگر گھر میں ہمارے داخل ہوتے ہی جیسے بھونچال سا آ گیا۔ ہمارا حلیہ دیکھتے ہی اماں نے ماتھے پر ہتھڑ مارا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئیں، بھیا جی غضبناک آنکھوں سے دیکھنے لگے اور ابا جی نے ڈنڈا اُٹھا کر دو ہتھو نہیں چار رسید کیے اور ساتھ میں گالیوں کی بوچھاڑ آئی۔ نکمے، نامعقول، کمبخت! اسی دن کے لیے پال پوس کر بڑا کیا تھا کہ ہماری ناک ہی کٹوا دو۔ ہم نے دل میں کہا ابا جی! غصے میں لفظ تو ٹھیک بولیں ہم نے مونچھیں کٹوائی ہیں ناک تھوڑی کٹوائی ہے۔ ہم نے بہتیرا ہاتھ جوڑے، معافی مانگی کہ ابا جی غلطی ہو گئی دوبارہ نہیں ہو گی۔ مگر ابا جی تو جیسے آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ بہت کوشش کے باوجود جب معاملہ سنبھلتا محسوس نہ ہوا، امی کی منت سماجت کی، کیونکہ وہی مجھے اُن کے عتاب سے بچا سکتی تھیں۔ آخر خوب ہنگامہ آرائی کے بعد ابا جی نے بس اتنا کہا ’’دور ہو جاؤ میری نظروں سے‘‘ ہماری جان میں جان آئی اور ہم گھر سے باہر نکل آئے۔ پورا محلّہ دروازے کے سامنے ایسے اکٹھا ہوا کھڑا تھا جیسے سینما ہال کی کھڑکی پر ٹکٹ لینے والوں کی بھیڑ۔ سب ہمیں دیکھ دیکھ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ وہ رات ہم نے اپنی ایک خالہ کے گھر بسر کی۔

ابا جی کا پیغام ملا کہ اگر آج کے بعد مونچھوں کو چھوا بھی تو جان سے مار دوں گا۔ ابا جی نے کہا کہ اس شرط پہ گھر آ جاؤ کہ آئندہ مونچھوں کا خون نہیں کرو گے۔ ہم

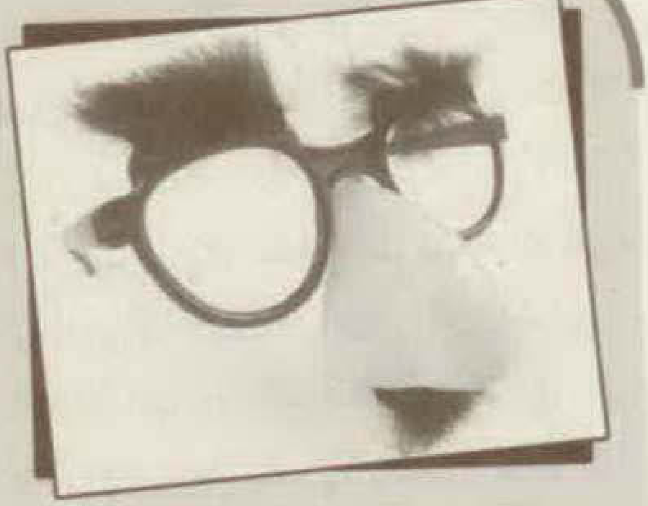

ہلکی پھلکی غزل

ملک محمد اکرام اللہ

بجلی جو واپڈا کی نہ آئی تمام رات
منجی گلی میں ہم نے بچھائی تمام رات

شاور چلا کر ہم بھی نہائیں گے، شوق تھا
پانی کی ایک بوند نہ پائی تمام رات

اُس نے کہا تھا ملنے کو آؤں گا دن ڈھلے
در کی نہ ہم نے کنڈی لگائی تمام رات

تھوڑا سا مسکرا تو دیا ہے وہ وقتِ صبح
روتے ہوئے بتائی تھی اُس نے تمام رات

ساڑھی بھی چاہیے مجھے لاکٹ بھی چاہیے
دیتی رہی دہائی لُگائی تمام رات

شوہر بیچارا دیر سے لوٹا جو اپنے گھر
بیگم نے کی ہے اس کی دُھنائی تمام رات

ناکے لگے تھے شہر میں پولیس کے جہاں
ہوتی رہی وہاں یہ کمائی تمام رات

آخر میں وہ بیچارا تو بھوکا چلا گیا
دیگیں پکا رہا تھا جو نائی تمام رات

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

نے دل میں کہا ابا جی مونچھوں سے تو اب بے معذرت! مونچھوں کی تو ہم نے اب کبھی شکل نہیں دیکھنی، باقی جیسے آپ کی مرضی...... امی نے کافی معاملہ سلجھا لیا اور فیصلہ کیا کہ ہمیں کسی یونیورسٹی میں داخلہ دلا دیا جائے تاکہ یہاں رہ کر ہمارے نام کو بٹا نہ لگائے۔ یوں ہماری جان کی خلاصی ہوئی۔

ہم یونیورسٹی پہنچ گئے۔ وہاں تو اپنی مرضی اور شان کے مطابق خوب پینٹ شرٹ پہنی اور بڑے ڈھنگ سے پہنی، بلکہ دبنگ ہو کر پہنی اور ابا جی کی لاڈلی مونچھوں سے گن گن کر بدلے لیے۔ روز کلین شیو کی بلکہ کبھی کبھی تو رات کو نیند سے اٹھ اٹھ کر بھی مونچھوں کو رگڑ ڈالا۔ یونیورسٹی میں گئے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ اچانک گھر والوں کو خیال آیا کہ برخوردار! یونیورسٹی پہنچ گیا ہے کہیں وہیں سے کوئی ڈبلی پتلی ''طوطی'' جیسی ٹیں ٹیں کرتی انگریزی بولتی میم ہی نہ بیاہ کر لے آئے۔ کیوں نہ برخوردار کو کسی کھونٹے سے باندھ دیا جائے۔ ہمیں فون کر کے گھر بلایا گیا اور ابا جی نے اپنے ارادے سے آگاہ فرمایا۔ ہم نے کہا ابا جی جیسے آپ کی مرضی ویسے ہم ماڈرن جتنے ہو جائیں، شادی کے معاملے میں دیسی ہی رہیں گے۔

دو چار دن بعد ہمیں لڑکی سے ملوانے کے لیے دوسرے گاؤں بھیجا گیا۔ لڑکی بھی دور پرے کے رشتے میں خالہ کی بیٹی تھی۔ ہم نے خوب رگڑ کے شیو کی، پینٹ شرٹ پہنی، زُلفوں کو خم دیا کہ لڑکی ہمیں دیکھتی ہی رہ جائے۔ خوب سج دھج کے ساتھ خالہ کے گھر پدھارے۔ لڑکی سامنے سے گزری...... وہ کیا گزری، ہم پہ تو جیسے قیامت ہی گزر گئی، ہم ابھی اس کے سحر ہی سے نہیں نکل پائے تھے کہ جیسے بھونچال آ گیا۔ ہم صحن میں براجمان تھے اور خالہ صاحبہ ہمارے پاس بیٹھی ہماری تعریفیں کیے جا رہی تھیں کہ انھیں اچانک کمرے میں بلایا گیا۔ خالہ اندر گئیں اور کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ ہم پریشان کہ کیا ہو گیا؟ تھوڑی دیر بعد آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ پہلے تو ہم تجسس میں تھے کہ ہوا کیا ہے پھر کانوں کو لمبا کر کے کچھ سننے کی جسارت کی اور بعد میں اپنی جسارت پہ غصہ آیا۔ غصہ آتا بھی کیوں نا! وہاں تو ہماری عزت کی دھجیاں اڑائی جا رہی تھیں۔ وہ ''حُسن بانو'' جس کو دیکھنے کے لیے بلکہ جس کو دکھانے کے لیے ہمیں بلایا گیا تھا۔ وہ ہماری مونچھوں پر نالاں تھی۔ حضور ''نالاں'' بھی کیا لفظ ہے اس نے تو اخلاق کی تمام حدیں پار کر دیں۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی غضبناک ہو گئی اور غصے میں بولے جا رہی تھی کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گی جس کی مونچھیں ہی نہیں ہیں، جو شکل ہی سے مرد نہیں لگتا۔ میں اپنی سہیلیوں سے کیا کہوں گی کہ میں نے ''کھسرے'' سے شادی کی ہے۔ اس کی شکل تو لڑکیوں جیسی ہے۔ منحوس نامراد کہیں کا! بڑا پڑھائی کر رہا ہے اس کو تو ''دین'' کا پتا بھی نہیں ہے، پڑھائی کیا کرے گا، بے دین کہیں کا! بھلا جس کی مونچھیں نہ ہوں وہ بھی کوئی مرد ہوتا ہے۔ اماں میں نے اپنی ناک نہیں کٹوانی سہیلیوں میں اس ''ہیجڑے'' سے شادی کر کے!

ہم سے اس سے زیادہ کچھ سنا نہ گیا اور چپ کر کے عزت بچا کر گھر کی راہ لی۔ راستے میں کئی بار شدت جذبات سے روہانسے ہو گئے، مگر ہماری بن

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مونچھوں کی مردانگی آڑے آئی اور آنسو ضبط کر گئے۔ اسی دن ہم نے اپنا بوریا بستر گول کیا اور واپس یونیورسٹی جا سدھارے۔

وقت آہستہ آہستہ کٹتا گیا، ہماری ماسٹر کی ڈگری مکمل ہوگئی اور ہم یونیورسٹی کو ہمیشہ کے لیے اللہ حافظ کہہ کر اکیلے ہی گھر لوٹ آئے۔ کچھ دن گزرے تھے کہ ہمارے گاؤں میں کسی معاملے پر پنچایت اکٹھی ہوئی۔ ابا جی بھی جا رہے تھے۔ ہم نے ابا جی سے فرمائش کی کہ ہمیں بھی ساتھ لے چلیں۔ پہلے تو وہ کسمسائے مگر پھر ہامی بھر لی۔ ہم پنچایت میں پہنچے تو ہمارے لیے خاص طور پر کرسی منگوائی گئی۔ باقی لوگ چارپائیوں پر براجمان تھے۔ ہم احساس فخر سے پھول کے کُپا ہو گئے۔ بڑے اور بچے ہمیں کن انکھیوں سے دیکھیں اور بغلوں میں منہ چھپا کے ہنسیں۔ خیر! ہم سینہ تان کر بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر بعد بحث مباحثہ شروع ہوا اور شور بلند ہوتا چلا گیا۔ ہم بھی فریقین کو بغور سنتے رہے۔ اچانک ہمیں محسوس ہوا کہ ہم پڑھے لکھے ایم۔ اے پاس بے روزگار نوجوان ہیں۔ یہ جاہل لوگ بحث کو لمبا کیے جا رہے ہیں، اب جب ہمیں مسئلے کی نوعیت کا پتا بھی چل گیا ہے، تو کیوں نہ ہم بھی اپنی رائے سے انھیں نوازیں۔ ہم نے بڑے حاکمانہ انداز میں سب کو چپ کرایا اور بولنا شروع کیا۔ باقی تو سب چپ کر گئے مگر نمبردار صاحب غضبناک ہو کر بولے ''چپ کر اوئے کھودے!'' تمھیں کیا پتا کہ پنچایت میں کیسے بولا جاتا ہے۔ مونچھیں تو رکھ نہیں سکتے، نامرد کہیں کے اور آ گئے پنچایت میں فیصلہ کرنے۔ پہلے مردوں میں بیٹھنے کے قابل تو ہو، تم تو شکل سے مسلمان بھی نہیں لگتے اور ہمارے منہ لگتے ہو۔ اتنے بڑے بڑے مونچھوں والے بزرگ بیٹھے ہیں یہاں پر اور تمھیں شرم نہیں آئی، ان کے سامنے بولتے ہوئے۔

بس جناب! پھر کیا تھا ہم اٹھے اپنے کپڑے جھاڑے اور اپنا سا منہ لے کر گھر کو چل دیے۔ دو دن بعد سامان پیک کیا اور روزگار کی تلاش میں لاہور کا رخ کیا۔

الحمد للہ لاہور آتے ہی ہم ایڈجسٹ ہو گئے۔ روزگار بھی مل گیا اور مونچھوں کو بلاناغہ رگڑنے کا موقع بھی! اب بھی کبھار گھر جاتے ہیں اور رشتہ داروں کے ہاں بھی تشریف لے جاتے ہیں۔ مرد تو ہمارے ساتھ بیٹھنا اپنی شان کے خلاف ہی سمجھتے ہیں جب کہ عورتیں ہمیں اپنی محفل میں بٹھانا فرض عین سمجھتی ہیں۔ ابا جی بھی ہمیں گھر میں دو دن سے زیادہ برداشت نہیں کرتے۔ حیلے بہانے سے مونچھوں کی طرف ہماری توجہ دلانا شروع کر دیتے ہیں جب بھی وہ ایسا کرتے ہیں تو ہم اپنا بوریا بستر گول کر کے لاہور چلے آتے ہیں۔

ابا جی نے مونچھیں منڈوانے کے بعد ہمیں کبھی اپنے گلے نہیں لگایا۔ خیر! ہمیں بھی ابا جی کے گلے لگتے شرم آتی ہے اور ویسے بھی گلے لگنے کے بعد جب وہ ہمیں ماتھے اور گالوں پر چومیں گے تو ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہمیں چبھیں گی۔ یہ سوچ کے ہم بھی ذرا کنی کتراتے رہتے ہیں۔ ابا جی نے آج تک اپنی مونچھوں پہ آنچ نہیں آنے دی اور ہم نے آج تک اپنی آنچ پہ مونچھیں نہیں آنے دیں، میرا مطلب ہے منہ پہ مونچھیں نہیں آنے دیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

نستعلیق کا ذکر آیا تو ایک لطیفہ بھی سن لیجیے۔

نوری کچھ عرصہ ہوا نوری نستعلیق کے موجد جناب جمیل مرزا نے ایک پریس کانفرنس کی تھی۔ اس کے بعد عشائیہ بھی تھا۔ جمیل مرزا صاحب نے ایک صحافی سے پوچھا: ''کیا آپ کو کھانا پسند آیا؟'' صحافی نے جواب دیا: ''بہت مزے کا کھانا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میں نوری نستعلیق نگل رہا ہوں۔''

معاف کیجیے، ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ بات شعروں سے شروع ہوئی تھی اور ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ مذکورہ شعر ہماری تصنیفِ لطیف نہیں ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ انھیں مولانا کوثر نیازی کے رشحاتِ فکر سمجھیں لیکن یہ بھی درست نہیں کیوں کہ تیسرے شعر میں تانیث کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ مولانا صاحب اپنی سیاسی وفاداریاں بدل سکتے ہیں، صیغہ نہیں بدل سکتے۔

تمھاری یاد میں بکھر بکھر جاتا ہوں
خود سے پوچھتا ہوں کیا سبب تھا بے وفائی کا
زندگی کی طلب ہے نہ مرنے کا موقف
جانے کیسے بے دلی کے عالم میں جی رہے ہیں ہم
ہزار تلخیاں ہیں اپنی ذات کے ساتھ
میں کہاں بھٹک گئی ہوں تیری یاد کے ساتھ

قارئین کرام کو زیادہ دیر تک سسپنس میں رکھنا مناسب نہیں، لہٰذا ہم بتائے دیتے ہیں کہ مذکورہ اشعار

خامہ بگوش کے قلم سے

نامور کالم نگار، نقاد اور ادیب مشفق خواجہ کے قلم کی شوخیاں ۔ ایسے شگفتہ کالم انہی کا خاصہ تھے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

گلوکارہ ناہید اختر کے ہیں۔ لاہور کے ایک اخبار میں موصوفہ کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ: ”یوں تو مجھے شروع ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا لیکن گلوکاری کی مصروفیات کی وجہ سے میں اپنا شوق پورا نہ کرسکی۔ گزشتہ تین چار برس سے شعر کہنے کا شوق پھر زور پکڑ گیا تو میں نے طبع آزمائی شروع کر دی اور اب تک کئی غزلیں لکھ چکی ہوں۔“

محترمہ کا نمونۂ کلام دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں شعر کہنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ کاش وہ گلوکاری کی مصروفیات کو بہانہ بنا کر شاعری کے شوق کو نہ دبائیں۔ مصروفیات تو قتیل شفائی اور اقبال صفی پوری کی بھی تھیں لیکن انھوں نے کبھی اپنے شوق کو نہیں دبایا۔ ہمیشہ شاعری کو دباتے رہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ شاعری اس حد تک دب گئی ہے کہ آج ان دونوں کا شمار بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔

بہرحال یہ امر مسرت کا باعث ہے کہ گزشتہ تین چار برسوں سے ناہید اختر کا شوق شاعری زور پکڑ گیا ہے۔ شاید اسی زور آزمائی کا نتیجہ ہے کہ ان کے شعر عروض کی پٹڑی سے اتر گئے لیکن یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ اچھے شعر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ عروض کا پابند ہو۔ جب کسی شعر میں کام کی اور بہت سی باتیں ہوں، عروض تو کیا معنوں کو بھی بآسانی نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔ محترمہ کے جو تین شعر اوپر درج کیے گئے ہیں ان میں بے شمار خوبیاں ہیں۔ مثلاً پہلے شعر ہی کو لیجیے۔ اس میں محترمہ نے اپنے لیے تذکیر کا صیغہ استعمال کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی ہیں۔ کسی کی بے وفائی کا سبب انھوں نے اپنے آپ سے پوچھا ہے، کوئی کم ہمت ہوتا تو فال نکالنے والے توتے سے پوچھتا۔

ناہید اختر نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ انھوں نے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ خصوصاً میر تقی میر اور غالب کا کلام کئی بار پڑھا ہے۔ موصوفہ کے اس بیان کی تصدیق ان کے اشعار سے بھی ہوتی ہے۔ میر اور غالب کے ہاں محبوب کی بے وفائی اور زندگی سے بیزاری کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ ناہید اختر نے بھی ان مضامین کو اس خوب صورتی سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے بہ آسانی زندگی سے بیزار ہوسکتے ہیں۔

اگر ہم صاحبِ دیوان ہوتے تو اپنا دیوان دے کر محترمہ سے ان کے تینوں شعر لے لیتے۔ اب ہم یہی کر سکتے کہ محسن بھوپالی کے تینوں دیوان محترمہ کے حوالے کر دیں اور محترمہ کے تینوں شعر محسن بھوپالی کو سونپ دیں۔ سودا بُرا نہیں۔ محسن صاحب فائدے ہی میں رہیں گے کیوں کہ محترمہ نے اعلان کیا ہے کہ آیندہ وہ ٹی وی پر خود اپنا کلام گایا کریں گی۔ محسن بھوپالی کے کلام کو جب وہ اپنا کلام سمجھ کر گائیں گی تو یہ کلام زبان زدِ خاص و عام ہوجائے گا۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ پوچھیں کہ ناہید اختر کے تین شعر محسن بھوپالی کے کس کام آئیں گے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ تینوں دیوان ناہید اختر کو دے دینے کے بعد محسن بھوپالی کے پاس کچھ نہ کچھ رہنا چاہیے۔ اگلے سال ساداتِ امروہہ کے مشاعرے میں انھیں کلام سنانا ہی ہوگا۔ یہ تین شعر وہاں کام آئیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ساداتِ امروہہ کے مشاعروں میں شعروں سے زیادہ شاعر کام آتے ہیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ناہید اختر نے بتایا کہ ان میں شعر گوئی کا شوق احمد فراز اور پروین شاکر کی شاعری کے مطالعے سے پیدا ہوا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ فراز اور پروین کی شاعری کے مطالعے کا کوئی مثبت نتیجہ ظاہر ہوا' ورنہ اب تک تو ہم نے یہی دیکھا تھا کہ ان دونوں کے کلام سے متاثر ہوکر لوگ شاعری ترک کر دیتے تھے۔

ویسے بھی آج کل زمانہ بہت خراب ہے۔ ہم نے کئی ایسے استاد دیکھے ہیں جو اصلاح کے بہانے شاگردوں کا کلام ہتھیا لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں استاد اختر انصاری اکبر آبادی کا ایک واقعہ ان کے شاگرد سلطان جمیل نے سنایا ہے۔ سلطان جمیل اب تو اپنے منہ کا مزہ بدلنے اور دوسروں کے منہ کا مزہ خراب کرنے کے لیے افسانے لکھتے ہیں لیکن کسی زمانے میں شعر بھی کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنی ایک غزل استاد کو اصلاح کے لیے دی۔ کچھ دنوں بعد شاگرد نے غزل واپس مانگی تو استاد نے کہا: ''میاں طبیعت پر زور دے کر شعر کہا کرو تمھاری غزل تو بڑی بے مزہ تھی۔ اصلاح کی گنجائش بالکل نہیں تھی، اس لیے میں نے پھاڑ کر پھینک دی۔''

کچھ عرصے بعد یہی غزل استاد نے اپنے رسالے میں اپنے نام سے شائع کر دی۔ شاگرد نے دیکھی تو شکوہ کیا: ''استاد! آپ نے تو کہا تھا کہ غزل پھاڑ کر پھینک دی، پھر یہ رسالے میں آپ کے نام سے کیسے چھپ گئی؟'' استاد نے فرمایا: ''میاں غلطی ہوگئی۔ جیب میں تمھاری غزل رکھی تھی اور میری بھی۔ اپنی غزل میں نے پھاڑ کر پھینک دی اور تمھاری غزل کاتب کے حوالے کر دی۔ آیندہ اصلاح کے لیے مجھے تم دو غزلیں دینا تاکہ ایک پھاڑ کر پھینک دوں تو دوسری اصلاح کے بعد تمھیں واپس کر دوں۔''

(9/اگست 1985ء)

قافیہ وردیف کا بوجھ

ہم تین چیزوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ تجریدی مصوری سے، علامتی افسانے سے اور اساتذہ کے کلام سے۔ وجہ یہ ہے کہ ان تینوں کے مفہوم اخذ کرنا ناظر یا قاری کی ذمہ داری ہے نہ کہ مصور، افسانہ نگار اور شاعر کی۔ مصور الوان و خطوط سے، افسانہ نگار الفاظ سے اور اساتذۂ سخن ردیف و قوافی سے فن پارے کو اس حد تک گراں بار کر دیتے ہیں کہ اس میں مزید کوئی بار اٹھانے کی گنجائش نہیں رہتی۔ لہٰذا مفہوم و معنی کا یہ بار ہم جیسے ناتوانوں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ میر تقی میر کو بھی اس قسم کا تجربہ ہوا تھا جس کا ذکر اس شعر میں ملتا ہے:

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

ہم تجریدی مصوری کی نمائشوں میں کبھی نہیں جاتے، یہاں تک احتیاط برتتے ہیں کہ جب شہر میں اس قسم کی کوئی نمائش ہوتی ہے، تو گھر سے باہر نہیں نکلتے کہ کہیں فضائی آلودگی ہم پر بھی اثر انداز نہ ہوجائے۔ علامتی افسانے لکھنے والوں کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتے ہیں کہ انھوں نے گفتگو میں علامتوں سے کام لیا تو ہمارا حشر بھی وہی ہوگا جو افسانے کی صنف کا ہوا ہے۔ اساتذۂ سخن کا ہم بے حد ادب کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ہم نے کبھی ان سے بے تکلف ہونے کی جسارت نہیں کی۔ یعنی ان کے دواوین کے قریب جانا اور چھونا تو کیا، انھیں دور سے دیکھنا بھی ہمارے نزدیک سوءِ ادب ہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے، تو بڑی جماعتوں کے طالب علموں کو اُن کی شرارتوں پر جو سخت سزا دی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ اُن سے استاد ذوق کی کسی غزل کی شرح لکھوائی جاتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے بڑی جماعتوں میں پہنچنے سے پہلے ہی سلسلۂ تعلیم منقطع کر لیا۔ معلوم نہیں آج کل اسکولوں میں اس قسم کی سزائیں دینے کا رواج ہے یا نہیں۔ اگر ہوگا تو یقیناً استاد اختر انصاری اکبر آبادی کا کلام سزا دینے کے کام آتا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ہوگا۔ یہ بات ہم نے بلاوجہ نہیں کہی۔ سلطان جمیل نسیم نے یہ واقعہ ہمیں سنایا ہے کہ حیدرآباد میں ایک مجرم کو پندرہ کوڑے کھانے یا استاد کی پندرہ غزلیں سننے کی سزا دی گئی۔ سزا کے انتخاب کا حق استعمال کرتے ہوئے مجرم نے کوڑے کھانے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہ سزا نسبتاً نرم تھی۔ سلطان جمیل نسیم چونکہ افسانہ نگار ہیں، اس لیے ممکن ہے بعض لوگ اس واقعے کو درست نہ سمجھیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ کسی افسانہ نگار کا سہواً کسی واقعے کو صحیح بیان کر دینا خارج از امکان نہیں۔

استاد اختر انصاری شاعر ہی نہیں، ایک رسالے کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ رسالہ تو کبھی کبھی چھپتا ہے لیکن دیوان ہر سال باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں استاد کا بیسواں دیوان شائع ہوا تھا، تو وہ اُسے اپنے عقیدت مندوں میں قیمتاً تقسیم کرنے کے لیے کراچی تشریف لائے تھے۔ اس سلسلے میں وہ ہم سے بھی ملے تھے۔ ہم نے عرض کیا تھا: ''استاد! ہم اس شرط پر قیمت ادا کریں گے کہ دیوان آپ کسی اور کو دے دیں۔'' اس گزارش سے وہ بے حد خوش ہوئے اور فرمایا: ''اگر سب عقیدت مند آپ کی طرح کے ہوں، تو پھر دیوان چھپوائے بغیر ہی اُس کا پورا ایڈیشن فروخت ہوسکتا ہے۔''

جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، اُسی طرح تمام استاد بھی یکساں طور پر استادی کے درجے پر فائز نہیں ہوتے۔ حضرت تابش دہلوی کا شمار بھی اساتذۂ فن میں ہوتا ہے۔ لیکن اُن کی خوش گوئی اور خوش فکری میں کلام نہیں۔ بلاشبہ وہ ہمارے مقبول شاعروں میں سے ہیں۔ ہمارے دل میں ان کا بے حد احترام ہے۔ اسی لیے ہم نے ان کے مجموعہ ہائے کلام کو ادباً دور ہی سے دیکھا ہے۔ ان کے نئے مجموعے کو قریب سے دیکھنے کی اتفاقی صورت یوں پیدا ہوگئی ہے کہ پچھلے دنوں ہم حیدر آباد سندھ جا رہے تھے، بس میں ہمارے ساتھ جو صاحب بیٹھے تھے، اُن کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جسے وہ بڑے انہماک سے پڑھ رہے تھے۔ ہمیں اُن صاحب کی بدذوقی پر حیرت ہوئی کہ بس کے تمام مسافر تو ڈرائیور کے ذاتی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والے نازیہ اور زوہیب کے نئے گانوں سے محظوظ ہو رہے ہیں اور یہ صاحب کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اسی دوران میں بلا ارادہ ہماری نظر اُس صفحے پر پڑی جو موصوف کے سامنے کھلا تھا۔ اس پر جلی حرفوں میں یہ عنوان درج تھا: ''شان الحق حقی کی شادی پر غالب سے معذرت کے ساتھ۔'' ہم شان صاحب کے پرانے نیاز مند ہیں۔ اس لیے اس عنوان پر ہمیں بے حد تعجب ہوا۔ شان صاحب کی شادی پر غالب سے معذرت کی ضرورت ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ شان صاحب غالب کے دیوان کی شرح لکھتے یا تضمین کرتے تو معذرت کی گنجائش تھی، مگر شادی تو بالکل ایک مختلف کام ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہم نے اپنے ہم سفر سے کتاب دیکھنے کی اجازت چاہی تو اُنھوں نے فوراً اُسے ہمارے حوالے کر دیا، جیسے وہ اسی انتظار میں ہوں کہ کوئی ان سے کتاب لے لے۔ اس کے بعد وہ تو گانے سننے میں اور ہم کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہوگئے اور یوں ہم نے جناب شان الحق حقی سے نیاز مندی کا رشتہ رکھنے کی پاداش میں حضرتِ تابش دہلوی کے چوتھے مجموعۂ کلام ''غبارِ انجم'' سے استفادہ کیا۔ اسے ہم اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔

> تابش صاحب کو شان صاحب کی شادی پر غالب سے معذرت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ انھوں نے شان صاحب کا سہرا غالب کی زمین میں لکھا ہے۔ گویا شادی تو شان صاحب کی ہوئی اور زمین غالب کی پامال ہوئی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مُستقبل کا پہناوا......
کاغذی ملبوسات
پہنیے اور پھینک دیجیے

فرزانہ نگہت

کیا اس وقت کوئی اس بات پر یقین کر سکے گا کہ آئندہ سالوں میں ہم ایسے ملبوسات بھی تن زیب کیا کریں گے جو کاغذ کے بنے ہوں گے؟ کاغذی ملبوسات تیار کرنے کا خیال سب سے پہلے 1966ء میں کنساس سٹی امریکا کی سکاٹ پیپر کمپنی کے مالک جان سکاٹ کے ذہن میں پیدا ہوا۔ جس نے اپنی کمپنی کے حصہ داروں کی مشاورت سے دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ''پہنیے اور پھینک دیجیے'' قسم کے کاغذی ملبوسات کی مینوفیکچرنگ شروع کی۔ اس وقت یوں معلوم ہونے لگا تھا گویا ملبوسات کی صنعت میں ایک انقلاب برپا ہونے والا تھا۔ ان کاغذی ملبوسات کی بڑے وسیع پیمانے پر تشہیر کروائی گئی۔ اندرون و بیرون ملک اخبارات میں ان کے بارے میں خبریں شائع کروائی گئیں۔ جس کے نتیجے میں ان کاغذی ملبوسات کو تیار کرنے والی اسکاٹ پیپر کمپنی کو ہزاروں کی تعداد میں آرڈر ملنا شروع ہو گئے۔ ڈیلروں اور تقسیم کنندگان نے اس نئی اور نرالی ایجاد کے بارے میں چھان پھٹک شروع کی۔ اس وقت یہ بات سامنے آئی کہ دراصل اسکاٹ کمپنی والوں نے اپنی دوسری کاغذی مصنوعات کی فروخت بڑھانے کے لیے کاغذی لباس کو ایک پبلسٹی سٹنٹ کے طور پر استعمال کیا تھا۔

لیکن اس وقت کاغذی لباسوں کی تیاری واقعی عمل میں آ چکی تھی۔ ہر چند کہ یہ محدود پیمانے پر تھی۔ انھیں پان امریکن ائیر ویز کے ہوائی جہازوں کے فضائی میزبانوں کے ہلکے نیلے رنگ کے یونیفارموں کے ہم رنگ بالا پوشوں کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ انھیں باورچی خانوں میں بھی استعمال کیا جا رہا تھا۔ ایک مرتبہ استعمال کے بعد یہ پھینک دیے جاتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کاغذی ملبوسات کی تیاری میں بھی بہتری آتی گئی۔ آرائش و زیبائش کی اشیا فروخت کرنے والی دکانیں ہزاروں کی تعداد میں سفید دھاریوں والے گلابی گاؤن خرید کر اپنی دکانوں میں

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

برائے فروخت آراستہ کرنے لگیں۔ یہ گاؤن سیلونوں میں کام آتے تھے۔ انھیں کیلی فورنیا کی ایک کمپنی زیمر اینڈ کو تیار کرتی تھی۔ جو بعد از استعمال پھینک دی جانے والی اشیا کی تیاری میں سرِفہرست تھی۔ یہ کمپنی لیبارٹریوں میں کام کرنے والوں کے لیے کاغذی کوٹ، خوارک پر تجربات کرنے والوں کے لیے کاغذی گاؤن اور ہسپتالوں میں کام کرنے والے صفائی کے عملے کے لیے کاغذی جوتوں میں بڑی شہرت کی حامل تھی۔ اس فرم کے صدر ہیرلڈ زیمر کا کہنا تھا ''دس عشروں کے اندر اندر ہر صنعتی یونٹ میں بعد از استعمال پھینک دیے جانے والے کوٹوں اور لبادوں کی مانگ میں قابلِ ذکر اضافہ ہوجائے گا۔''

دیواروں پر سفیدی اور رنگ روغن کرنے والوں کے لیے کاغذی گاؤن بہترین ہیں کہ یہ ان کے لباسوں کو چھینٹوں اور داغ دھبوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اگر ہر شخص اپنی گاڑی میں ایک کاغذی گاؤن رکھے تو ٹائر کھولتے یا کوئی اور کام کرتے وقت یہ گاؤن اسے ڈرائی کلیننگ کے اخراجات سے بچائے گا۔ یعنی یہ اس کے لباس کو گریس اور دیگر چیزوں کے داغ دھبوں سے محفوظ رکھے گا۔ یہ گاؤن صرف پونے دو ڈالر میں مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ اسے ایک مرتبہ استعمال کے بعد دوسری بار بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہ بہت پائیدار طور پر بنایا گیا ہوتا ہے۔

کاغذی کپڑے تیار کرنے والی دو سرکردہ امریکی کمپنیوں اسکاٹ اور کمبرے کلارک نے زیادہ مضبوط اور پائیدار کاغذی کپڑا تیار کرنے کے لیے یہ کیا تھا کہ نائیلون کے ایک باریک جال کو خصوصی طریق کار کے عمل سے گزارتے ہوئے کاغذات کی موٹی تہوں کے درمیان رکھ کر ایسا کاغذی کپڑا تیار کیا تھا جو دیکھنے اور پہننے میں عام کپڑے جیسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کپڑے کو کچھ کیمیائی اجزا کے اضافے کے ساتھ اس قابل بھی بنالیا جاتا تھا کہ اس پر آگ کا اثر نہ ہو اور نہ ہی یہ پانی میں بھیگنے سے خراب ہو۔ یہ کپڑا زیادہ تر سڑکوں پر کام کرنے والے مزدوروں کی جیکٹیں تیار کرنے میں استعمال ہوتا تھا۔

ہسپتال اور ڈاکٹر بہت پہلے ہی سے مابعد استعمال پھینک دیے جانے والے ملبوسات، جیکٹیں اور سرجیکل گاؤن وغیرہ استعمال کر رہے ہیں۔ معاشی پہلو سے کاغذی ملبوسات کے استعمال سے بچت ہی بچت ہے۔ ایک پھینکے جانے والے کاغذی گاؤن کی قیمت پچیس سینٹ ہوتی ہے۔ جبکہ عام کپڑے کے گاؤن کی دھلائی میں چالیس سینٹ خرچ ہوتے ہیں۔ ایک پرائیویٹ گائنا کالوجسٹ کی رپورٹ کے مطابق کاغذی گاؤنوں کے بچت کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد ہیں۔ وہ ایک ڈبے میں پچاس پچاس کی تعداد میں بند ہوتے ہیں۔ آسانی سے اسٹور کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے ساتھ داغ دھبوں، پھٹنے اور باندھنے کے کوئی مسائل نہیں ہوتے۔ مزید برآں مریض بھی ایسے گاؤن پسند کرتے ہیں جنھیں پہلے کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔

کاغذی کپڑے اب صرف ریاست ہائے متحدہ امریکا ہی میں نہیں بلکہ جنوبی امریکی ممالک، یونیورسٹیوں میں کاغذ کے بنے ہوئے ڈگری گاؤن اور کیپ متعارف کرانا شروع کردیے ہیں۔ جنھیں بعد از استعمال پھینک دیا جاتا ہے۔ مردوں کی پیراکی کی نیکریں جو کاغذی چادروں کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ مارکیٹوں میں عام دستیاب ہیں۔ ڈیونٹ پیپر کمپنی نے کاغذی چادروں کو کتابوں کی جلدیں بنانے اور دیواریں ڈھانپنے سے لے کر پیراکی کے لباس تیار کرنے تک ترقی دی ہے۔ ہوٹلوں میں کاغذی رومالوں کو بھاری تعداد میں خریدا جاتا ہے اور گاہکوں کو مہیا کیا جاتا ہے۔ استعمال کرنے میں رومال بے حد عمدہ اور

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

موزوں معلوم ہوتے ہیں اور دیکھنے میں خوبصورت۔

کاغذی کپڑے سے بچوں کے بب اور دوسرے کپڑے بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح کاغذی چادریں تکیوں کے غلاف بھی۔ کاغذی چادریں اتنی بڑی بڑی ہوتی ہیں کہ پورا بستر ڈھانپ لیتی ہیں۔ امریکی محکمۂ افواج میں یہ چادریں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں استعمال ہوتی ہیں۔ ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ہر سال فوجیوں کے لیے لاکھوں کی تعداد میں کاغذی زیر جاموں کاغذی جوتوں اور چادروں کے آرڈر دیے جاتے ہیں۔ ٹرینوں اور ہوائی جہازوں میں کاغذی بالا پوشوں اور سرپوشوں کا استعمال عام ہے۔ کاغذی رومال بھی ان میں بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔

ایک حقیقت یہ ہے کہ خریدار صرف قیمت دیکھ کر ہی ہر چیز نہیں خرید لیا کرتے۔ مثلاً ٹشو پیپر جو ہر زمانے میں بے حد پر فروش اور سب سے زیادہ استعمال ہونے والی چیز چلی آرہی ہے۔ روپیہ نہیں بچاتا لیکن صفائی و سہولت ضرور مہیا کرتا ہے۔ اسی طرح کاغذی نیپکن کوئی خاتون خانہ محض بچت کا پہلو مدنظر رکھتے ہوئے نہیں خریدتی جب اس کے پاس اپنا لانڈری کا انتظام ہو۔ سالہا سال سے خواتین بڑی محنت و مشکل سے ویکیوم کلینرز کے گرد مٹی کے تھیلے صاف کرتی چلی آرہی تھیں پھر جب کاغذی تھیلے متعارف ہوئے، تو انھوں نے انھیں فوراً ہی قبولِ عام سند عطا کردی اور قیمتوں کی بھی پروا نہیں کی۔ اب بچوں کے ڈائپرز کے بارے میں بھی یہی رجحان دیکھنے میں آ رہا ہے۔ کپڑے کے بنے ہوئے ڈائپرز استعمال تو کر لیے جاتے تھے لیکن انھیں ٹھکانے لگانا ایک مسئلہ ہوتا تھا۔ لیکن اب کاغذی ڈائپرز نے یہ مشکل آسان کر دی ہے۔ استعمال کے بعد انھیں فلش میں بہا دیا جاتا ہے۔ کاغذی ڈائپرز کی سیل آج کل ہر جگہ آسمان پر پہنچی ہوئی ہے۔ یہ اقتصادیات پر سہولت کا خراج ہے۔

مابعد استعمال پھینک دی جانے والی اشیا کے بارے میں ایک دوسری قابلِ ذکر حقیقت یہ ہے کہ ان میں بہت سی آہستہ آہستہ ہی قبولِ عام کی سند حاصل کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر کاغذی تولیے۔ کاغذی تولیہ جان اسکاٹ نے 1967ء میں متعارف کرایا تھا۔ یہ تولیے اس لیے مقبولِ عام کی سند حاصل نہ کرسکے کہ یہ بہت موٹے اور بھاری تھے اور ٹوائلٹ کے کام نہ آسکتے تھے۔ چوبیس سال گزرنے کے بعد انھیں گھریلو استعمال کے لیے تیار کیا جانے لگا۔ پھر بھی انھیں ایسی مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ لیکن آج کل گھریلو خواتین انھیں سالانہ اربوں کھربوں کی تعداد میں استعمال کرتی ہیں۔

اگر تجارتی تاریخ کوئی راہنما چیز ہے، تو یہ استعمال کیجیے اور پھینک دیجیے، قسم کی چیز کی مقبولیت کا پھیلاؤ اس قسم کی دوسری اشیا کی ایجاد اور پذیرائی کا دروازہ کھول دیتا ہے مثلاً کاغذی نیپکن نے کاغذی تولیوں کو قابلِ مقبول بنا دیا ہے اور کاغذی گاؤنوں نے ساحلی ملبوسات کو۔

لیکن کاغذی ملبوسات و دیگر کاغذی مصنوعات کی پذیرائی و مقبولیت خواہ کتنی ہی حد تک پہنچ جائے یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ آیا یہ کپاس، ریشم، پولیسٹر و دیگر قدرتی و غیر قدرتی ریشوں سے بنے ہوئے کپڑوں کے مقابل آسکیں گی یا نہیں۔ کاغذی کپڑا تیار کرنے والے کو اتنی اُجرت نہیں ملتی جتنی کہ دوسرا کپڑا تیار کرنے والے کاریگر کو۔ یہی حال انھیں تیار کرنے والی فیکٹریوں کا بھی ہے۔ لیکن اس کا امکان موجود ہے کہ ان کے مسائل کا حل ضرور تلاش کر لیا جائے گا اور وہ وقت بھی دور نہیں جب دنیا بھر کے لوگ اپنی مارکیٹوں سے نہایت سستے داموں بڑی بھاری تعداد میں کاغذی ملبوسات اور دیگر کاغذی مصنوعات خرید رہے ہوں گے۔

○○○

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کھیل کھلاڑی

منکہ ایک آل راؤنڈر

نیوزی لینڈ کے عظیم کھلاڑی سر رچرڈ ہیڈلی کی جگ بیتی

عاصم محمود

نیوزی لینڈ کے سر رچرڈ ہیڈلی کا شمار دنیائے کرکٹ کے عظیم ترین آل راؤنڈرز میں ہوتا ہے۔ انھوں نے فروری 1973ء میں پہلا ٹیسٹ پاکستان کے خلاف کھیلا۔ ان کا کیریئر پھر جولائی 1996ء میں ختم ہوا۔ سترہ سالہ کرکٹ کیریئر کے دوران انھوں نے 431 وکٹیں لیں۔ ہیڈلی ٹیسٹ کرکٹ میں پہلے بالر ہیں جنھیں 400 وکٹیں لینے کا اعزاز

ان کے لیے منگوائے گئے 400 پھولوں میں سے انھیں صرف چار ہی ملے

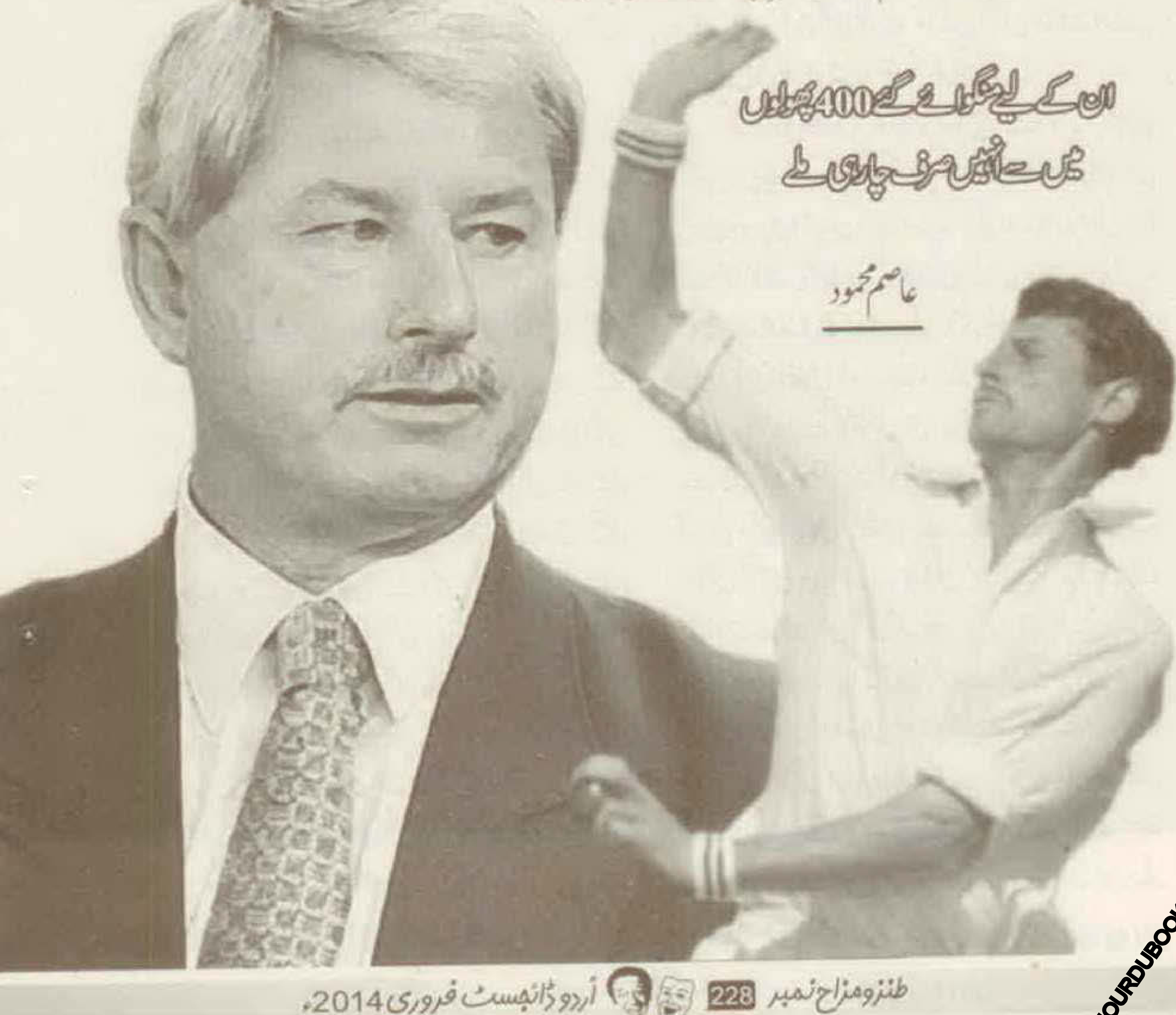

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

حاصل ہوا۔

رچرڈ ہیڈلی پہلی بار 1976ء میں پاک و ہند آئے۔ یہاں انھوں نے پاکستان اور بھارت کے خلاف تین تین ٹیسٹ کھیلے۔ پاکستان میں انھوں نے اچھی کارکردگی دکھائی اور اپنے کھیل سے مطمئن بھارت پہنچے۔ لیکن بھارتی امپائرز کی مسلسل بے ایمانی نے کیوی کھلاڑیوں کو کئی بار غم و غصے کا نشانہ بنایا۔

مدراس (چنائے) میں نیوزی لینڈ اور بھارت کا آخری ٹیسٹ ہوا۔ ہیڈلی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ چناں چہ امپائر نے انشومن گائیکوارڈ کو ہٹ وکٹ آؤٹ نہ دیا، تو ہیڈلی نے بیل اُٹھا کر اُسے دے ماری۔ اسی میچ کے دوران، جس نے ہیڈلی کو بیمار کر ڈالا۔ انھوں نے قسم کھائی کہ وہ دوبارہ برصغیر نہیں آئیں گے۔

لیکن ٹیسٹ کرکٹ میں زیادہ وکٹیں لینے کا ریکارڈ قائم کرنے کی خاطر ہیڈلی کو بادلِ نخواستہ 1988ء میں بھارت آنا پڑا۔ یہ دورہ کامیاب رہا اور انھوں نے تین ٹیسٹ کھیل کر 17 وکٹیں لیں۔

چارسویں وکٹ

فروری 1990ء میں ہیڈلی نے کرائسٹ چرچ میں بھارتی ٹیم کے خلاف ٹیسٹ کھیلا۔ اسی میں سنجے منجریکر کو آؤٹ کر کے ہیڈلی نے چارسویں وکٹ لینے کا اعزاز حاصل کیا۔ آسٹریلوی بالر، فریڈ ٹرومین پہلا کھلاڑی ہے جس نے تین سوویں وکٹ لی تھی۔ تب اس نے کہا تھا: ''مستقبل میں جس نے بھی میرا ریکارڈ توڑا، یقیناً اس کا بدن تھکن کے مارے چُور چُور ہوگا۔

رچرڈ ہیڈلی کو بھی اُمید تھی کہ ان کا قائم کردہ ریکارڈ خاصہ عرصہ تک برقرار رہے گا۔ لیکن اُسے صرف چار برس بعد بھارتی آل راؤنڈر، کپل دیو نے توڑ ڈالا۔ موجودہ ریکارڈ سری لنکن بالر مرلی دھرن نے 800 وکٹیں لے کر قائم کیا۔ اس ضمن میں ہیڈلی کا کہنا ہے: ''میرا خیال ہے کہ یہ ریکارڈ کچھ عرصہ برقرار رہے گا۔ جس نے اِسے توڑا، اُسے کم از کم 30 برس ٹیسٹ کھیلنا کرکٹ ہوگی۔''

عمران خان۔ عظیم ترین آل راؤنڈر

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ 1970ء تا 1990ء کے دوران ہی ٹیسٹ کرکٹ کے تین عظیم آل راؤنڈر...... عمران خان، آئن بوتھم اور کپل دیو بھی نمودار ہوئے۔ ان میں چوتھا مقام خود رچرڈ ہیڈلی کو حاصل ہیں۔

تینوں معاصر

مرلی دھرن

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

عمران خان

آل راؤنڈرز میں ہیڈلی کی نظر میں عمران خان عظیم ترین ہیں۔ وہ کہتے ہے: بلے باز کی حیثیت سے عمران ایک تا چھے، کسی بھی نمبر پر کھیل سکتے تھے۔ پھر انھیں یہ قدرت بھی حاصل تھی کہ صورت حال کے مطابق سست یا تیز بلے بازی کی جائے۔ غرض وہ بڑے ورسٹائل بیٹسمین تھے۔ بہ حیثیت بالر وہ خطرناک سٹرائک بالر تھے اور تباہ کن اِن سوئنگ بالنگ کراتے۔ ان کی گیندیں خاصی تیز رفتار ہوتیں۔ ان کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ وہ ایک عمدہ بالر تھے۔ کرشماتی شخصیت کے مالک عمران پاکستان کی خاطر اچھے اور کامیاب کپتان بھی ثابت ہوئے۔ میں ان کا بہت احترام کرتا ہوں۔

نئے آل راؤنڈر کی دریافت

دور حاضر میں کرکٹ کے تین انداز (ٹیسٹ، ے روزہ اور ٹی 20) سامنے آچکے ہیں۔ چناں چہ ہر کھلاڑی مختلف میچ کھیلنے میں محو رہتا ہے۔ اس ضمن میں ہیڈلی کا کہنا ہے: ”اب کھیل کے تقاضے اتنے زیادہ ہیں کہ کسی اور عظیم آل راؤنڈر کا سامنے آنا شاید ممکن نہیں رہا۔“

ہیڈلی مزید کہتے ہیں: ”آل راؤنڈر کی ذمے داری یہ ہے کہ وہ بلے یا گیند کے ذریعے میچ کا پانسا بدل ڈالے۔ دلیرانہ اور جوش و جذبے سے بھرپور کھیل دکھانا اس کی خصوصیت ہوتی ہے۔ مگر ایسا کھیل بدن پہ منفی اثرات بھی ڈالتا ہے۔“

دورِ حاضر کے آل راؤنڈرز میں ہیڈلی، جنوبی افریقین کھلاڑی جیکوئس کیلس کو سب سے بہترین سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ”کیلس کرکٹ کے تینوں فارمیٹ میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ چکا اور اعداد و شمار کی رو سے وہ کرکٹ کی تاریخ کا عظیم ترین آل راؤنڈر ہے۔ لیکن کیلس کی

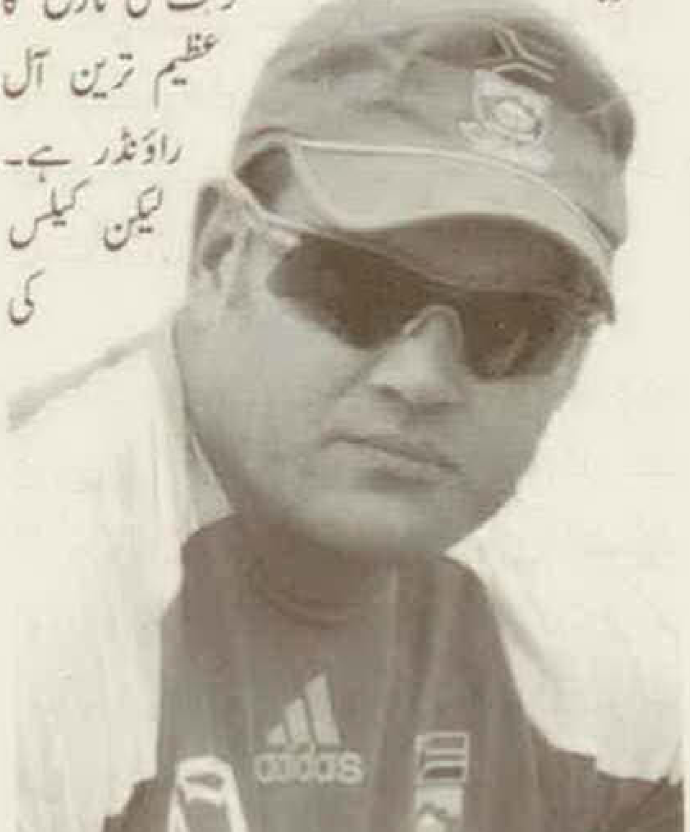

جیکوئس کیلس

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

رخصتی کے بعد شاید ہی اس معیار و مرتبے کا کوئی آل راؤنڈر سامنے آئے۔"

فاسٹ بالروں کی مصیبت

دیگر فاسٹ بالروں کے مانند رچرڈ ہیڈلی بھی اکثر کمر یا ٹانگوں کی کسی نہ کسی بیماری یا چوٹ کا شکار ہوئے۔ بلکہ انھیں کولہے اور گھٹنے کے آپریشنوں سے گزرنا پڑا۔ وجہ یہی ہے کہ فاسٹ بالنگ زیادہ توانائی اور جسمانی مشقت مانگتی ہے۔

چونکہ اب ہر سال بالر بہت زیادہ کرکٹ کھیلتے ہیں، اس واسطے ہیڈلی کہتے ہیں: "خصوصاً فاسٹ بالر کے لیے کرکٹ اب آسان کھیل نہیں رہا۔ وہ ایک سال میں اتنی زیادہ کرکٹ کھیلتا ہے کہ اس کا جسم تیزی سے شکست و ریخت کا نشانہ بنتا ہے۔ اسی لیے اب کوئی فاسٹ بالر دس سال بھی عمدہ کھیل دکھا جائے، تو یہ بڑی بات ہے۔"

راہنمائی کی عدم موجودگی

ہیڈلی کہتے ہیں کہ اب جدید طبی سائنس اور بہترین فٹنس کے ذریعے جسمانی تکالیف کو کم سے کم رکھنا ممکن ہے۔ اس قسم کی سہولیات کھلاڑیوں کو چالیس پچاس برس قبل میسر نہیں تھیں۔ جبکہ ہیڈلی کی تو راہنمائی کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ تب خصوصاً نیوزی لینڈ میں کرکٹ بیشتر کھلاڑیوں کا "پارٹ ٹائم" مشغلہ تھا۔ اسی باعث وہ ملازمت کرکے گزر بسر کرتے اور فارغ اوقات میں کرکٹ سے دل بہلاتے ہیں۔

اب ہیڈلی کو دیکھیے۔ نوجوان ہوئے تو مغربی دستور کے مطابق انھیں سیلزمینی کی نوکری کرنا پڑی تاکہ اپنے اخراجات برداشت کرسکیں۔ پانچ دن وہ کام کرتے، صرف ہفتہ اتوار کی چھٹیوں میں کلب کرکٹ کھیلتے۔ کیوی کرکٹ بورڈ کے کارپرداز پھر انہی کلبوں سے صوبائی ٹیموں یا قومی کرکٹ ٹیم کے لیے موزوں کھلاڑی چن لیتے ہیں۔

اس طریق کار میں خامی یہ تھی کہ کھلاڑی محنت و مشقت اور جان توڑ تربیت سے نہ گزرتے۔ اسی لیے ٹیسٹ کرکٹ میں داخل ہوتے، تو خام کھیل دکھاتے اور ناتجربے کاری کے باعث میچ بھی گنوا دیتے۔ اس ضمن میں ہیڈلی کہتے ہیں:

"کیریئر کے ابتدائی چار برس حقیقتاً مجھے معلوم ہی نہ ہوسکا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تب میری فٹنس خراب تھی اور بالنگ کی تکنیک بھی ناکارہ، اسی باعث نتائج اچھے نہ نکلے۔ تبھی مجھے احساس ہوا کہ اپنا کھیل بہتر بنانے پر توجہ دینی چاہیے۔"

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہیڈلی کا کھیل سنوارنے میں **لیجنڈری** آسٹریلوی بالر، ڈینس للی نے اہم کردار ادا کیا۔ جب بھی کیوی ٹیم آسٹریلیا جاتی، یا آسٹریلوی نیوزی لینڈ آتے' تو ہیڈلی اپنے سینئر بالر سے کچھ یوں سوال کرتے: "آپ کیونکر تربیت حاصل کرتے ہیں؟ آپ کی بہترین بالنگ کا راز کیا ہے؟ آپ کیا کھاتے ہیں؟"

یوں سینئر بالروں کی باتوں اور ان کے انداز زندگی و کھیل کو دیکھ کر ہیڈلی نے بہت کچھ سیکھا۔ انھوں نے پھر محنت کی اور خود کو عمدہ آل راؤنڈر کی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

حیثیت سے منوایا۔ ہیڈلی کو خوشی ہے کہ آج کئی قسم کے ماہرین کھلاڑیوں کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ یوں ان کی مدد سے کھلاڑی بہت جلد اپنی خامیوں پر قابو پاتے اور ورلڈ کلاس کرکٹر بن جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ''اگر چالیس سال پہلے مجھے بھی اکیڈمیوں، بیٹنگ، باؤلنگ اور فیلڈنگ کوچوں، فزیوتھراپسٹ، تربیت کاروں، ماہرین غذائیت، نفسیات دانوں، کمپیوٹر ماہرین وغیرہ کی خدمات حاصل ہوتیں، تو یقیناً میں زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتا۔

ڈپریشن کا حملہ

رچرڈ ہیڈلی کو دوران کیریئر جسمانی تکالیف ہی نہیں ڈپریشن سے بھی نمٹنا پڑا۔ دراصل جب 1980ء کے بعد ان کا کھیل بہتر ہوا اور وہ مخالف ٹیموں کو ڈھیر کرنے لگے، تو نیوزی لینڈ میں ہیرو بن گئے۔ اب وہ جہاں جاتے، ان کی خوب آؤ بھگت ہوتی اور مرد و زن انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے۔

رفتہ رفتہ لوگ انھیں مختلف تقریبات میں بلانے لگے۔ حتیٰ کہ ہیڈلی نے ایک ہفتے میں بارہ تیرہ تقریبیں بھگتائیں۔ ظاہر ہے، ہر تقریب میں انھیں تقریر کرنا پڑتی۔ اس ذہنی و جسمانی مشقت نے آخرکار ہیڈلی پر بد اثرات مرتب کیے اور وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہوگئے۔ یہ 1983ء کی بات ہے۔

ڈپریشن زدہ ہونے کے بعد ہیڈلی نے نہ صرف دنیائے کرکٹ کو خیر باد کہا بلکہ عوام الناس سے بھی کٹ گئے۔ اسی باعث یہ سمجھا جانے لگا کہ رچرڈ ہیڈلی کا کیریئر ختم ہوگیا۔ مگر اپنے اہل خانہ اور دوست احباب کی مدد سے ہیڈلی ڈپریشن کو مار بھگانے میں کامیاب رہے۔

انھوں نے پھر مزید سات برس کرکٹ کھیلی اور نامور کھلاڑی بن کر اُبھرے۔ ہیڈلی دنیائے کرکٹ کے واحد کھلاڑی ہیں جنھیں ریٹائرمنٹ سے قبل ہی ''سر'' کا خطاب دیا گیا۔

بھارتی کپتان، بشن سنگھ بیدی نے ''گلاب کے چار سو پھول'' منگوا کر اس دن کو یادگار بنا دیا۔

بشن سنگھ بیدی

شام کو جب کیوی ٹیم اپنے ہوٹل جانے لگی، تو ہیڈلی نے بیدی صاحب سے دریافت کیا کہ پھول کہاں ہیں؟ معلوم ہوا کہ 396 پھول بھارتی کھلاڑیوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ یوں صرف 4 پھول ہی ہیڈلی کے حصے میں آئے۔

○○○

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

یقین کیجیے سب لوگ اتنے خوش قسمت نہیں ہوتے

اُمِ ہاشم

کئی برس پہلے کی بات ہے۔ ہمارے چچا جان ایک ایسے تھانے کے انچارج تھے جو ایک پہاڑی راستے پر بنا ہوا تھا۔ وہ مقام بہت خوشنما تھا۔ چچا ہم بچوں کو سیر کی غرض سے چند دنوں کے لیے وہاں لے گئے۔ رات کو ایک بڑے سے کمرے میں ہمارے سونے کا انتظام کیا گیا۔ کھڑکیوں کی درزوں سے جاڑے کی ٹھنڈی ہوا اندر آتی تھی۔ چچا نے اخبار کے کاغذ اُن میں ٹھونس کر تازہ ہوا کا راستہ بند کردیا۔

کمرے میں کوئلوں کی انگیٹھی سُلگائی گئی اور دن بھر کے تھکے ماندے ہم لوگ جلد ہی سو گئے۔ کچھ زندگی ابھی باقی تھی کہ آدھی رات کو میرے ایک چچازاد کو اُلٹیاں آنے لگیں۔ اس وجہ سے ہم سب کی آنکھ کُھل گئی۔ سبھی لوگ گیس کے نشے میں لڑکھڑا رہے تھے۔ کسی نے جلدی سے دروازے اور کھڑکیاں کھولیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تازہ ہوا اندر آئی اور ہم ایک بڑے حادثے سے بچ گئے۔

''اس واقعہ کے کئی سال بعد ہم لوگ ایک کالج کے ہاسٹل میں تھے۔ سردی کا موسم تھا اور چھٹی کا دن۔ ہم لحافوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ ہماری ایک ہم جماعت ساتھ والے غسل خانے میں کوئلوں سے گرم کیے ہوئے حمام کے پانی سے نہا رہی تھی۔ اتنے میں دھڑام سے گرنے کی آواز آئی۔ آوازیں دیں، تو جواب نہ ملا۔ دروازہ دھکیلا تو کھل گیا (خوش قسمتی سے وہ اندر سے کُنڈہ لگانا بھول گئی تھی۔ بیہوش لڑکی کو چارپائی پر ڈالا اور چارپائی اُٹھا کر ہسپتال چل پڑے۔ ہسپتال بالکل قریب تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں چارپائی کے جلوس کے آگے آگے بھاگ رہی تھی کہ پہلے پہنچ کر آکسیجن وغیرہ کا انتظام کروں۔ ہماری وہ دوست خدا کے فضل سے اب بھی بقیدِ حیات ہیں۔

پھر ایک اور واقعہ ہوا۔ ہماری ایک نو عمر عزیزہ ہمارے ہاں مہمان کے طور پر آئی ہوئی تھی۔ دوپہر کے وقت ایک چھوٹے سے کمرے میں جلتی انگیٹھی رکھ کر سوگئی۔ کچھ دیر بعد کسی نے جا کر دیکھا، تو کمرے میں گیس بھری تھی اور وہ بیہوش پڑی تھی۔ اُسے چارپائی سمیت اُٹھا کر باہر صحن میں ڈالا گیا۔ اُس کی خوش نصیبی تھی کہ تھوڑی دیر بعد اُسے ہوش آگیا۔ یقین کیجیے سب لوگ اتنے خوش قسمت نہیں ہوتے۔

قدرتی گیس میں ایک خاص قسم کی بُو شامل ہوتی ہے جس کی وجہ سے فضا میں اس گیس کی موجودگی کا احساس ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ میری طرح اس بُو کو جلدی محسوس کر لیتے ہیں۔ جبکہ دوسروں کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں کہ وہ بے پروا ہوتے ہیں یا اُن کی قوتِ شامہ کا قصور ہے۔

میرے والد میرے ساتھ ایک ماہ گزارنے اسکاٹ لینڈ آئے ہوئے تھے۔ ہم ایک پاکستانی کے گھر کا کمرا پے انگ گیسٹ کے طور پر لیے ہوئے تھے۔

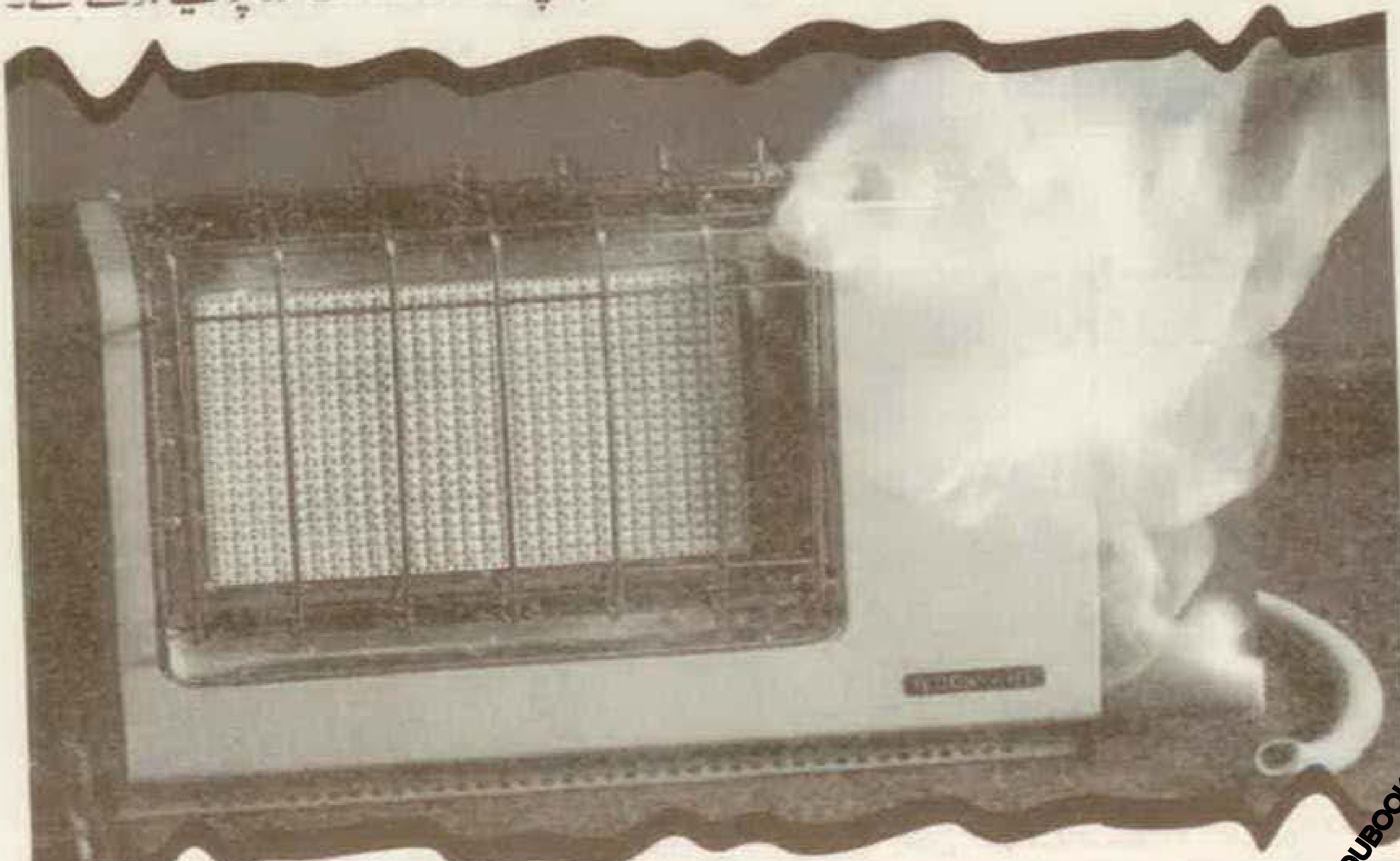

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ایک روز مجھے ہیٹر سے گیس کی بُو آئی۔ خاتونِ خانہ سے ذکر کیا اُن کو بُو کا احساس نہیں ہوسکا مگر انھوں نے کہا کہ کل ہینڈی مین کو بُلا کر دکھا دیں گے۔ وہاں سردیوں کی شدت کے باعث دروازوں میں کوئی درز نہیں تھی اور دروازے رات کو بند رکھے جاتے تھے۔ مجھے مارے فکر کے نیند نہیں آ رہی تھی۔ چناں چہ دروازہ تھوڑا سا کھول کر اس میں کُرسی کا ایک حصہ پھنسا دیا۔ اور آرام سے سو گئی۔ صبح جب ہینڈی مین آیا، تو اُس نے گیس لیک کی تصدیق کر دی اور بتایا کہ آپ نے دروازہ کھلا نہ رکھا ہوتا تو یہ جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی۔

اور یہ ذکر امریکا کا ہے جہاں میرے بیٹے کا پہلا گھر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ باہر کا دروازہ باورچی خانے میں کھلتا تھا۔ کچھ دنوں سے مجھے لگتا تھا کہ کہیں پر گیس لیک ہے۔ گھر کے دوسرے افراد اس معاملے میں نسبتاً حساس نہیں تھے۔ مگر میں پیچھے پڑی رہی کہ مجھے چھوٹے بچوں کی بڑی فکر تھی۔ گیس کا ماہر بُلایا گیا۔ اُسے کچھ پتا نہ چل سکا۔ بُو بدستور رہی۔ دوبارہ آ کر اُس نے پورا چولھا اُکھاڑ دیا۔ پھر بھی وجہ معلوم نہ ہوسکی۔ میں پیچھے لگی رہی آخر ایک روز معلوم ہوگیا کہ بیرونی دروازے کے ساتھ والی دیوار پر گیس پائپ سے خاصی تیزی سے گیس نکل رہی تھی اور جب دروازہ کھلتا تھا، تو ہوا کے ساتھ گھر کے اندر چلی آتی تھی۔ میرے میاں نے میرے اصرار پر پائپ کے جوڑوں پر صابن شیمپو ملا پانی ڈالا، تو ایک مقام پر بُلبلے اُٹھنے لگے۔ گیس کا ماہر بھی موجود تھا۔ وہ حیرت زدہ ہوگیا اُسے گیس لیک معلوم کرنے کا یہ محفوظ طریقہ معلوم نہ تھا۔

اسلام آباد کے ایک فلیٹ میں رہنے والی میری ایک دوست کو عرصے سے سردرد کی شکایت تھی۔ میں سیدھا اُس کے باورچی خانہ میں گئی اور سردرد کی وجہ ڈھونڈ نکالی اور گیس لیک کی جگہ معلوم کر لی۔ خوش قسمتی سے وہاں باہر کھلنے والی ایک کھڑکی تھی۔ جس سے زیادہ تر گیس باہر نکل جاتی تھی اور اس طرح گھر کے باسیوں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکی۔

ہمارے ایک ڈاکٹر دوست کے گھر کے ایک حصہ میں مہمان خانہ تھا۔ ہم ملنے گئے، تو دیکھا کہ بند گیس ہیٹر سے اس قدر گیس نکل رہی تھی کہ کمرا اُس سے بھرا ہوا تھا۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ اب تک دھماکا کیوں نہیں ہوگیا۔ بہرحال اُن کو خطرے کا احساس دلایا۔

دماغ کے خلیوں کو تباہ کرنے والی گیس

یہ گیس یعنی کاربن مونو آکسائیڈ انسانی خون کی ہیموگلوبن سے مل جاتی ہے اس طرح خون کے خلیے آکسیجن سے محروم ہوجاتے ہیں۔ اگر یہ گیس انسانی جسم کو تھوڑی مقدار میں ملے، تو دماغ کے خلیوں کو تباہ کرتی ہے اور اگر یہ مقدار زیادہ ہو، تو بیہوشی اور موت کا باعث بنتی ہے۔ یاد رکھیے کہ یہی گیس لکڑی اور کوئلہ جلنے سے بھی خارج ہوتی ہے اور اتنی ہی خطرناک ہے۔

اگر کسی بند کمرے میں گیس بھر جائے، تو اُس میں بجلی دیا سلائی یا موم بتی جلانے سے ساری جگہ میں آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور سب کچھ جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ حال ہی میں پشاور کے کمشنر کے ساتھ یہی افسوسناک حادثہ ہوا۔ ہماری ایک جاننے والی اپنے غسل خانے میں نہانے کے ارادے سے داخل ہوئی۔ بجلی کا سوئچ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

آن کیا۔ دھماکا ہوا اور اُس سمیت سب کچھ جل گیا۔ ایسے واقعات بہت عام ہیں۔ لیکن اُن سے سبق نہیں حاصل کیا جاتا۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ خود بھی احتیاط کی جائے اور دوسروں کو بھی اِس خطرے سے آگاہ کیا جائے۔ یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ گیس ایک خطرناک چیز ہے۔

1۔ جب بھی چولھا یا ہیٹر جلانا ہو، تو پہلے دیا سلائی جلائیں اور اُس کے بعد گیس آن کریں۔ (پہلے موم بتی جلا کر اُس سے گیس جلائیں، تو آپ گیس سے کچھ فاصلہ رکھ سکیں گے۔ اگر پہلے گیس آن کی جائے، تو آن کی آن میں وہ آپ کے قریب پھیل جاتی ہے اور دیا سلائی جلانے پر آگ آپ کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔

2۔ ہر چند روز بعد گیس پائپ کے جوڑوں کو گیس لیک کے لیے ٹیسٹ کریں۔ دیا سلائی جلا کر نہیں بلکہ صابن ملے پانی کے ساتھ۔

3۔ ہیٹر جلا کر بستر میں داخل نہ ہوں، ہوسکتا ہے آپ کی آنکھ لگ جائے۔ گیس بند ہو کر دوبارہ آجائے اور آپ گیس کا شکار ہو کر سوتے ہی رہ جائیں۔

4۔ کسی بھی بند کمرے کو جس میں گیس ہیٹر ہو۔ کھولتے وقت ایک دم بتی نہ جلائیں۔ کچھ دیر دروازہ کھلا رکھیں کہ اگر اندر گیس بھری ہو تو آپ کو معلوم ہو جائے۔

5۔ گیس سلنڈر وغیرہ سونے کے کمرے میں نہ رکھیں۔ بستروں کو گرم پانی کی بوتلوں سے گرم کریں اور اُن پر تولیے کی طرح کا موٹا کپڑا لپیٹ لیں تا کہ آپ کو جلا نہ دے۔ جب بھی گیس لیک کا احساس ہو جائے۔ اُس کا فوری تدارک کیے بغیر دوسرا کام نہ کریں۔

6۔ بہتر یہی ہے کہ سونے کے کمرے میں گیس ہیٹر نہ ہو۔

7۔ استعمال کے بعد گیس کا مین سوئچ ضرور بند کریں۔

8۔ سونے سے پہلے گھر بھر میں دیکھیں کہ کہیں گیس آن تو نہیں رہ گئی۔

9۔ اگر کمرے میں گیس بھر گئی ہو، تو دروازے کھول دیں۔ مگر پنکھا یا بتی ہرگز آن نہ کریں۔

10۔ اگر گھر بیٹھے بٹھائے آپ کے سر میں درد ہونے لگے، تو کمرے میں گیس کا لیک پوائنٹ تلاش کریں۔

11۔ بچوں کو گیس کا چولھا یا ہیٹر جلانے کی اجازت نہ دیں۔ اپنے ملنے جُلنے والوں سے بھی اس کا ذکر کریں۔ ہوسکتا ہے اس طرح کچھ قیمتی جانیں ضائع ہونے سے بچ جائیں۔

> اگر آپ گیس لیک معلوم کرنے کے لیے دیا سلائی یا موم بتی استعمال کریں گے، تو اِس کا احتمال ہے کہ آپ کے قریب پھیلی ہوئی گیس آگ پکڑ لے اور خدانخواستہ آپ کو جلا دے۔ اس لیے ضروری ہے کہ شیمپو ملے پانی سے یہ کام لیجیے۔ یہ بے حد محفوظ طریقہ ہے۔ لیکیج والی جگہ سے نکلنے والے بلبلے آپ آسانی سے دیکھ سکیں گے۔

گھریلو استعمال میں لائی جانے والی گیس بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر احتیاط نہ برتی جائے، تو بہت بڑی زحمت میں بھی تبدیل ہوسکتی ہے۔ گیس کی وجہ سے ہونے والے حادثات اکثر دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں۔ ایسے مواقع پر حیرت اور غم کا اِظہار کرنے کے علاوہ کچھ سبق بھی سیکھنا چاہیے۔ عقل مند لوگ وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کے تجربات سے سبق سیکھتے ہیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

چند یادیں چند تاثرات

مسلم اکابر میں سے کوئی بھی ان کا ہم خیال نہ بن سکا

عاشق حسین بٹالوی

پاکستان

دوستوں کے اصرار کے باوجود مارچ 40ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور میں شریک نہ ہوئے

چودھری صاحب لاہور کے ایچی سن کالج میں جونیئر ہاؤس ماسٹر تھے۔ جب پہلی مرتبہ میں نے انھیں دیکھا تھا۔ لمبا قد، بھرا ہوا بدن، بلند آواز، وہ میرے عم زاد بھائی کے پرانے کلاس فیلو اور دوست تھے اور انھیں کے ساتھ گاہے گاہے ہمارے یہاں آتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد انھوں نے آنا بند کر دیا، تو میں نے بھائی صاحب سے پوچھا۔ معلوم ہوا چودھری صاحب ضلع ڈیرہ غازی خاں میں نواب مزاری کے پرائیویٹ سیکرٹری ہوگئے ہیں۔ نواب صاحب کے دیوانی اور فوجداری مقدمات چلتے رہتے تھے اور چودھری صاحب کا بیشتر وقت ان مقدمات کی پیروی میں صرف ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ہائی کورٹ میں اپیل دائر کرنا تھی۔ ملک برکت علی مرحوم کو انھوں نے وکیل کیا تھا۔ لیکن فیس کے پورے پیسے پاس نہ تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر یار محمد خان مرحوم نے ان کی کچھ مدد کی۔ یہیں سے چودھری صاحب اور ڈاکٹر صاحب کی دوستی شروع ہوئی۔

1931ء میں انھیں یکا یک خیال ہوا کہ انگلستان جا کر بیرسٹر بننا چاہیے۔ جولائی یا اگست کا مہینا تھا۔ ڈاکٹر یار محمد خاں مرحوم نے ان کے اعزاز میں لاہور کے مشہور ریستوران لورنیگ میں ایک الوداعی پارٹی دی اور دعوتی کارڈ چھپوا کر احباب کو بھیجے، مجھے بھی دعوت نامہ موصول ہوا۔ لورنیگ مہمانوں سے بھرا ہوا تھا چودھری صاحب نے تقریر کی کہ میں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے لندن جا رہا ہوں اور واپس آ کر پبلک لائف میں حصہ لوں گا۔ میرے لیے دُعا کیجیے۔ تمام مہمانوں نے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی۔

اس کے بعد چودھری صاحب کا ذکر کبھی سننے میں نہیں آیا۔ پھر اچانک میرے والد مرحوم کو انگلستان سے انگریزی کا ایک پمفلٹ موصول ہوا۔ جس پر ہندوستان کا نقشہ بنا ہوا تھا اور شمالی مغربی علاقے پر سبز رنگ پھیر کر لفظ پاکستان لکھا تھا۔ ایک نئی چیز سمجھ کر ہم نے بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پمفلٹ چودھری رحمت علی نے بھیجا ہے۔ جنھوں نے کیمبرج سے ایک تحریک چلائی ہے کہ صوبہ پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان اور کشمیر کو ملا کر ایک نئی مملکت قائم کی جائے۔ نقشے کے ساتھ لفظ پاکستان کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی تھی اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے علیحدہ قوم قرار دے کر ان کے لیے علیحدہ ایک قومی وطن کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

اسی قسم کی تجویز علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس الٰہ آباد کی صدارت کرتے ہوئے دسمبر 1930ء میں پیش کی تھی۔ چودھری صاحب نے اس تجویز کو تفصیل سے بیان کیا تھا۔ حرف پ سے مراد پنجاب' الف سے مراد افغان (صوبہ سرحد)' ک سے مراد کشمیر، س سے مراد سندھ اور تان سے مراد بلوچستان ہے۔

کچھ عرصے بعد چودھری صاحب نے اس سکیم کو مزید وسعت دی۔ بنگال اور آسام کو متحد کر کے بانگِ اسلام کا نام دیا۔ اور دعویٰ کیا کہ یہ بھی مسلمانوں کا قومی وطن ہوگا۔ پھر کچھ مُدت بعد انھوں نے برعظیم ہند کے ان مسلمانوں کے لیے بھی جداگانہ قومی مملکتوں کا دعویٰ کیا۔ جو اپنے اپنے علاقوں میں اقلیت کی حیثیت سے آباد تھے۔ مثلاً حیدر آباد دکن کو ایک الگ مملکت قرار دے کر عثمانستان نام رکھا۔ سی پی بندھیل کھنڈ، مالوہ، بہار، اڑیسہ، راجستھان، بمبئی مدراس مغربی اور مشرقی لنکا کی مسلمان اقلیتوں کے لیے جداگانہ مملکتوں کا مطالبہ کیا۔ اور ان کے بالترتیب یہ نام تجویز کیے۔ صدیقستان، فاروقستان، معینستان، ماپلستان، صافستان، نصارستان۔ چودھری صاحب کی یہ اسکیم قابلِ عمل تھی یا نہیں اس سے بحث نہیں لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ وہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو خواہ اقلیتی صوبوں میں آباد تھے یا اکثریتی صوبوں میں غیر مُسلموں کی بالادستی سے آزادی دلوانا چاہتے تھے۔

کیمبرج میں حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ انھوں نے برابر یہ مہم جاری رکھی۔ خواجہ عبدالرحیم، پیر احسن الدین، محمد اسلم خٹک، شیخ محمد صادق وغیرہ چند نوجوان جو بغرضِ تعلیم انگلستان میں مقیم تھے۔ اس کام میں چودھری صاحب کے شریک و سہیم تھے۔ گول میز کانفرنس اور جائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے جو مسلمان نمائندے، ہندوستان سے لندن جاتے تھے۔ چودھری صاحب اُن کے سامنے اپنی سکیم پیش کرتے تھے۔ لیکن وقت اور موقع محل ایسا تھا کہ مسلمان اکابر میں سے کوئی شخص چودھری صاحب کا ہم خیال نہ بن سکا۔ اُس وقت ہندوستان کے لیے فیڈریشن کے قیام کی کوششیں ہو رہی تھیں۔

چودھری صاحب کی زندگی جملہ تکلفات اور عیش و تنعم کے سامانوں سے بے نیاز تھی۔ دو کمروں میں وہ رہتے تھے۔ ایک کمرا لکھنے پڑھنے اور دفتر کے کام آتا تھا۔ دوسرا خواب گاہ تھا۔ مارچ 1940ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا، تو چودھری صاحب کراچی میں سر عبداللہ ہارون کے ہاں مقیم تھے۔ بعض لوگوں نے کوشش کی کہ وہ بھی لاہور تشریف لا کر اجلاس میں شرکت فرمائیں لیکن وہ نہ مانے۔ قرار دادِ پاکستان کی منظوری کے بعد انھیں چاہیے تھا کہ ہندوستان آ کر تحریک میں شامل ہوتے۔ لیکن وہ بدستور

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کیمبرج میں پڑے رہے۔

انگلستان میں بھی ان کا ربط وضبط بہت کم لوگوں سے تھا۔ تحریکِ پاکستان کے حامیوں نے جب لندن، مانچسٹر، کارڈف وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں جلسے منعقد کرنا شروع کیے، تو چودھری صاحب ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس اکل کھرا پن کی وجہ غالباً ان کی انا کا ضرورت سے بڑھا ہوا احساس تھا۔

پاکستان بنا تو 1948ء میں لاہور تشریف لائے اور ڈاکٹر یار محمد خان کے مکان پر ٹھہرے۔ میں ملنے گیا تو فوراً پہچان لیا۔ حالانکہ سترہ اٹھارہ برس کے بعد ملاقات ہوئی تھی، پہلے داڑھی منڈاتے تھے۔ اب چہرے پر خوب صورت گھنی داڑھی بھی تھی۔ میرے والد مرحوم کے انتقال کو سات برس گزر چکے تھے۔ چودھری صاحب نے پہلے ان کا ذکر کیا اور ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ پڑھی، میں نے عرض کیا۔ اب یہیں رہ جائیے اور قوم کی راہنمائی کیجیے۔

کہنے لگے انگریز کے زمانے میں جب میں ولایت سے دو ایک بار ہندوستان آیا تھا، تو پولیس میری نگرانی نہیں کرتی تھی۔ اب یہ حالت ہے کہ تمھاری حکومت نے سی آئی ڈی کے دو آدمی میرے پیچھے لگا رکھے ہیں۔ جو ہر لحظہ میری آمد و رفت پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر یار محمد خاں مرحوم کے مکان سے باہر سفید کپڑوں میں سی آئی ڈی کے آدمی بیٹھے تھے۔ نہیں معلوم یہ اقدام پنجاب کی حکومت نے کیا تھا یا پاکستان کے وزیر اعظم کے ایما پر ہوا تھا۔ چودھری صاحب سخت مغموم و افسردہ تھے۔ ان کے احباب کو بھی

نمکین غزل

نوید صدیقی، راولپنڈی

فردِ عمل کو میری شریفانہ کر دیا
جب پیش میں نے ''پلس' کو نذرانہ کر دیا
بیوی کا جیب خرچ بڑھانے کے واسطے
کم اُس نے والدین کا ماہانہ کردیا
ڈاڑھی میں آ گئے ہیں ابھی سے سفید بال
نزلے نے میرا حال بزرگانہ کر دیا
اسکول میں پڑھاتا ہے ڈنڈے کے زور پر
ٹیچر نے ''علم خانے'' کو اِک ''تھانہ'' کر دیا
رویا کچھ ایسے ایک بڑی شاعرہ کا طفل
ماحول بزمِ شعر کا بچگانہ کر دیا
پہلے بھی جان لیوا تھے زوجہ کے خال و خط
میک اَپ نے اُن کو اور بھیانہ کردیا
منہ کھولتے ہوئے ترے ابا کے سامنے
''ہم نے حقیقتوں کو بھی افسانہ کر دیا''
ہے گھن گرج تو خوب پر آتا نہیں سمجھ
انداز ''بھائی جی'' نے خطیبانہ کر دیا
کاری گری دکھائی ہے معمار نے عجب
نقشہ مکاں کا خانہ بدوشانہ کر دیا
کھل جائے نہ کہیں مرے غم کا کسی پہ حال
یہ سوچ کر سخن کو ظریفانہ کر دیا
ہم نے کہا نوید ''محبت سے دیکھیے''
جاناں نے سر ہلا دیا ''نہ، نہ، نہ'' کر دیا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

حکومت کی اس حرکت پر افسوس تھا۔

میں نے عرض کیا۔ آپ حکومت کی پروانہ کیجیے۔ وہ تو انہی ہتھکنڈوں سے قائم ہے۔ آپ کا اصلی گھر تو لوگوں کے دلوں میں ہے۔ میرے بار بار سمجھانے کے بعد وہ کسی قدر قائل تو ضرور ہوئے لیکن پھر کہنے لگے۔ میری لائبریری کیمبرج میں پڑی ہے۔ اسے یہاں لانے کے لیے ایک بار تو مجھے انگلستان ضرور جانا پڑے گا۔

بات یہ ہے کہ تقسیمِ پنجاب کا چودھری صاحب کو سخت صدمہ تھا۔ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر جو قیامتِ صغریٰ ٹوٹی اُس کی تمام تر ذمہ داری چودھری صاحب کے نزدیک مسلم لیگ کی لیڈر شپ پر تھی۔ انھوں نے انگلستان ہی سے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا۔ جس میں پنجاب کی تقسیم کی انتہائی مذمت کر کے یہ کٹا پھٹا پاکستان قبول کرنے پر مسلم لیگی لیڈر شپ کو سخت الفاظ میں مطعون کیا تھا۔ حکومتِ پاکستان کے ان سے برہم ہونے کا سبب غالباً یہی پمفلٹ تھا۔

واپس انگلستان جا کر وہ مشکل سے سال بھر زندہ رہے اور 21 فروری 1950ء کو انتہائی دل شکستگی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جن لوگوں نے ان کو اس زمانے میں دیکھا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ وہ خلوت نشین ہو گئے تھے، ملنا جلنا بند کر دیا تھا تاہم انھیں یقین تھا کہ مسلمان جیسی زندہ اور فعال قوم خاموش نہیں بیٹھے گی۔

1957ء میں اکرام اللہ صاحب یہاں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے۔ 14 اگست کی تاریخ قریب آئی، تو انھوں نے ایک روز مجھے یاد فرمایا۔ کہنے لگے ارادہ ہے 14 اگست کو کیمبرج چلیں اور چودھری رحمت علی کی قبر پر پھولوں کے ہار چڑھائیں۔ میں نے عرض کیا ضرور چلیے میں حاضر ہوں۔ فرمایا۔ آپ نے تو ان کی قبر دیکھی ہوگی۔ عرض کیا۔ ایک دفعہ عمانویل کالج کے ماسٹر ویڈر برن صاحب کی راہنمائی میں ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا تھا۔ تلاش کر لیں گے۔

14 اگست کو مسٹر اکرام اللہ، مسٹر اے ڈی اظہر اور راقم التحریر موٹر میں کیمبرج گئے۔ اور ویڈر برن صاحب کی راہنمائی میں چودھری صاحب کی قبر تلاش کی۔ اکرام اللہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ پھولوں کے ہار کے ساتھ کوئی موزوں شعر بھی لکھ دیجیے۔ جلدی میں غالب کے دو شعر یاد آئے جو میں نے کاغذ کے پرزے پر لکھ دیے۔ ایک تو یہ تھا:

زمن بجرمِ تپیدن کنارہ می کر دی
بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

دوسرا یہ تھا:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی،

اکرام اللہ صاحب، اظہر صاحب اور خاکسار قبر کے پاس خاموش کھڑے تھے۔ فاتحہ پڑھ چکے تو ماسٹر ویڈر برن صاحب دیر تک چودھری صاحب کی زندگی کے آخری ایام کی باتیں سناتے رہے کہ کس قدر افسردہ، غمگین اور پریشان رہتے تھے۔ کہنے لگے وفات کے وقت ایک پیسا ان کے پاس نہیں تھا۔ ان کے کفن دفن اور قبر پر سو پونڈ خرچ ہوئے جو عمانویل کالج نے ادا کیے تھے۔ (لندن 1973ء) (بشکریہ جناب نصیر سلیمی، کراچی)

○○○

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اگلے ماہ سیما کی سہیلی کا بیاہ تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بہ موقع شادی اسمارٹ اور خوبصورت نظر آئے۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ پچھلے ایک برس میں غذائی بے احتیاطی کے باعث وہ خاصی موٹی ہو گئی تھی۔ سو وہ دنیائے انٹرنیٹ پہنچی اور ایسا ڈائٹ پلان تلاش کرنے لگی جو اُسے چند ہفتوں میں دبلا پتلا بنا دے۔

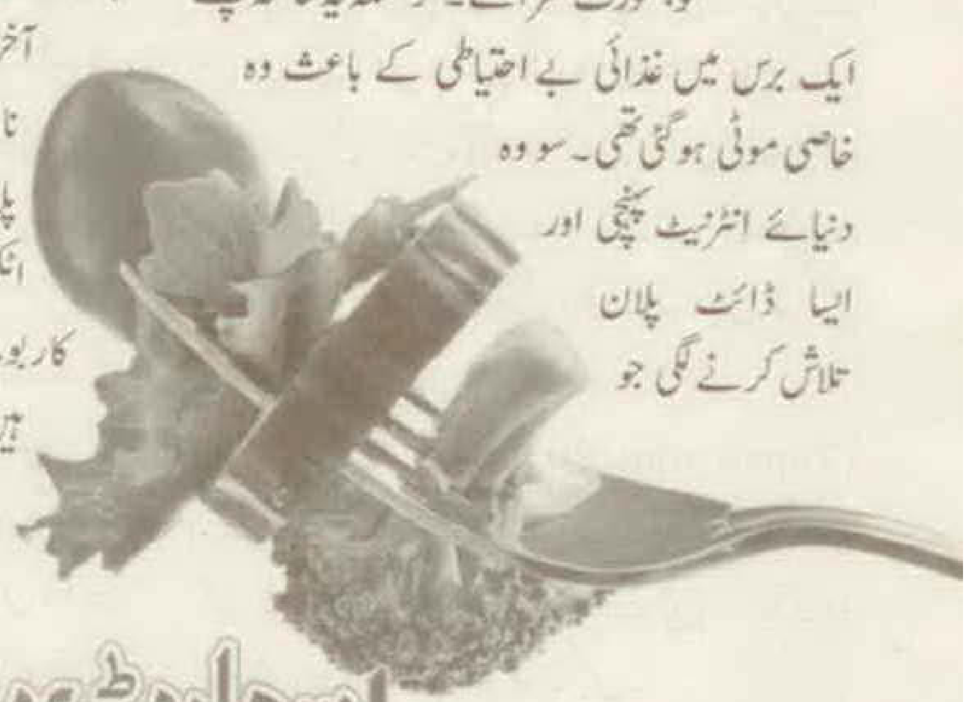

آخر سیما نے اٹکنز (Atkins) نامی غذائی منصوبہ اپنانے کا سوچا۔ یہ ڈائٹ پلان 1972ء میں امریکی ماہر غذائیات، جان اٹکنز نے متعارف کرایا تھا۔ اسی منصوبے میں کم کاربوہائیڈریٹ رکھنے والی غذائیں کھائی جاتی ہیں۔ سو سیما نے روٹی سالن کھانا چھوڑا اور صرف پھل و سبزیوں سے پیٹ بھرنے لگی۔

لیکن ہزاروں لاکھوں لڑکیوں کے مانند سیما

اسمارٹ بننے کے طریقے

صحت کی 19 ایسی سچی باتیں جو اصل میں جھوٹ ہیں

ڈاکٹر سفیر علی

کھانے میں ناغہ نہ کریں یہ بے حد مہنگا ثابت ہو سکتا ہے!

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

نہیں جانتی تھی کہ ایکٹو ڈائٹ پلان ہر کسی کو فائدہ نہیں پہنچاتا، بلکہ اُسے بے سوچے سمجھے اپنایا جائے، تو الٹا مضر صحت بنا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے سیما کے ساتھ یہی ہوا۔ کاربوہائیڈریٹ کے بغیر غذا کھانے سے وہ ٹینشن اور ڈپریشن کا شکار ہوگئی۔ سو وہ اسمارٹ کیا ہوتی، بیمار ہوکر ہسپتال پہنچ گئی۔

ڈائٹ پلانوں کی بھرمار

فربہ مرد و زن جب بھی دبلا پتلا ہونے کی خواہش کریں، تو سب سے پہلے انھیں یہی خیال آتا ہے کہ کوئی عمدہ غذائی منصوبہ اختیار کیا جائے۔ گویا یہ کوئی طلسماتی چھڑی ہوئی جو انھیں راتوں رات اسمارٹ بنا دے گی۔ حالانکہ بیشتر ڈاکٹروں کا اتفاق ہے: ''90فیصد کیسوں میں یہ ڈائٹ پلان ناکام ثابت ہوتے ہیں یا پھر فرد کو عارضی کامیابی ہی ملتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ طرز زندگی کو بدلے بغیر کوئی انسان دبلا پتلا اور چست نہیں ہوسکتا۔''

دنیا بھر میں مرد و زن ڈائٹ پلانوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے، ہر سال کوئی نہ کوئی نیا غذائی منصوبہ سامنے آتا ہے۔ مثلاً آج کل پاکستان میں ''میڈی ٹرینین (Mediterranean)'' ڈائٹ کا خاصا رواج ہے۔ اس پر عمل کرنے والے مخصوص پھل و سبزیاں کھا کر پیٹ بھرتے ہیں۔

درج بالا ڈائٹ پلان کے حمایتی کہتے ہیں کہ میڈی ٹرینین (بحیرہ روم کے) ممالک کو دیکھیے۔ وہاں لوگ زیادہ تر پھل سبزیاں کھاتے اور سدا چاق چوبند رہتے ہیں۔ مگر دیگر غذائی منصوبوں کی طرح اسے بھی تنقید کا سامنا ہے۔

چونکہ فربہ مرد و زن اسمارٹ ہونے کی خاطر ہر حربہ آزماتے ہیں، لہٰذا پچھلے ایک عشرے میں عجیب و غریب موٹاپا توڑ پلان سامنے آچکے ہیں۔ مثال کے طور پر کے۔ ای ڈائٹ (K.E.Dite)۔ اس منصوبے میں انسان کئی روز تک کچھ نہیں کھاتا۔ بس ناک میں لگی ایک نالی کے ذریعے اس کے معدے تک براہ راست غذا پہنچائی جاتی ہے۔ یوں غذا شکم میں داخل نہیں ہو پاتی۔

اسی طرح ''ٹیپ ورم ڈائٹ''(Tapeworm diet) بھی انوکھی ہے۔ اسے اپنانے والے مرد و زن کھانے کے بعد کیچوے ہڑپ کرتے ہیں..... تاکہ وہ پیٹ میں موجود ساری غذا کھا جائیں۔

غذائی منصوبہ استعمال میں آسان ہو یا مشکل، انھیں تشکیل دینے والے دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کو برتنے سے کم از کم 8 کلو وزن ضرور کم ہوتا ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ ان منصوبوں کے علاوہ ''ڈائٹ فوڈ'' دبلا کرنے والی غذاؤں) کی بہت بڑی مارکیٹ وجود میں آچکی۔

ڈائٹ غذائیں بنانے والوں کا دعویٰ ہے کہ انھیں کھانے یا پینے سے چربی گھلتی اور وزن کم ہوتا ہے۔ یہ دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا، یہ تو انھیں استعمال کرنے والے بہتر جانتے ہیں۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ وزن کم کرنے کا عالمی کاروبار پھل پھول رہا ہے۔ 2012ء میں اس کاروبار کی مالیت ''265ارب ڈالر'' تھی اور خیال ہے کہ 2017ء تک ''361ارب ڈالر'' تک پہنچ جائے گی۔ یہ یقیناً خطیر رقم ہے۔

وزن گھٹانے کا بزنس کئی وجوہ سے نشو و نما پا رہا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ہے۔ سرفہرست یہ وجہ ہے کہ بہر حال لاکھوں لوگوں کو دور جدید کی بیماریاں...... ذیابیطس، امراض قلب اور ہیپا ٹائٹس وغیرہ دبوچ لیتی ہیں۔ پھر ذاتی آمدن میں اضافہ اور صحت سے متعلق بڑھتی آگاہی بھی اہم وجوہ ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ مرد وزن کی اکثریت یہ جانے بغیر اپنا وزن گھٹانے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگتی ہے کہ وہ موٹاپے کا نشانہ کیوں بنے؟ حقیقت یہ ہے کہ جیسے ہر انسان مختلف ہے، اسی طرح وہ متفرق وجوہ کی بنا پر فربہ ہوتا ہے۔ گو مضر صحت معیار زندگی، ورزش کی کمی اور ضرورت سے زیادہ کھانا فربہی پیدا کرنے کی اہم وجوہ ہیں، لیکن دیگر عناصر بھی اُسے پیدا کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر کئی مرد نیند کی کمی سے فربہ ہو جاتے ہیں۔ جبکہ بہت سی خواتین میں پریشانی موٹاپے کا منبع ہوتی ہے۔ جدید طبی سائنس دریافت کر چکی کہ جب ہمارا بدن نیند سے محروم یا پریشانی کا شکار ہو، تو وہ چربی جمع کرنے لگتا ہے۔ یوں ہمارا جسم نیند یا پریشانی سے پیدا ہونے والے مسائل کا مقابلہ کرنے کی خاطر تیاری کرتا ہے۔ سو انسان جسمانی طلب پوری کرنے کے لیے مزید کھاتا اور یوں موٹا ہوتا چلا جاتا ہے۔

چالیس پچاس سال کی عمر میں جب خواتین سن یاس کا نشانہ بنیں، تو ہارمونی تبدیلیاں ان کا وزن بڑھا دیتی ہیں۔ دراصل اس دوران ان میں اسٹروجن ہارمون کی پیدائش بہت کم ہو جاتی ہے جو شکم پر چربی جمع نہیں ہونے دیتا۔ مزید برآں بعض بیماریوں سے اور کچھ ادویہ استعمال کرنے سے بھی وزن گھٹ جاتا ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ وزن گھٹانے کا عمل بھی خاصا پیچیدہ ہے۔ بعض ڈائٹ پلان ایک کو فائدہ دیتے تو دوسرے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بعض مرد و زن کا وزن ہمیشہ کے لیے کم ہو جاتا ہے۔

دیگر جیسے ہی منصوبہ ختم کریں، پھر فربہ ہونے لگتے ہیں۔ اسی باعث کئی ڈاکٹر اور ماہرین غذائیات ان ڈائٹ پلانوں کو بے فائدہ سمجھتے ہیں۔ ایک پاکستانی ماہر غذائیات، سلیم رضا کا کہنا ہے: "ہمارے روایتی کھانے بہترین ڈائٹ منصوبہ ہیں۔ کیونکہ وہ نہ صرف ہلکے ہوتے ہیں بلکہ ان میں غذائیت بھی موجود ہوتی ہے۔

سلیم رضا مزید کہتے ہیں:

"چاق چوبند رہنے کا راز یہ ہے کہ اعتدال سے کھانا کھایا جائے۔ ہر غذا اعتدال میں کھائیے، لقمہ آہستہ آہستہ چبائیے اور باقاعدگی سے ورزش کیجیے۔ زیادہ تر مرد و زن اسی لیے فربہ ہوتے ہیں کہ وہ ردی غذا کھاتے ہیں اور ورزش بالکل نہیں کرتے۔"

پچھلے چند عشروں میں وزن گھٹانے سے متعلق دیومالائی باتیں بھی وجود میں آچکی ہیں۔ آپ کے لیے ان کا جاننا ضروری ہے تاکہ خود کو تندرست رکھ سکیں۔ ذیل میں ایسی نو باتوں کو بیان کیا جا رہا ہے جو بظاہر سچی لیکن حقیقت میں لغو ہیں۔

(1) پروٹین سے بھرپور اور کم کاربوہائیڈریٹ والی غذائیں کھانے سے وزن گھٹتا ہے

مغربی ممالک میں "اٹکنز پلان" کو بہت کامیابی ملی کیونکہ وہاں ڈبل روٹی، پاستا، پیزا، کیک، برگر وغیرہ پر مشتمل غذا کاربوہائیڈریٹ اور پروٹین کے مابین توازن نہیں رکھتی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جبکہ سبزی، دال اور چاول پر مبنی غذائیں پروٹین، کاربوہائیڈریٹ اور ریشے کا بہترین توازن رکھتی ہیں۔

رجوتا ڈائیوکر بھارت کی مشہور ماہر غذائیات ہے۔ چند برس قبل اس کی کتاب ''اپنا ذہن مت کھوئیے'' (Don't lose your mind) شائع ہوئی جس نے بہت شہرت پائی۔ اس میں رجوتا نے لکھا کہ انسان جب کم کاربوہائیڈریٹ والی غذائیں کھائے (اٹکنز ڈائٹ پر چلتے ہوئے)، تو اس کی روزمرہ زندگی اور سوچنے کی طاقت متاثر ہوتی ہے۔

دراصل جدید طبی تحقیق سے دریافت ہوا ہے کہ اگر کم کاربوہائیڈریٹ والی غذا کھائی جائے، تو ہمارے بدن میں ''سیروٹونین'' (Serotonin) کی افزائش رک جاتی ہے۔ دماغ میں جنم لینے والا یہ نیوروٹرانسمیٹر ہی ہم میں خوشی، اطمینان اور سکون کے نہایت قیمتی محسوسات پیدا کرتا ہے۔

امریکا میں مستعمل ''ساؤتھ بیچ ڈائٹ'' بھی کم کاربوہائیڈریٹ غذاؤں والا غذائی پلان ہے۔ یہ پلان خصوصاً خواتین کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ جو خاتون شدومد سے اسی منصوبے پر عمل کرے، وہ بے چینی، ڈپریشن اور گھبراہٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ کم کاربوہائیڈریٹ والی غذائیں کھانے سے جسم میں نسوانی ہارمونوں کا توازن بگڑ جاتا ہے۔

سو اگر آپ فربہ ہیں، تو کاربوہائیڈریٹ والی غذائیں اعتدال میں کھانا جاری رکھیے۔ البتہ یہ کوشش کیجیے کہ کم سے کم کاربوہائیڈریٹ روی غذا سے لیے جائیں۔ ثابت اناج ان کا عمدہ ذریعہ ہیں۔

(2) آٹھ بجے کے بعد کھانا مت کھائیے

عام خیال یہ ہے کہ سونے سے تین گھنٹے قبل کھانا کھا لیا جائے، تو بہتر ہے۔ یوں جسم کو کھانا ہضم کرنے کی خاطر مناسب وقت مل جاتا ہے۔ لیکن جو مرد و زن رات گئے تک یا نائٹ شفٹ میں کام کرتے ہیں، انھیں کیا نظام الاوقات اپنانا چاہیے؟

دراصل جب ہم کام کریں اور چلیں پھریں، تو ہمارے جسم کو توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا چھے سات بجے آخری کھانا کھانے کے بعد انسان ساری رات بھوکا نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اگر آپ رات کو کام کرتے ہیں، ہر دو تین گھنٹے بعد کوئی پھل یا ہلکی پھلکی غذا کھا لیں۔ یوں آپ کا پورا جسمانی نظام درست طریقے سے کام کرتا رہے گا۔ مزید برآں صبح کم از کم سات گھنٹے کی نیند لینا مت بھولیے گا۔

(3) ڈائٹنگ کے دوران کیلا، آم، انگور اور چیکو نہ کھائیں!

بیشتر ڈائٹ منصوبوں میں فرد کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ درج بالا پھل ہرگز نہ کھائے۔ مگر یہ پلان بنانے والے بھول جاتے ہیں کہ یہ بھی پھل غذائیت بخش ہیں۔ سو عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ڈائٹنگ کرنے والا ان پھلوں کو اپنی روزمرہ غذا میں اس ترکیب سے شامل کرے کہ حراروں (کیلوریز) کی مقررہ تعداد بڑھنے نہ پائے۔

مثال کے طور صبح آدھا کیلا کھانے سے آپ کو اتنی توانائی ملے گی کہ بخوبی ورزش کر سکیں۔ اسی طرح آم وٹامن اے اور صحت دوست کیمیائی مادوں، فلاونوئیڈز (Flavonoids) مثلاً بیٹا کروٹین، الفا کروٹین اور بیٹا کراپٹوزینتھین کا منبع ہے۔ یہ بھی انسان کی بصارت کو طاقت ور بناتے ہیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

چیکو بھی بڑا غذائیت بخش پھل ہے۔ یہ ہمیں فولاد، پوٹاشیم، تانبا، فولیٹ، نائسین اور پانتوتھینک ایسڈ فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا ڈائٹنگ کرتے ہوئے ان پھلوں کا استعمال مت چھوڑیئے، البتہ کم کر سکتے ہیں۔

(4) وزن کم کرنے کے لیے بادشاہ کی طرح ناشتا کرو اور فقیر کے مانندرات کا کھانا کھاؤ

درج بالا نظریہ فرسودہ ہو چکا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صبح ازحد غذا کھانے سے معدے پہ بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ انسان پھر سارا دن گرانی میں گزارتا اور پریشان رہتا ہے۔ اس باعث ماہرین غذائیات مشورہ دیتے ہیں کہ ناشتا اقساط میں کیجیے۔

مثال کے طور پر سب سے پہلے پھل کھائیے۔ پھر ڈبل روٹی یارس چائے کے ساتھ کھائیے۔ بعدازاں آپ دفتر پہنچ کر یا گھر ہی میں انڈا یا دودھ استعمال کر سکتے ہیں۔ یوں معدے پر بوجھ نہیں پڑتا اور انسان ہلکا پھلکا رہتا ہے۔

اقساط میں ناشتا کرنے یا کھانا کھانے کے پیچھے یہ فلسفہ پوشیدہ ہے کہ انسان سیر نہ ہو۔ لیکن ضروری ہے کہ یہ چھوٹے کھانے بھرپور نہ ہوں...... یعنی ان میں سبزی و پھل زیادہ اور کاربوہائیڈریٹ والا اناج کم ہو۔ ورنہ موٹاپا ختم کرنا محال ہو جاتا ہے۔

(5) سخت ورزش سے زیادہ کھانے کے اثرات ختم کیے جاسکتے ہیں

ماضی میں ماہرین غذائیت وزن گھٹانے والوں کو یہ مشورہ دیتے تھے کہ زیادہ کھانے کی صورت میں سخت ورزش کریں۔ مثلاً آپ نے 350 حراروں والی پیسٹری کھائی، تو آدھ گھنٹا ورزش کرنے سے آپ حاصل ہونے والے حرارے جلا ڈالیں گے۔

مگر جدید تحقیق اس نظریے کو باطل قرار دے چکی ہے کیونکہ زیادہ کھانے کے مضر اثرات سخت ورزش سے دور نہیں کیے جا سکتے۔ الٹا جسم کو شکست و ریخت کا شکار بناتی ہے اور جوڑ متورم کر دیتی ہے۔ گویا طویل عرصہ سخت ورزش کرنا انسانی بدن کو نقصان پہنچاتا ہے۔

دراصل جب ہم ورزش کریں، تو ہمارا جسم اینڈوفینز (Endophins) نامی کیمیائی مادے خارج کرتا ہے۔ یہ کیمیائی مادے ہم میں خوش گواری کا احساس پیدا کرتے ہیں جو انسان باقاعدگی سے ورزش کرنے لگے، اُسے پھر اس احساسِ خوش گواری کی لت پڑ جاتی ہے۔

ڈاکٹر عالیہ کراچی کے ایک کائنی کلینک سے متعلق ماہر نفسیات ہیں۔ پچھلے ماہ ان کے پاس ایک حاملہ لڑکی آئی جو ڈپریشن میں مبتلا تھی۔ اس کی طبی ہسٹری سے انکشاف ہوا کہ لڑکی ورزش کرنے کی شوقین تھی۔ چناں چہ وہ جم میں دیر تک مصروف رہتی۔ پہلے ایک گھنٹا ایروبک ورزش کرتی پھر ڈیڑھ گھنٹے تک وزن اُٹھاتی۔

ڈاکٹر عالیہ کا کہنا ہے: ”لڑکی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ اکثر دن میں دو مرتبہ بھی جم جاتی ہے۔ جب وہ میرے پاس آئی، تو اُسے دو ماہ کا حمل تھا اور ڈاکٹر نی نے اس کو ہدایت کی تھی کہ وہ آرام کرے۔ چونکہ وہ شدید جسمانی ورزش کی عادی تھی لہٰذا یہ سرگرمی اُسے نہ ملی، تو بے چین ہوگئی۔ اینڈوفینز کی عدم موجودگی نے اُسے ہلکے ڈپریشن کا نشانہ بنا دیا۔“

سو سخت ورزش سے بچنے کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ غذا معتدل مقدار میں کھائیے۔ یوں آپ نہ صرف موٹاپے سے بچیں گے بلکہ جان توڑ ورزش بھی نہیں کرنا پڑے گی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

(6) دعوت سے لطف اندوز ہونے کی خاطر ایک وقت کا کھانا نہ کھائیے

وزن بڑھنے سے خوفزدہ کئی مرد و زن درج بالا روش اختیار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر رات کو شادی کی دعوت ہے، تو وہ دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک وقت کا ناغہ کرنے کے بعد انسان عموماً زیادہ کھانا کھا جاتا ہے۔

اس ضمن میں لاہور کے ایک ماہر غذائیات، سہیل اکمل کہتے ہیں: ''انسان جب غذا کھائے، تو ہمارا بدن اس میں سے مطلوبہ غذائیت استعمال کرتا اور بقیہ محفوظ کر لیتا ہے۔ لیکن جب جسم کو ایک وقت کا کھانا نہ ملے، تو وہ گھبراہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے انسان جیسے ہی کھانا کھائے، وہ اس کا بیشتر حصہ مستقبل کی خاطر ذخیرہ کر لیتا ہے۔ چناں چہ بدن پر غیر ضروری چربی کی تہیں چڑھ جاتی ہیں۔

سو کسی تقریب کی خاطر کھانے کا ناغہ نہ کیجیے، ورنہ یہ عمل آپ کو فربہ بنا سکتا ہے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ دعوت میں جانے سے پہلے پیٹ بھر کر پانی پی لیجیے۔ یوں دعوت میں پیٹ بھر کر کھانے سے بچ جائیں گے۔

(7) بدیسی غذا اچھی ہے

امیر مرد و زن یہ سوچ کر نہایت مہنگی امپورٹڈ غذائیں کھاتے ہیں کہ وہ زیادہ غذائیت بخش ہوتی ہیں۔ لیکن پاکستانی ماہرین کا کہنا ہے کہ مقامی طور پر دستیاب تمام غذائیں انسانی جسم کو دستیاب غذائیت رکھتی ہیں۔ لہٰذا متوسط طبقے کو بدیسی غذائیں خریدنے کی خاطر اپنی جیب ہلکی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

(8) وزن کم کرنے کی خاطر غذا کا کردار سب سے اہم ہے

ایک تحقیقی جائزے سے انکشاف ہوا کہ وزن کم کرنے والوں کی اکثریت یہ سمجھتی ہے، غذا میں رد و بدل کرنے سے انھیں کامیابی مل جائے گی۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ معتدل ورزش کے بغیر وزن کم کرنا کٹھن مسئلہ بن جاتا ہے۔

دراصل انسان جب کم کھانے لگے اور ورزش نہ کرے تو اس کے عضلات لٹک جاتے ہیں۔ عضلات کو سخت رکھنے کے لیے روزانہ 30 منٹ کی ورزش ضروری ہے۔ مثلاً تیز چلنا یا دوڑنا۔ یوں کم کھانے سے چربی گھلنے کے باعث عضلات نہیں لٹکتے اور اپنی سختی قائم رکھتے ہیں۔

(9) پانی ہی نہیں رس، چائے، کافی، یخنی بھی پی جا سکتی ہے

وزن کم کرنے کے سلسلے میں ماہرین سبھی کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ دن میں زیادہ سے زیادہ پانی پئیں۔ لیکن بیشتر لوگ پھلوں یا سبزیوں کا رس، یخنی، چائے، کافی حتیٰ کہ بوتل پی کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مائع جات بھی پانی کے زمرے میں آتے ہیں۔

حالانکہ کوئی بھی مائع پانی کا بدل نہیں ہو سکتا، خصوصاً انسان جب اپنا وزن کم کرنا چاہے۔ غیر مضر حرارے رکھنے والا پانی ہمارے بدن کو زہریلے مادوں سے پاک صاف کرتا اور غذاؤں میں شامل معدنیات و حیاتین (وٹامن) کو بدن میں جذب کرتا ہے۔ مزید برآں ہمارے نظام ہضم کو پانی پروسیس کرنے کے لیے سخت تگ و دو بھی نہیں کرنا پڑتی۔

سو خصوصاً چائے کافی پانی کے نعم البدل کبھی نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا جب ماہر غذائیات وزن کم کرنے کے ضمن میں آپ کو پانی زیادہ پینا بتائے، تو اس سے مراد کوئی اور مائع نہیں صرف اور صرف پانی ہے۔

○○○

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

صحت کی ضامن اور محبت کی علامت

اسٹابری

یہ چہروں کو جھریوں سے اور جسم کو بڑھاپے سے بچانے والا پھل، آپ کی توجہ سے محروم تو نہیں!

حکیم قاضی ایم اے خالد

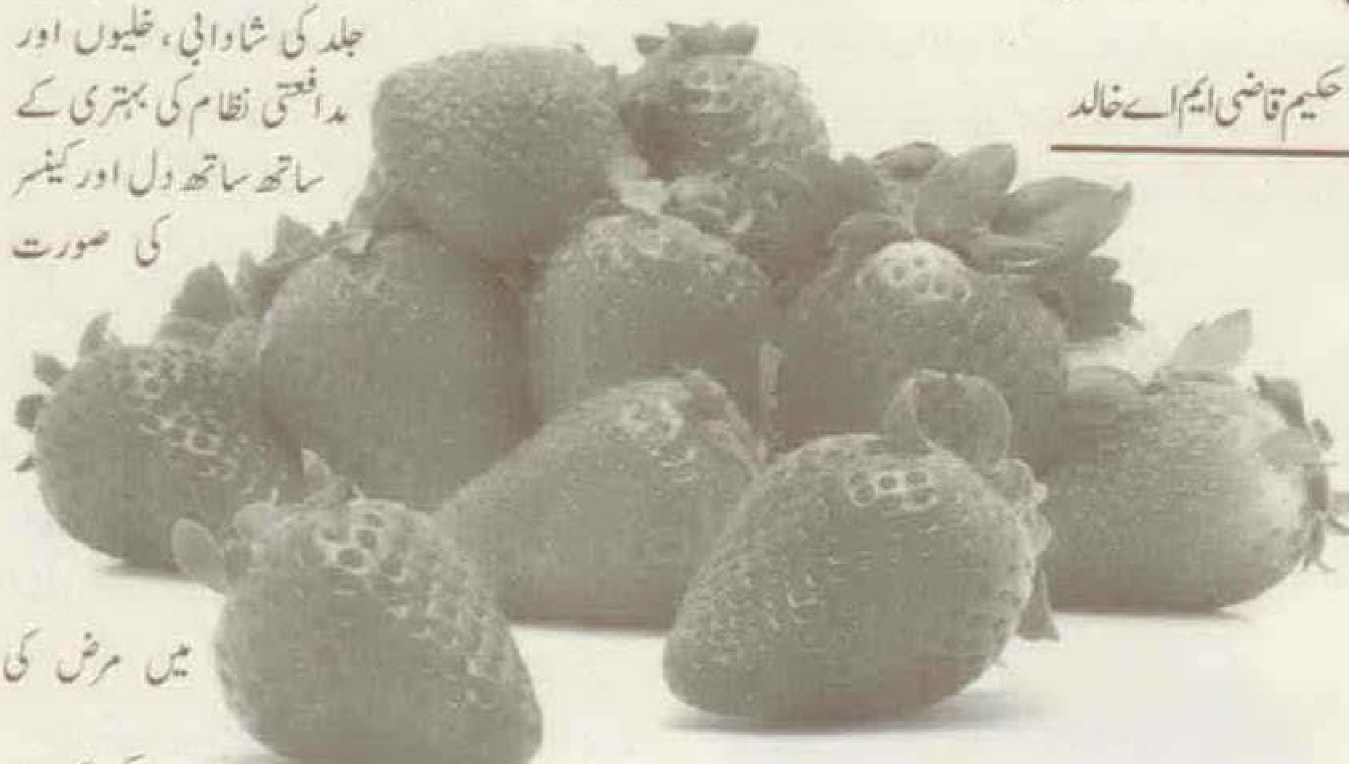

شگفتہ سرخ رنگت اور سر پر سبز پتوں کا تاج لیئے دل کی شکل سے مشابہ اسٹابری گلاب کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے محبت کی علامت اور صحت کی ضمانت بھی کہا جاتا ہے۔ چھ سو سے زائد اقسام کی اسٹابریز پاکستان سمیت دنیا بھر میں آئس کریم، ملک شیک و دیگر مشروبات، میٹھے پکوان اور سلاد کی جان ہیں۔ مارچ سے جولائی کے دوران تازہ اسٹابریز کا بھرپور مزہ لیا جا سکتا ہے۔ 94 فیصد امریکیوں کے ساتھ ساتھ اب (پاکستان میں اس کی وافر کاشت کی وجہ سے) پاکستانیوں کی بھی کثیر تعداد اسٹابری استعمال کر رہی ہے۔

جدید طبی تحقیق کے مطابق اسٹابری کا روزانہ استعمال انسانی جسم کی قوت مدافعت بڑھانے اور صحت مند رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس میں وٹامن سی کی وافر مقدار پائی جاتی ہے جس سے قوت مدافعت پیدا ہوتی ہے۔ اسٹابریز میں موجود مختلف وٹامنز، معدنیات اور زود ہضم ریشے جلد کی شادابی، خلیوں اور مدافعتی نظام کی بہتری کے ساتھ ساتھ دل اور کینسر کی صورت میں مرض کی شدت کم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اسٹابری میں موجود اینٹی آکسیڈینٹس (مانع تکسید اجزا) انسانی جسم میں پائے جانے والے فری ریڈیکلز (مجموعہ ایٹم) کو ختم کرتے ہیں نیز وٹامن سی، فولیٹ اور مانع تکسید اجزا سرطان اور رسولی کے خلیات سے لڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسٹابری

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کھانے والا سرطان (کینسر) جیسے مہلک مرض کا شکار نہیں ہوتا۔ یاد رہے کہ فری ریڈیکلز جسم میں موجود کارآمد سیلز کو ختم کرتے ہیں اور کینسر کا سبب بنتے ہیں۔

اسٹابری میں فائبر (غذائی ریشہ) سیلی کون، پوٹاشیم، میگنیشیم، جست، آئیوڈین' فولک ایسڈ، فلیوونائیڈز، فائٹوکیمیکلز' وٹامن بی 2، بی5، بی6 اور میگنیز کی کافی مقدار پائی جاتی ہے۔ اسٹابری جوڑوں کے درد اور گنٹھیا کے مرض میں فائدہ مند ہے۔ امراض چشم میں انتہائی مفید ہے 'بینائی کے نقائص' بصری اعصاب کی تقویت' آنکھوں کی انفیکشن میں کارآمد ہے۔ اس میں بیس مختلف اجزا اینٹی ایجنگ صلاحیت رکھتے ہیں جس کے باعث یہ جھریوں اور بڑھاپے سے بچا کر انسانی جسم کو جوان رکھتی ہے۔ اسٹابری میں موجود فائٹوکیمیکلز کولیسٹرول لیول کو نارمل رکھتے ہیں جبکہ یہ پوٹاشیم اور میگنیشیم کی بدولت ہائی بلڈ پریشر میں فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ اسٹابری کھانے سے قوت مدافعت بحال رہتی ہے جس کی وجہ سے نزلہ زکام سمیت بیشتر اقسام کی چھوت (انفیکشنز) سے بدن انسانی محفوظ رہتا ہے۔ اسٹابری میں موجود فائٹونیوٹرنٹس' سوجن یعنی ورم کو روکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اسٹابری میں ایک معدنی جز بورون پایا جاتا ہے جو خواتین کے جسم میں زنانہ ہارمونز کی سطح بڑھا دیتا ہے۔ یہ بیشتر نسوانی امراض میں بھی فائدہ مند ہے۔ اس میں موجود فلیوونائیڈز مزمن امراض' سرطان، امراض قلب، بلند فشار خون' دانتوں کے امراض اور ہڈیوں کی کمزوری میں فائدہ مند ہیں۔ اسٹابری کھانے سے پیاس کم لگتی ہے۔ اسٹابری کا بیرونی استعمال رنگت میں نکھارنے کے علاوہ ایکنی و چھائیوں کو دور کرکے چہرہ خوبصورت بناتا ہے۔

سخت، چمکدار، گہری سرخ رنگت، درمیانہ سائز اور سر پر پتوں کا تاج تازہ اسٹابریز کی نشانیاں ہیں۔ پیلے دھبوں، ہلکی سرخ یا سبزی مائل رنگت کی اسٹابریز خریدنا بہتر فیصلہ نہیں۔ ماہرین کے مطابق استعمال کے وقت ہی اسٹابریز کو دھونا چاہیے۔ اسٹابریز کو ریفریجریٹر میں احتیاط سے رکھنا ضروری ہے اور دو دن سے زیادہ رکھنا نقصان دہ ہوسکتا ہے۔

احتیاط: گردے، پتے اور جگر کے پیچیدہ امراض کی صورت میں اسٹابریز کھانے سے پرہیز کیا جائے۔

ناشتے میں دودھ اور شہد کے ساتھ بنایا گیا اسٹابریز کا جوس صحت کے لیے بہت زیادہ مفید ہوتا ہے۔ سلاد اور دہی کے ساتھ بھی اسٹابریز کھائی جاسکتی ہیں جبکہ اس کے دیگر چند استعمالات نذر قارئین ہیں۔

اسٹابری کا مربا

اجزا:

اسٹابریز آدھا کلو چینی آدھا کلو

ترکیب:

اسٹابریز کو دھو کر اوپر سے تھوڑا کھرچ لیں۔

پھر اسے چینی کے ساتھ رات بھر کے لیے فریج میں رکھ دیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اگلے روز اسٹابریز کو چولھے پر اتنا پکائیں کہ چینی گھل جائے اور شیرہ گاڑھا بن جائے۔

اسٹابریز کو ثابت ہی رہنے دیں اور ٹھنڈا کر کے فریز کر لیں۔ اسٹابری کو محفوظ کرنے کا یہ ایک بہترین طریقہ ہے۔

اسٹابری یوگرٹ شیک

اجزا:

دہی ایک کپ دودھ ایک کپ

اسٹابری 8 عدد

چینی 3/4 کھانے کے چمچے

برف کٹی ہوئی 1/4 کپ

ترکیب:

بلینڈر میں دہی، اسٹابری، دودھ، چینی اور برف ڈال کر بلینڈ کر لیں۔ فریش اسٹابری سے گارنشنگ کر کے سرو کریں۔

اسٹابری فرنی

اجزا:

پسے ہوئے چاول چار کھانے کے چمچ

دودھ چار کپ

چینی چار کھانے کے چمچ

اسٹابری آدھا کپ

پسی ہری الائچی آدھا چائے کا چمچ

بادام اور پستے دو کھانے کے چمچ

ترکیب:

پسے ہوئے چاول آدھے گھنٹے کے لیے بھگوئیں۔ پھر تھوڑا پانی ڈال کر گرائنڈ کر کے پیسٹ بنا لیں۔

اب چار کپ اُبلے ہوئے دودھ میں چاولوں کا پیسٹ شامل کر کے چولھے پر چڑھا دیں اور اس دوران چمچہ چلاتے رہیں۔

آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو اس میں حسب ذائقہ چینی ڈال کر پانچ منٹ مزید پکائیں اور چولھے سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔

اسٹابری کا ماسک

اسٹابری نوش کرنے کے استعمالات کے ساتھ ساتھ چہرے پر لگانے کا بھی ایک نسخہ چلتے چلتے بتاتا چلوں۔ وہ خواتین جن کی رنگت سانولی ہو گئی ہو یا چہرے پر چھائیاں موجود ہوں۔ وہ اپنے چہرے پر اسٹابری کا ماسک لگائیں تو ان کی رنگت نکھر جائے گی۔ ایکنی میں بھی فائدہ مند ہے۔

اجزا:

اسٹابری تین عدد

جو کا آٹا ایک چھوٹا چمچ

شہد ایک چھوٹا چمچ

عرق گلاب دو بڑے چمچ

ترکیب:

پہلے اسٹابری کو کچل لیں پھر اس میں جو کا آٹا، شہد اور عرق گلاب ملا کر آمیزہ بنائیں۔ یہ آمیزہ پندرہ منٹ تک چہرے پر لگا رہنے دیں۔ بعدازاں نیم گرم پانی سے چہرہ دھو لیں۔ یہ ماسک ہر تین دن بعد استعمال کیا جا سکتا ہے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سائنس و ٹیکنالوجی

عبدالہادی سید

ماؤس کو خدا حافظ کہنے کا وقت آپہنچا

انگلی کے اشارے سے کمپیوٹر چلایئے

یہ 2000ء کی بات ہے، چودہ سالہ امریکی لڑکا ڈیوڈ ہولز کمپیوٹروں میں ازحد دلچسپی لینے لگا۔ دراصل ریاضی اس کا پسندیدہ مضمون تھا لہٰذا وہ خود بخود پیچیدہ ریاضیاتی مسئلے حل کرنے میں کمپیوٹر سے مدد لینے لگا۔ جلد ہی اسے احساس ہوگیا کہ یہ علم سکھانے والا بڑا طاقتور آلہ ہے۔ چناں چہ وہ کمپیوٹر پر من پسند اشیا کے تھری ڈی ڈیزائن بنانے لگا۔

لیکن رفتہ رفتہ اسے محسوس ہوا کہ کمپیوٹر کا دائرہ کار لامحدود نہیں...... بلکہ بعض اوقات وہ کام میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس ضمن میں ڈیوڈ بتاتا ہے "میں مٹی سے چند منٹ میں کوئی شے تیار کرلیتا۔ لیکن وہ شے کمپیوٹر میں تخلیق کرتے اکثر گھنٹے لگ جاتے۔ اسی بنا پر میں سوچنے لگا کہ مسئلہ کیا ہے؟ کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں کس جگہ خرابی ہے؟"

ڈیوڈ ہولز (David holz) سوچنے لگا کہ کمپیوٹر پر مٹی کی ورچوئل شے بنانے کا بہتر طریق کار ہونا چاہیے۔ غوروفکر سے اسے احساس ہوا کہ اگر کمپیوٹر ماؤس و کی بورڈ کے بجائے صرف انگلیوں کے اشاروں سے چلایا جائے، تو یقیناً کام تیزی سے ہوگا۔ یہ خیال چودہ سالہ ڈیوڈ کے ذہن سے چپک کر رہ گیا۔

اسکول کی تعلیم مکمل ہوئی، تو ڈیوڈ نے کالج اور پھر یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہ اطلاقی (اپلائیڈ) ریاضی میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اکثر اسے یہی خیال آتا...... ایسا کوئی آلہ ایجاد کیا جائے جس کی مدد سے اشاروں کے ذریعے کمپیوٹر چلایا جاسکے۔

آخر 2010ء میں یہ تصور ڈیوڈ پر اتنا حاوی ہوا کہ اس نے تعلیم ادھوری چھوڑی اور لیپ موشن (Leap Motion) نامی کمپنی کھول لی۔ وہ پھر ایسا آلہ بنانے پر تحقیق و تجربے کرنے لگا جو انگلیوں یا کسی شے (مثلاً قلم) کے اشارے سمجھ کر کمپیوٹر میں کام کرواسکے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

لیپ موشن کی ایجاد

آخر 2012ء میں ڈیوڈ اور اس کے ساتھیوں کی محنت رنگ لائی اور وہ ایسا سینسری (Sensory) آلہ ایجاد کرنے میں کامیاب رہے جو انگلیوں یا قلم کی انتہائی معمولی حرکت (0.01 ملی میٹر) بھی "دیکھ" کر حکم کمپیوٹر تک پہنچا سکتا ہے۔ اس آلے کو "لیپ موشن" کا نام دیا گیا۔

لیپ موشن دراصل ایک یو ایس بی آلہ ہے جو ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر میں لگتا ہے۔ اس میں دو ننھے انفراریڈ کیمرے اور تین انفراریڈ ایل ای ڈیز (LEDs) نصب ہیں۔ جب لیپ موشن کمپیوٹر کے ساتھ لگایا جائے، تو اس کے کیمرے ایک میٹر (تین فٹ) تک انگلیوں کے اشارے دیکھ سکتے ہیں۔

سب سے پہلے ایل ای ڈیز انفراریڈ روشنی کے نکتوں (Dots) کا تھری ڈی نمونہ (Pattren) تخلیق کرتے ہیں۔ پھر کیمرے اس ڈیٹا کی تصاویر اتارتے (فی سیکنڈ تین سو تصویریں) اور اسے کمپیوٹر کی طرف بھجواتے ہیں۔

کمپیوٹر میں لیپ موشن کا سافٹ ویئر اس ڈیٹا کو "پیچیدہ ریاضیاتی فارمولے" کے ذریعے ایسی زبان میں ڈھالتا ہے جسے آپریٹنگ سسٹم مثلاً ونڈوز 7 سمجھ سکے۔ یوں آپریٹنگ سسٹم انگلیوں کے اشاروں کے احکامات پر ناچنے لگتا ہے۔

یہ حیرت انگیز ایجاد جولائی 2013ء میں برائے فروخت پیش ہوئی۔ فی الوقت امریکا میں لیپ موشن کی قیمت 80 ڈالر (8480 روپے) ہے۔ استعمال کنندگان کا کہنا ہے کہ یہ آلہ ابھی خام حالت میں ہے، اسی لیے توقعات پر پورا نہیں اتر سکا۔ بہرکیف لیپ موشن کمپنی شکایات دور کرنے کی خاطر اپنی ایجاد کو بہتر بنانے کے لیے تحقیق و تجربات میں مصروف ہے۔

مستقبل کی جھلک

یہ حقیقت ہے کہ ہر نئی ایجاد شروع میں خامیاں زیادہ رکھتی ہے اور خوبیاں کم! لیکن رفتہ رفتہ خامیاں دور ہونے سے وہ مقبول ہوتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً کمپیوٹر ہی کو لیجیے۔ اولیں کمپیوٹر اتنے دیوہیکل تھے کہ ایک کمرے میں سماتے۔ آج ان سے کہیں زیادہ طاقتور کمپیوٹر ہاتھوں سے بھی چھوٹے موبائل فونز میں سما چکے۔

مستقبل میں لیپ موشن دنیائے کمپیوٹر ہی نہیں انسانی زندگی کے کئی شعبوں میں تبدیلی کا نقیب ثابت ہو سکتا ہے۔ جب بھی یہ ٹیکنالوجی خامیوں سے پاک ہوئی، تو ایسا حیرت انگیز ڈیجیٹل دور جنم لے گا جس میں لوگ انگلیوں اور ہاتھوں کے اشاروں سے مشین چلائیں گے۔ تب مشینیں اس قابل ہو جائیں گی کہ اشاروں کی نوعیت جان کر متعلقہ کام کر سکیں۔

مثال کے طور پر ایسے روبوٹ ایجاد ہو چکے جن کی مدد سے ڈاکٹر آپریشن کرتے ہیں۔ اگر لیپ موشن ٹیکنالوجی ان پر اپنائی گئی، تو یہ ممکن ہو جائے گا کہ روبوٹ ڈاکٹر کے محض اشارے سمجھ کر آپریشن کرنے لگیں۔

ڈیوڈ ہولز کی خواہش یہ ہے کہ کمپیوٹر (مشین) اور انسان کے مابین تال میل رکھنا آسان ہو جائے۔ اسی خواہش سے لیپ موشن نے جنم لیا اور اب یہ ایجاد رفتہ رفتہ مغرب میں مقبولیت عام پا رہی ہے۔

حال ہی میں کمپیوٹر ہارڈ ویئر بنانے والی مشہور امریکی کمپنی ایچ پی (HP) نے اعلان کیا ہے کہ وہ "انویئے (Envy) 17 لیپ موشن اسپیشل ایڈیشن" نامی لیپ ٹاپ مارکیٹ میں لا رہی ہے۔ اس لیپ ٹاپ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں لیپ موشن (USB) کارخانے ہی میں فٹ ہو گی۔ لہٰذا اسے علیحدہ خریدنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پکانے کا تیل کون سا بہتر؟

زیتون کے تیل کی غذائیت تباہ ہونے سے کیسے بچائی جا سکتی ہے؟

عالیہ احمد

خاتون خانہ رخسانہ کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ اسی لیے وہ کھانا پکاتے ہوئے زیتون کا تیل استعمال کرنے لگیں۔ کسی نے انھیں بتایا تھا کہ یہ تیل صحت کے لیے مفید ہے۔

کچھ عرصے بعد ان کا دس سالہ بیٹا بیٹھے بٹھائے بیمار ہو گیا۔ پہلے اسے محلے کے ڈاکٹر کو دکھایا گیا، مگر وہ مرض کی نوعیت نہ جان سکا۔ تب والدین اسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس نے تشخیص و ٹیسٹ کرانے کے بعد انکشاف کیا کہ لڑکے کی طبیعت زیتون کے تیل کی وجہ سے خراب ہوئی ہے۔

دراصل زیتون کا تیل بہت جلد کھول کر جلنے لگتا ہے۔ اصطلاح میں یہ عمل نقطہ کھولاؤ (Smoke Point) کہلاتا ہے۔

ہر تیل کم یا زیادہ نقطہ کھولاؤ رکھتا ہے۔ کھانا پکانے کے طریقے خصوصاً ہماری تندرستی سے یہ عمل بڑا قریبی تعلق رکھتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ جو تیل کم نقطہ کھولاؤ رکھے، وہ بہت جلد کھول اٹھتا ہے۔ اگر وہ کچھ دیر بھی ابلتا رہے، تو اس کی ساری غذائیت تباہ ہو جاتی ہے۔ نیز اس میں زہریلے مرکبات (Compounds) جنم لیتے ہیں پھر یہی مرکبات انسان کو بیمار کر ڈالتے ہیں۔ مزید برآں یہ تیل بہت زیادہ گرم یا بار بار استعمال کیا جائے، تو اس میں شامل مرکبات کینسر بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

یاد رہے کئی کمپنیاں، ہوٹل اور چھابڑی والے تیل کو جلا جلا کر مسلسل اسے کام میں لاتے ہیں۔ ایسے تیل میں پکی یا تلی غذائیں صحت کے لیے نقصان دہ ہیں۔

زیتون کا تیل بھی کھانا پکانے کے ان تیلوں (Cooking Oils) میں شامل ہے جو کم نقطہ کھولاؤ رکھتے ہیں۔ ادھر رخسانہ کے گھر والے تلے آلو و چکن کھانے کے شوقین تھے۔ لہٰذا جب بہت زیادہ جلے زیتون کے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تیل میں پکے کھانے کھائے گئے، تو بچے نے بیمار ہونا ہی تھا۔ بچوں کا مدافعتی نظام کمزور ہوتا ہے۔

☆

رخسانہ کا واقعہ یہ حقیقت عیاں کرتا ہے کہ ہمیں پکانے کے تیل کا انتخاب کرنے میں محتاط ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں معلومات، تجاویز اور مشورے درج ذیل ہیں:

چکنائی کے تیزاب

تیل کی تمام اقسام چکنائی کے تیزاب (Fatty Acids) رکھتی ہیں۔ ان تیزابوں کی تین اقسام ہیں، سیچوریٹڈ پولی ان سیچوریٹڈ اور مونوان سیچوریٹڈ۔ حقیقتاً تمام تیل تینوں اقسام رکھتے ہیں۔ لیکن تیل میں جس تیزاب کی مقدار زیادہ ہو، وہ پھر سیچوریٹڈ، پولی ان سیچوریٹڈ یا مونو سیچوریٹڈ کہلاتا ہے۔

سیچوریٹڈ چکنائی

یہ چکنائی مکھن، ملائی اور ان سے بنی اشیا میں زیادہ ہوتی ہے۔ سیچوریٹڈ چکنائی کی پہچان یہ ہے کہ وہ کمرے کے درجہ حرارت میں ٹھوس ہو جاتی ہے۔ طبی سائنس جان چکی کہ اس چکنائی کا زیادہ استعمال کولیسٹرول کی سطح بڑھاتا اور انسان کو امراض قلب میں مبتلا کرتا ہے۔ اسی لیے سیچوریٹڈ چکنائی والی غذائیں سوچ سمجھ کر استعمال کیجیے۔ ناریل، سویابین اور پام آئل بھی چکنائی کے اسی زمرے میں شامل ہیں۔

پولی ان سیچوریٹڈ چکنائی

اخروٹ، سورج مکھی اور تل کے تیل اس چکنائی کی مثالیں ہیں۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ پولی ان سیچوریٹڈ چکنائی والے تیل ہمیشہ مائع حالت میں رہتے ہیں۔ انھیں ریفریجریٹر میں رکھا جائے، تب بھی ان کی حالت نہیں بدلتی۔

یہ تیل ہمارے خون میں کولیسٹرول کی سطح کم کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کا استعمال ہمیں امراض قلب سے محفوظ رکھتا ہے۔ مزید برآں ان پولی ان سیچوریٹڈ تیلوں میں چکنائی کی دو خاص اقسام، اومیگا۔6 اور اومیگا۔3 بھی ملتی ہیں۔ یہ دونوں اقسام ہماری صحت بہتر بناتی ہیں۔ گو دونوں میں اومیگا۔3 زیادہ صحت بخش اثرات رکھتی ہے۔

مونو سیچوریٹڈ

زیتون، سرسوں، سورج مکھی، مکئی، مونگ پھلی اور تل کے تیل اس زمرے میں آتے ہیں۔ یہ تیل کمرے کے درجہ حرارت میں تو مائع شکل میں رہتے لیکن ریفریجریٹر میں نیم ٹھوس ہو جاتے ہیں۔ یہ تیل بھی خون میں کولیسٹرول کی سطح گھٹاتے ہیں۔ لہٰذا انسان کو امراض قلب کا شکار نہیں بناتے۔

درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ کھانا پکانے میں پولی ان سیچوریٹڈ یا مونو ان سیچوریٹڈ چکنائی والے تیل استعمال کیے جائیں۔ مدنظر رکھنے والی دوسری اہم بات یہ ہے کہ کوئی غذا تلتے یا زیادہ دیر تک پکانے سے ایسا تیل استعمال کیجیے جس کا نقطہ کھولاؤ زیادہ ہو۔ جب کہ کوئی غذا معمولی تلنی ہو یا سلاد میں تیل ڈالنا ہو، تو کم نقطہ کھولاؤ والا آئل اپنائیے۔

ماہرین کے مطابق سورج مکھی، سویابین، مونگ پھلی تل اور سرسوں کا تیل بلند نقطہ کھولاؤ رکھتا ہے۔ لہٰذا کوئی غذا طویل عرصہ پکانی ہو، تو ان میں سے کوئی تیل استعمال کیجیے۔ یہ تیل جلد کھول کر زہریلے مرکبات پیدا نہیں کرتے۔ تاہم انھیں بھی حد سے زیادہ کھولانا درست نہیں۔

مارکیٹ میں نباتی (ویجی ٹیبل) تیل کے نام سے بھی کئی برانڈ دستیاب ہیں۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان تیلوں میں کولیسٹرول بالکل نہیں یا بہت کم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نباتی تیل نباتات (پودوں) سے بنتا ہے جن میں کولیسٹرول نہیں ملتا۔ لہٰذا یہ نباتی تیل کو فروخت کرنے کا محض کاروباری حیلہ ہے۔

○○○

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اب انسان کے منہ میں جانوروں کے دانت؟

سوچ کر ہی گھن آتی ہے

محمد اشرف

انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ اسے دماغ دیا اور وہ اپنے دماغ سے بہت سی فائدہ مند اور کچھ نقصان دہ ایجادات کا موجد ٹھہرا۔

آج کے دور میں تقریباً ہر ایک چیز کے لیے ''نمبر2'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اصلی چیز کی نقل۔ یہ کام پاکستان میں خصوصاً تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز سے لے کر بڑے سے بڑے کاموں میں ''نمبر2'' اپنی اصل سے زیادہ مشہور ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم نمبر 2 کے عادی ہو چکے ہیں۔ کوئی بھی اصلی چیز ہمیں موافق ہی نہیں آتی۔ حلال کی کمائی سے اس دور میں اوّل تو نمبر 1 چیز ملتی ہی نہیں اور اگر مل جائے تو اس کمائی میں اتنا دم نہیں کہ اسے خرید سکے اور فرض کریں تھوڑی سی مل بھی جائے تو ہمارے معدے اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

بات چلی تھی انسانی دماغ سے۔ انسان کا دماغ کہاں کہاں نہیں چلتا۔ اب دیکھیے کل ہم حسب عادت فراغت کے لمحات ٹی وی کے ساتھ گزارنے کے لیے چینل بدل بدل کے دیکھ رہے تھے کہ ڈان نیوز چینل پر

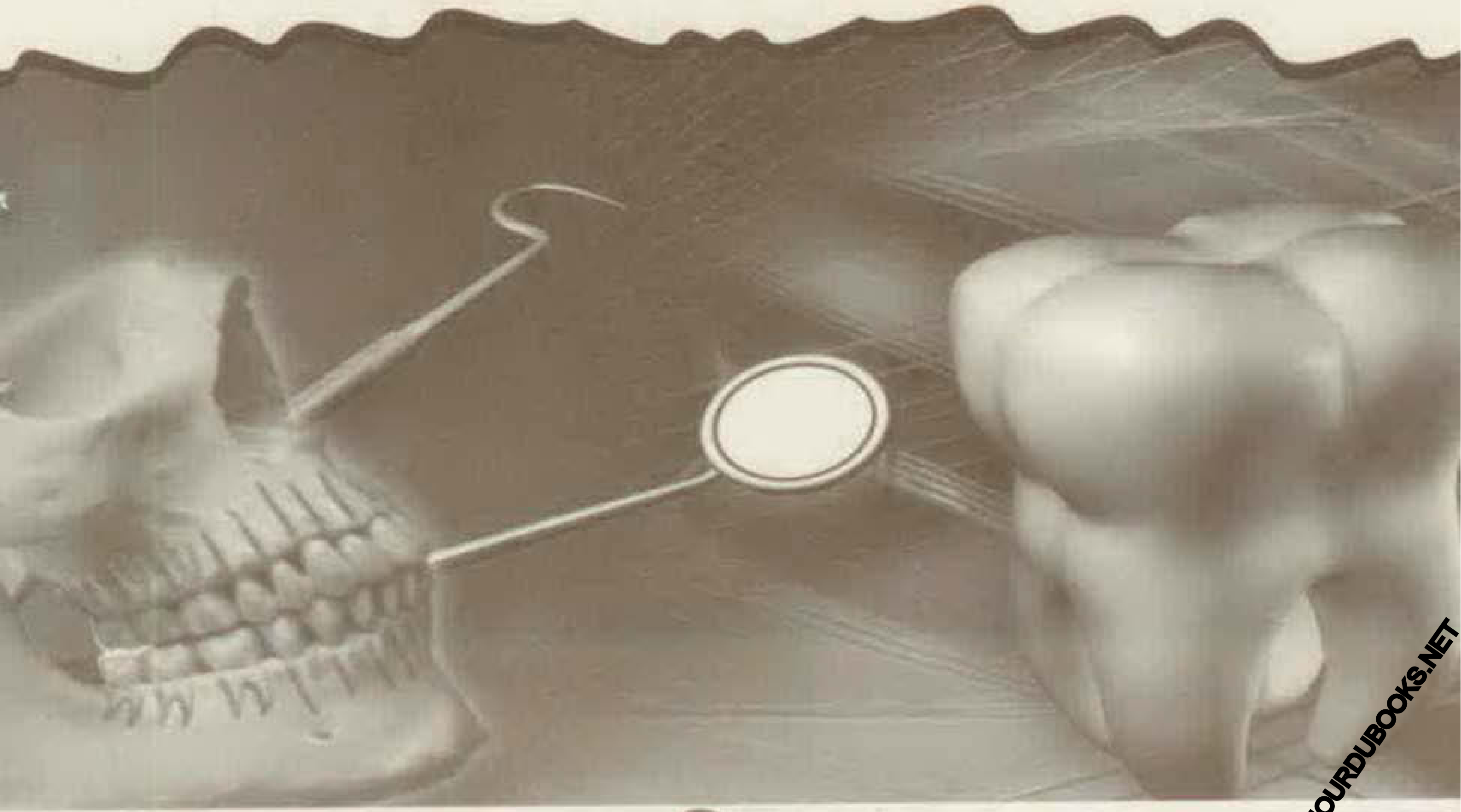

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ایک پروگرام نے ہمارے ہاتھ کو مزید حرکت دینے سے روک دیا۔ یہ تو پتا نہیں پروگرام کا کتنا حصہ گزر چکا تھا۔ ہاں مگر جتنا حصہ بھی دیکھنے کو ملا اسی نے ہمارے ہوش اُڑا دیے۔

علی صاحب جو پروگرام پیش کر رہے تھے۔ وہ ان جگہوں پر جا کر دکھا رہے تھے جہاں جانوروں کے دانتوں کو انسانی دانتوں کی شیپ میں ڈھالا جاتا ہے۔ علی صاحب نے وہاں کام کرنے والوں سے اس کام کے بارے میں تفصیل پوچھی تو جن حقائق سے انھوں نے پردہ اٹھایا۔ وہ سن کر ہمارے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بتایا گیا کہ کئی ڈینٹسٹ یعنی دندان ساز جنھیں دانتوں کا ڈاکٹر کہتے ہیں۔ وہ ان جانوروں کے دانت خرید کر لے جاتے ہیں اور پھر اُنھیں تراش خراش کر اپنے مریضوں کے منہ میں فٹ کر دیتے ہیں۔ یعنی چند روپوں کی خاطر وہ انسانی منہ میں حرام جانوروں کے دانت لگا کر انسانیت کو داغ دار کرتے ہیں۔

کون کون اس ڈاکٹر کا شکار بنا اور کس کس کے منہ میں کس جانور کے دانت ہیں؟ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ بس ہزاروں روپے دے کر خوشی خوشی نئے دانت لگوا لیتے ہیں اور یوں جوان اپنے باقی دانتوں کو محفوظ کرتے ہیں۔ عمر رسیدہ اپنی ڈھلتی ہوئی جوانی کو کچھ دیر اور اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بات سے بے نیاز کہ منہ میں لگے جن دانتوں سے کھا کر وہ زندہ ہیں۔ کس جانور کے ہیں؟ کتے کے ہیں یا گدھے کے، لومڑی کے ہیں یا بکرے کے...... اور یہ کہ حلال جانور کے ہیں یا حرام کے۔ ایسے ڈاکٹر صاحبان کا بھی کوئی دین مذہب ہوگا۔

گوشت کو تو حلال اور حرام کی بنا پر استعمال کیا جاتا ہے۔ پر دانتوں کے "حرامی پن" پر کیا فتویٰ لگنا چاہیے۔ سوچیے۔ (علما کو دعوت عام) ہر چیز میں ملاوٹ کے قصے ہر روز منظر عام پر آتے ہیں۔ مگر جانوروں کے دانتوں کی ملاوٹ کا سن کر نہ صرف رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں بلکہ سوچ کر ہی گھن آتی ہے۔

کون اس کا ذمے دار ہے؟ کس نے اس بات کا نوٹس لینا ہے؟ علی صاحب کا کہنا تھا کہ ہم اس بات کے لیے ہیلتھ سیکرٹری کے پاس گئے تو ان کے پاس ہمارے لیے ٹائم نہیں تھا۔ اب آپ بتائیے۔ کس کے پاس جایا جائے؟ کون اس غلیظ کام کو روکے گا؟ اگر ہیلتھ سیکرٹری کے پاس ٹائم نہیں تو پھر کس کے پاس ہے؟ کیا ہم انہی دانتوں کے ساتھ زندہ رہنے پر راضی ہیں؟ سوچیے گا ضرور......

دانتوں کے بارے میں بڑے لاجواب محاورات ہیں۔ جیسے دانت کھٹے کرنا، انگلیاں دانتوں تلے دبانا، ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور، وغیرہ وغیرہ۔ اس خبر کے بعد انسانی دانتوں کے بارے میں یوں محاورے بن سکتے ہیں۔ انسان کے دانت اپنے اور جانور کے اور یا یہ منہ اور جانور کے دانت ...... خیر یہ تو ایک چھوٹا سا مذاق تھا۔ مگر یہ بات غور طلب ہے کہ اس معاملے پر ایکشن کیوں نہیں لیا گیا۔ کیا ہم سیاست کے علاوہ کسی اور بات پر غور کرنے کے اہل ہی نہیں رہ گئے!

○○○

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بیوی نامہ

چودھری عبدالخالق

میری بیوی ہے اک دہکتا شرارہ
کہ ہو جیسے چنگاریوں کا فوارہ
نہ دیکھی کبھی اُس کے چہرے پہ ہنسی
چڑھائے وہ رکھتی ہے ہر وقت پارہ
صُبح شام اس کے گزرتے ہیں ایسے
کبھی گالیاں دیں کبھی مجھ کو مارا
جو بیتے ہے مجھ پہ وہ میں جانتا ہوں
کیسے جا رہا ہوں مگر میں گزارہ
سُنا تھا کہ گھر کو بناتی ہے بیوی
مگر میری بیوی نے گھر ہی اُجاڑا
وہ وقت جو گزرا بہت خوب گزرا
اسے کا میں رہتا سدا ہی کنوارہ
میری جان اک بار چھوڑے اگر وہ
کروں گا نہ شادی کبھی میں دوبارہ

لکھا کروں

منظور ثاقب

کہہ رہے ہیں وہ کہ ظُلمت کو ضیا لکھا کروں
ان کے قلبِ روسیہ کو آئینہ لکھا کروں
خواہ کتنے عیب ہوں پوشیدہ اک جبے کے بیچ
صاحبِ جبہ کو پارسا لکھا کروں
کاروالا روند ڈالے گر کسی رہگیر کو
اس شعوری واقعے کو حادثہ لکھا کروں
ان کی خاطر دولت۔ دنیا لکھوں صبح ومسا
اور غریبوں کو خدا کا آسرا لکھا کروں
پُل بنانے پر جو تعریفوں کے پُل باندھے گئے
اپنے کالم میں وہ جملے بارہا لکھا کروں
دشمنِ آئینِ اُلفت کو بھی میں اپنا کہوں
جھوٹ کو بھی اک تقاضا وقت کا لکھا کروں
ناتوان تاب وتواں کے باب میں سوچیں اگر
اُن کی ایسی سوچ کو اک واہمہ لکھا کروں
قمقمہ اک بھی نہ روشن ہو اگرچہ شہر میں
کہکشاؤں کا رواں اک قافلہ لکھا کروں
وہ لیے پھرتے ہیں کاسے قوم کی خاطر لکھوں
بھوکا روٹی مانگ لے تو بے حیا لکھا کروں
الغرض کچھ بھی نہ لکھوں ثاقب اپنی سوچ سے
ان سے پوچھوں کب میں لکھوں اور کیا لکھا کروں

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بشریٰ رحمٰن

بے معنی کانفرنسوں کی شوقین خواتین کے لیے ایک تحفہ

سنگھار میز کانفرنس

دس خوب صورت ساڑھیاں مدعو تھیں۔ صدر ساڑھی کی جبیں شکن آلود تھی کہ ایک سفید غرارہ زبردستی اندر گھس آیا تھا۔

جب سب ساڑھیاں اندر داخل ہوچکیں اور سنگھار میز کے گرد اپنی اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھ چکیں تو اسی وقت رنگ برنگی دھجیوں والے یونیفارم میں ملبوس مخنث چپراسی دوڑتا ہوا اندر آیا اور سرخ ساڑھی میں ملبوس خاتون جو کہ کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز تھی اور جسے سب لوگ صدر ساڑھی کہہ کر مخاطب کررہے تھے، اس کے قریب جا کر بولا:

حضور: ایک غرارہ پوش خاتون زبردستی اندر گھس آئی ہے۔ حالانکہ میں اسے پکڑ پکڑ کے منع کرتا رہا ہوں۔ صدر ساڑھی کی شکن آلود جبین کچھ اور شکن آلود ہوگئی۔ اور انھوں نے غضبناک نظریں چاروں طرف گھمائیں۔ آج اس خصوصی کانفرنس میں انھوں نے صرف دس ساڑھیوں کو شرکت کی دعوت دی تھی۔ اور دس کرسیوں ہی کا بندوبست کیا گیا تھا اور شرکت کرنے والی خواتین کو دس مختلف رنگوں کی ساڑھیاں پہن کر آنے کی تلقین کی تھی۔

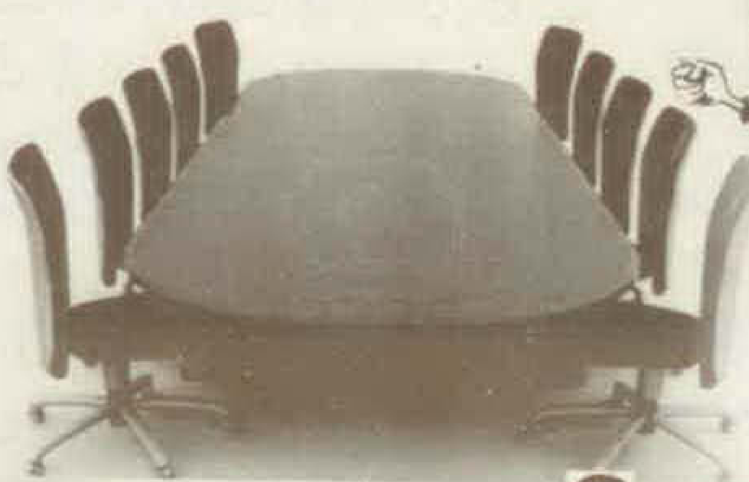

جو عورت زبردستی اندر گھس آئی تھی۔ اس نے سفید غرارہ پہن رکھا تھا اور اپنے سر کو سفید دوپٹے سے اچھی طرح ڈھکا ہوا تھا۔ ایک تو واہیات سفید رنگ جسے وہ رنگ ہی شمار نہیں کرتی تھیں اس پر قدیم طرز کا غرارہ یوں جیسے قنات میں پاؤں پھنسا کے کوئی چل پھر رہا ہو۔

صدر ساڑھی نے اس عورت کو قہر آلود نظروں سے دیکھا پھر مخنث چپراسی کی طرف منہ کر کے بولیں......

”باہر جا کر ہمارے فیصلے کا انتظار کرو......“

چپراسی کو رنش بجا لایا۔ پھر سیلوٹ مار کر باہر نکل گیا۔

صدر صاحبہ سرخ ساڑھی پہنے بڑی کرسی پر بیٹھی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تھیں۔ ان کے علاوہ وہاں کالی، پیلی، نیلی، جامنی، اودی، حنائی، زعفرانی، کاسنی، گلابی اور سبز رنگ کی ساڑھیاں موجود تھیں۔ آج ان کی شناخت ان رنگوں کی وجہ سے ہو رہی تھی۔

اس کانفرنس کے لیے خاص طور پر بیضوی شکل کی سنگھار میز بنوائی گئی تھی اس کی سطح پر بلجیم کا شفاف شیشہ لگا ہوا تھا اور ہر کرسی کے آگے ایک دراز بنی ہوئی تھی۔ جس کے اندر سنگھار کی ممکنہ اشیا مع کنگھا اور ہیئر برش رکھی ہوئی تھیں۔ اتنی اہم کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر ایسی انمول اور انوکھی سنگھار میز بنوانے کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کو باور کرایا جا سکے کہ خواتین صرف میک اَپ کرنے میں طاق نہیں ہیں بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مسائل بھی ایسی میز پر بیٹھ کر حل کر سکتی ہیں۔ اور یہ بتانا بھی مقصود تھا کہ اکیسویں صدی میں گول میز کانفرنس کا تصور نابود ہو چکا اب زمانہ سنگھار میز کانفرنس کا ہے۔ باہر والا دروازہ بند ہوتے ہی تمام ساڑھیاں اپنی اپنی کرسی پر بیٹھ گئیں اور اپنی اپنی دراز کھول کے اپنا میک اَپ اور ہیئر اسٹائل درست کرنے میں لگ گئیں۔ گاہے گاہے وہ سنگھار میز کے شیشے کے اندر بھی جھانک لیتی تھیں۔

صدر ساڑھی نے جب سب ساڑھیوں کو بال بناتے، پاؤڈر لگاتے، لپ اسٹک جماتے دیکھا تو یکا یک انھیں بھی اپنا چہرہ سنوارنے کا خیال آ گیا۔ انھوں نے اپنی دراز کھولی۔ گہرے لال رنگ کی لِپ اسٹک نکالی اور ہونٹوں کے زاویے ٹھیک کرنے لگیں۔ سب ساڑھیوں نے تقریباً بیس منٹ فریش اَپ ہونے میں لگائے۔ یکا یک صدر ساڑھی کو غرارے والی خاتون کا خیال آ گیا جو دور کھڑی اس منظر کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ صدر ساڑھی نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا گویا سب ساڑھیوں کو تنبیہ کی کہ اس شغلِ صورت سازی کو اب چھوڑ دیں۔ سب ساڑھیوں نے فوراً درازیں بند کر دیں اور شیشے میں اپنی صورتیں دیکھنے لگیں۔ صدر ساڑھی نے اب دانستہ سفید غرارے کی طرف دیکھا اور دبدبے سے پوچھا۔

آپ کون ہیں اور کس کی اجازت سے یہاں آئی ہیں؟

غرارے والی...... جی...... جی...... میں نے اخبار میں پڑھا تھا یہاں آج عورتوں کی ایک اہم اور خاص کانفرنس ہونے والی ہے۔ اس لیے میں بغیر دعوت نامے کے آ گئی۔

صدر ساڑھی...... آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ خاص کانفرنس میں عام لوگوں کو نہیں بلایا جاتا۔

سفید غرارہ...... محترمہ میں بھی عورتوں کے حق میں آواز اُٹھانے کے لیے ایک نہایت سنگین مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔

صدر ساڑھی...... آپ عورتوں کے کس طبقے کی نمائندہ ہیں۔ اگر عورتوں کی نمائندگی کر رہی ہوتیں تو

کیسی گزر رہی ہے

شادی کے بعد بشریٰ رحمٰن سے کسی نے پوچھا۔ ''کیسی گزر رہی ہے۔؟''

وہ بولیں ''شادی سے پہلے یارحیم کہتے گزرتی تھی۔ شادی کے بعد یا رحمٰن کہتے گزر رہی ہے۔''

(یاد رہے ان کے میاں کا نام عبدالرحمٰن ہے۔)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

رنگدار ساڑھی میں آتیں۔ ہم مردہ دل عورتوں کی نمایندگی سے نفرت کرتی ہیں۔

سفید غرارہ...... محترمہ مجھے سننے کی تو اجازت دیجیے۔

صدر ساڑھی۔ آپ دیکھ نہیں رہیں ہم نے آج میڈیا والوں کو بھی نہیں بلایا۔ کیونکہ ان کو جو عورت زیادہ لبھا لیتی ہے، اسی کی کوریج کرتے رہتے ہیں۔ ویسے بھی ہمیں نام و نمود کی خواہش بالکل نہیں ہے۔ مگر ہم عورت کے ارتقا کی بات میں کسی کو شریک نہیں کر سکتے۔

اتنے میں کالی ساڑھی اپنی چوڑیاں بجاتی ہوئی کھڑی ہوگئی اور بولی۔

صدر صاحبہ! یہ کیا فضول بحث و تکرار ہو رہی ہے۔

سبز ساڑھی...... میرے خیال میں سفید غرارے کو باہر نکالنا مصلحت کے خلاف ہوگا۔ اوّل تو باہر نکل کر یہ میڈیا کو متوجہ کرے گی اور دوسرے لوگ کہیں گے ساڑھیوں اور غراروں میں بھی اتفاق نہیں ہے۔ آج ہمیں یہ بھی دکھانا ہے کہ ہمارا اتحاد ہر طبقے کی عورت کے ساتھ ہے۔

ہاں...... ہاں...... تجویز اچھی ہے۔ سب ساڑھیاں بیک آواز بولنے لگیں۔

ایک بولی...... اس کو یہیں کھڑی رہنے دو۔

دوسری بولی...... کھڑی رہے مگر بولے نہیں۔

مختلف قسم کی آوازیں ایک ساتھ آنے لگیں۔ تو صدر ساڑھی پھر کھڑی ہوگئی اور بولی۔

معزز ساڑھیو! میں آپ سب کی رائے سے اتفاق کرتی ہوں۔ ہمیں مصلحتاً اس وقت سفید غرارے کو باہر نہیں نکالنا چاہیے اور یوں کھڑے بھی نہیں رکھنا چاہیے۔ ممکن ہے یہ بھی گھر میں ڈائٹنگ کرتی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ بے ہوش ہو کر گر جائے۔ اور ہمارے گلے پڑ جائے۔

آوازیں...... ہیئر...... ہیئر...... صدر ساڑھی زندہ باد۔

سفید غرارے کو عافیت اسی میں نظر آئی کہ پیچھے لگی کرسیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ جائے۔

صدر ساڑھی نے اپنے لمبے ناخنوں والی انگلیوں سے اپنے جوڑے کی پنیں درست کیں اور مسکرا کر کہا۔

میرا خیال ہے اب کارروائی کا آغاز کرنا چاہیے۔ مگر آغاز کون کرے گا۔ غالباً آغاز کے لیے بھی میں ہی بہتر ہوں۔

سبز ساڑھی...... آپ کو یاد نہیں شاید اس ملک میں ہر کانفرنس کا افتتاح تلاوت سے ہوتا ہے۔

صدر ساڑھی...... ہاں...... ہاں...... سوری میں بھول گئی تھی۔ اچھا معزز ساڑھیو! آپ میں سے تلاوت کون کرے گا۔

سب ساڑھیاں پھیکی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں......

اف میں تو پہلے سی پارے ہی سے بھاگ گئی تھی۔ مجھے تو بس پہلا کلمہ آتا ہے۔ سناؤں۔ اوّل کلمہ طیب......

میں بسم اللہ پڑھ دیتی ہوں......

اس قسم کی آوازیں سن کر صدر ساڑھی گھبرا گئی...... اور بولی...... ٹھیک کلمہ طیبہ سے ہی ابتدا کر لیتے ہیں۔

اتنے میں سفید غرارے والی کھڑی ہوگئی۔ اور بولی۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں تلاوت کر دوں جو اس موقع کے لیے مناسب بھی ہے۔

اکثریت نے اثبات میں سر ہلائے...... کہ مناسب ہے اس کو موقع دے دیا جائے۔ ساتھ ہی نیلی ساڑھی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بولی۔ آپ لوگوں کو موقع دے دیا جائے تو آپ گھنٹا بھر کی تلاوت کرنے لگتی ہیں۔

سفید غرارے والی بولی۔ مجھے معلوم ہے یہ کانفرنس ہے۔ میں مختصر تلاوت کروں گی۔

جامنی ساڑھی نے کہا۔ درست ہے پیچھے کھڑے ہو کر تلاوت کرنا ٹھیک نہیں۔ اس لیے اسے تلاوت کے لیے آگے بلا لیا جائے۔ سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

سفید غرارے والی ایسی سیانی نکلی کہ اپنی کرسی بھی اُٹھا کر ساتھ لے آئی اور ان کی کرسیوں میں گھسا کر بیٹھ گئی۔

تلاوت کے بعد صدر ساڑھی نے فرمایا۔ چونکہ میں آج کی صدر ہوں اس لیے گفتگو کا آغاز کرتی ہوں۔ دوران گفتگو مجھے جناب صدر کہہ کر مخاطب کیا جائے۔

اس پر سب ساڑھیوں نے تالیاں بجائیں۔ دو تین نوجوان ساڑھیوں نے زیر لب کہا اس طرح مرتبہ جتانے سے کانفرنس کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

خیر فوت ہونے سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے کارروائی آگے بڑھنے لگی۔

صدر ساڑھی نے فرمایا۔ ہماری سیکرٹری جنرل زعفرانی ساڑھی پہلے گزشتہ کانفرنس کے منٹس پڑھ کر سنائیں گی۔ ان کی تائید کے بعد آج کا ایجنڈا بتائیں گی۔

زعفرانی ساڑھی کھڑی ہوگئی۔ سب کا شکریہ ادا کیا۔ گزشتہ کانفرنس کے منٹس پڑھ کر سنائے سب نے فوراً تائید کر دی۔ پھر اس نے صدر ساڑھی کی اجازت سے آج کا ایجنڈا بتایا۔

1۔ خواتین کے حقوق کے لیے حکومت کو نئی قانون سازی کی یادداشت پیش کی جائے۔

2۔ عورت کے جدید حقوق پر کھل کر بات ہوگی۔

3۔ وفاقی حکومت نے عورتوں کے لیے جو بجٹ دیا ہے۔ اس پر اعتراض اُٹھایا جائے گا۔

4۔ شادی شدہ مردوں کو پابند وفا کرنے کے گر ایجاد کیے جائیں گے۔

5۔ اس کے علاوہ صدر صاحبہ کی اجازت سے کسی بھی ایشو کو زیرِ بحث لایا جا سکے گا۔

زعفرانی ساڑھی ایجنڈا بتا کر بیٹھ گئی۔ تو صدر ساڑھی نے گفتگو کا آغاز کیا......

معزز ساڑھیو!

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ اس دنیا میں کئی سو سالوں سے عورت کا استحصال ہوتا آرہا ہے۔ اب شکر ہے کہ عورت بیدار ہوگئی ہے۔ کئی سو سالوں کا بدلہ لینے لیے اب عورت کو مرد کا استحصال کرنا چاہیے۔

اودی ساڑھی نے ہاتھ کھڑا کیا......

دیکھیں جی! مرد کا مزاج خراب وہ عورت کرتی ہے جو اپنے آپ کو پتی ورتا کہتی ہے اور شوہر کو مجازی خدا کا نام دیتی ہے۔ پہلے ہمیں اپنے معاشرے میں سے ایسی دقیانوسی اور روایتی عورتوں کو ختم کرنا ہوگا...... یہ کہتے وقت اودی ساڑھی نے غرارے کو دیکھا اور اس کی تقلید میں سب کی چبھتی ہوئی نظریں غرارے کی طرف گئیں۔

نیلی ساڑھی اُٹھی اور اس نے کہا۔

ہمارے اندر مردوں سے زیادہ صلاحیتیں ہیں۔ بس ہمارے اندر نہ کہنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس لیے آج سے ہمیں فیصلہ کرنا چاہیے کہ ہم گھر کے اندر شوہر کی کوئی بات نہیں مانیں گی۔ وہ صبح دفتر جاتا ہے تو ہم بھی گھر سے باہر نکل جایا کریں گی۔ سارا دن جو ہمارا جی چاہے گا کریں گی۔ وہ شام کو گھر آتا ہے۔ ہم بھی شام کو گھر آیا کریں گی۔ ہیئر ہیئر...... سب نے تالیاں

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بجائیں اور اس کی ہر فرمائش پر نہ کہیں گی...... (خوب خوب) گلابی ساڑھی کھڑی ہوگئی...... اتوار کے دن شوہر کو چھٹی ہوتی ہے...... مگر وہ ہماری زندگی برباد کر دیتا ہے۔ فرمائشیں کرتا رہتا ہے...... اور سارے گھر کا نظام معطل کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم بھی ہفتے کا ایک دن چھٹی کے لیے مخصوص کریں۔ اس روز شوہر پر حکم چلائیں اور گھر کا سارا کام شوہر کرے اس طرح جیسے ہم اس کا حکم بجالاتی ہیں......

واہ واہ...... واہ واہ...... سبحان اللہ۔

(تقریر جاری ہے)

عورت اور مرد برابر نہیں۔ ان کی صلاحیتیں برابر ہیں۔ بلکہ بعض معاملات میں عورت کو برتری دی گئی ہے۔ یعنی وہ بچہ پیدا کر سکتی ہے اور بچہ پال سکتی ہے۔ ہم اپنی اس برتری کی قیمت مقرر کریں گی (ہیئر...... ہیئر...... تالیاں)

اب جبکہ عورتیں انجینئر بھی ہیں۔ سائنس دان بھی ہیں، پولیس اور فوج میں بھی بھرتی ہو رہی ہیں۔ جج اور جرنیل بن رہی ہیں۔ جہاز اُڑا رہی ہیں۔ تو ان کو کیوں کم تر درجہ دیا جائے۔

(واہ واہ سبحان اللہ...... ویل سیڈ...... ویل سیڈ گلابی ساڑھی۔)

کالی ساڑھی نے ہاتھ کھڑا کیا پھر خود بھی کھڑی ہوگئی۔

دیکھیں جی! یہ جو مرد ہے۔ اپنے آپ کو بڑا طرم خان سمجھتا ہے۔ جس دفتر میں عورتیں کام نہیں کرتیں اس دفتر میں بیٹھ نہیں سکتا۔ شاید اسی لیے علامہ اقبال کا وہ گھسا پٹا شعر ہے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

آج کی عورت نے شانہ بشانہ کام کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کر سکتی ہے۔

نیلی ساڑھی نے پیلی ساڑھی سے سرگوشی میں پوچھا۔ شانہ بہ شانہ کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ پیلی ساڑھی معلوم نہیں میں نے بھی عام عورتوں کے جلسوں میں یہ لفظ اکثر سنا ہے۔

اب حنائی ساڑھی کھڑی ہوگئی۔

سچی بات تو یہ ہے محترم ساڑھیو! ہم خود اپنی اپنی کارگردگی کا جائزہ لیں۔ میں اپنے دفتر میں مینجمنٹ آفیسر ہوں۔ میرا باس میرے بغیر دفتر نہیں چلا سکتا۔ (قہقہے تالیاں......)

جس دن میں دفتر کی چابیاں گھر بھول جاتی ہوں۔ سارا دن ہم ساتھ والے ریستوران میں بیٹھے دفتری معاملات حل کرتے رہتے ہیں۔

(ایک ساڑھی دوسری ساڑھی کے کان میں کھسر پھسر کرتی ہے۔ بکواس کرتی ہے۔ اس نے اپنے باس کو پھنسا کر اس سے نکاح کر لیا ہے۔)

کاسنی ساڑھی۔ میرا ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے اور اسٹور میں سب لڑکیاں ملازم ہیں۔ صبح سے شام تک رش رہتا ہے۔ کسی کو کچھ نہ بھی لینا ہو تو لڑکیوں کو دیکھنے کے بہانے آجاتا ہے۔

زعفرانی ساڑھی۔ اپنے لمبے ناخنوں والے ہاتھ نچا نچا کر کہنے لگی۔

میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ری سپشنسٹ ہوں۔ ویسے تو عام طور پر مجھے کوئی خاص کام نہیں ہوتا۔ زیادہ تر باس کو چائے بنا کر دیتی رہتی ہوں۔ ہاں جن دنوں کوئی ٹینڈر بھرنا ہو تو رات گئے تک میرا باس ہاتھ باندھے میرے آگے کھڑا رہتا ہے۔ کمپیوٹر میں وہ کورا ہے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سب کچھ مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔

کاسنی ساڑھی۔ میں ایک دفتر میں اکاؤنٹنٹ ہوں۔ میرا باس کہتا ہے۔ اکاؤنٹنٹ ہمیشہ عورت کو ہونا چاہیے۔ عورتیں ہیرا پھیری نہیں کرتیں۔ میرا شوہر مجھے طعنے دیتا رہتا ہے اور میرے باس سے جلتا ہے۔ ایسے جلنے والے شوہروں کے لیے بھی قانون سازی ہونی چاہیے۔

پیلی ساڑھی۔ اب قانون سازی کی بات ہو جائے۔ جتنی عورتیں شوقیہ دفتروں میں کام کرتی ہیں۔ ان کے شوہر ان سے حسد کرتے ہیں۔ شک کرتے ہیں۔ ان کے ملبوسات اور میک اَپ پر اعتراض کرتے ہیں۔ حکومت کو ایک یادداشت پیش کرنی چاہیے کہ ایسے مردوں کی زبان بندی کا ایک قانون بنایا جائے۔

یکا یک سفید غرارے والی خاتون کھڑی ہوگئی...... اور از خود زور زور سے بولنے لگی۔

یہ کس قسم کی کانفرنس ہے۔ جس میں صرف مرد کو ہی نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اس ملک میں اور بہت سے مسائل ہیں......

بیٹھو...... بیٹھ جاؤ...... تمھیں بولنے کی اجازت نہیں...... باہر نکل جاؤ...... نکالو اسے باہر...... ساری ساڑھیاں شور مچانے لگیں۔

صدر نے میز بجا کر کہا۔ آپ کو اس شرط پر یہاں بیٹھنے کی اجازت دی گئی تھی کہ آپ بولیں گی نہیں۔

سفید غرارہ...... آپ کی لایعنی باتوں نے مجھے بولنے پر مجبور کر دیا ہے۔ تم سب عورتیں بے وقوفوں کی جنت میں رہتی ہو۔ ایسا کوئی جہان نہیں ہے۔ جہاں مرد کی حاکمیت نہیں ہے اور ایسا کوئی جہان نہیں ہے۔ جہاں عورت کا کوئی فرض نہیں ہے......

خاموش رہو...... چپ کرو۔ بکواس بند کرو۔ ساری ساڑھیاں شور مچانے لگیں......

سفید غرارہ...... تم میں سچ سننے کا حوصلہ نہیں ہے۔ تم گھروں کا سکون چھوڑ کے دفتروں کی رونق بڑھانے کو ترجیح دے رہی ہو۔ تمھیں گھر میں اپنے شوہر کا کام کرتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے۔ مگر دفتر کے اندر ہر مرد کے آگے چائے بنا کے رکھتی ہو۔ اس کے جھوٹے برتن اُٹھاتی ہو۔ سو سو بار سلام کرتی ہو۔ شوہر کے لیے دوسری مرتبہ چائے بنانی پڑے تو چیخنے لگتی ہو۔ دفتر میں زیادہ کام ہو تو اوور ٹائم لگا لیتی ہو۔ مگر گھر میں بچوں کے لیے زیادہ کام کرنا پڑے تو بغاوت کرنے لگتی ہو......

کالی ساڑھی کھڑی ہوگئی......

خاموش گستاخ عورت...... صدر صاحبہ آپ اس کو باہر نکالتی ہیں یا میں دھکے دے کر نکالوں۔

سفید غرارے والی فوراً بیٹھ گئی...... جی میں خود ہی بیٹھ جاتی ہوں......

صدر ساڑھی...... کارروائی کو آگے بڑھایا جائے......

زعفرانی ساڑھی...... اگلا آئٹم ہے کہ حکومت نے جو بجٹ دیا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ ٹیکس کاسمیٹکس آئٹمز پر لگائے گئے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ عورتوں کے لیے دنیا بھر کی کمپنیاں میک اَپ کی چیزیں بناتی ہیں۔ مگر اب تو خیر سے ہمارے ہاں مرد بھی پورا پورا میک اَپ کرنے لگے ہیں۔ ہمارے وزیر اعظم، تمام وزرا اور وزیر اعلیٰ سب ہی اسمبلیوں میں میک اَپ کر کے آتے ہیں۔ اس لیے ہم حکومت کو ایک یادداشت پیش کر رہے ہیں کہ وہ کاسمیٹکس پر سے ٹیکس بالکل ہٹا لے......

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سفید غرارے والی کھڑی ہوجاتی ہے۔
دیکھیے میں ایک سنگین مسئلے پر بات کرنے کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔ خدا کے واسطے آپ کاسمیٹکس کی باتیں چھوڑ کر میری بات سن لیں۔ میں پھر باہر چلی جاؤں گی۔ اللہ کے واسطے...... اس نے ہاتھ جوڑ دیے......
شور مچاتی ساڑھیاں چپ ہوگئیں...... ایک نے کہا۔ سنگین مسئلہ ہے یار سنگین...... جلدی سے کہو......
سفید غرارہ...... دیکھیں جی...... اسی شہر میں گزشتہ ہفتے ایک بہت ہی دردناک سانحہ ہوگیا ہے۔ ایک پانچ سال کی بچی کے ساتھ اجتماعی زیادتی ہوگئی ہے...... آپ سب کی اپنی این جی اوز ہیں۔ مگر کسی طرف سے بھی......
نیلی ساڑھی...... افوہ! یہ اجتماعی زیادتی کیا ہوتی ہے......؟
پیلی ساڑھی...... بے وقوف اسے گینگ ریپ کہتے ہیں...... چپ رہو۔ ویسے بھی یہ باب تو عام ہوتے جا رہے ہیں۔
صدر ساڑھی...... مجرموں کو پکڑنا حکومت کا کام ہے۔ سزا دینا عدالتوں کا کام ہے۔ ہمارا نہیں۔
سفید غرارہ...... آپ میرے ساتھ مل کر احتجاج تو کریں۔ میڈیا کے سامنے چل کے بات تو کریں۔ آئے دن ایسے واقعات ہو رہے ہیں۔ سول سوسائٹی کو اُٹھ کھڑے ہونا چاہیے تاکہ ہماری بچیاں محفوظ رہیں۔
صدر ساڑھی...... ہمارے پاس ان باتوں پر ضائع کرنے لیے وقت نہیں ہے۔ آپ جا کر والدین کو نصیحت کریں جو اپنی بچیوں کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ یا ماہرین نفسیات کے پاس جائیں تاکہ وہ متاثرہ لوگوں کی تربیت کا بندوبست کریں......
محترمہ...... غرارے والی خاتون پھر کھڑی ہوگئی...... آپ سب صاحب اولاد ہیں۔ خدا کے واسطے میرے ساتھ باہر نکلیں جب تک خواتین کی طرف سے آواز بلند نہیں ہوگی حکومت بھی کچھ نہیں کرے گی...... آپ اپنی ذات اور عورت مرد کے بے معنی جھگڑے سے باہر نکل کر سوچیں...... ایک معصوم بچی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور آپ سب یہاں...... ایک دم سے صدر دروازہ کھلا اور مخنث چپراسی دوڑتا ہوا آیا...... کورنش بجا لا کر ایک دم سے صدر ساڑھی سے بولا......
جی وہ میڈیا والے سارے آگئے ہیں...... جی وہ اندر آرہے ہیں......
صدر ساڑھی...... کتنے ہیں......
چپراسی...... جی پندرہ بیس کیمرے ہیں جی...... ابھی اور بھی آرہے ہیں......
معزز ساڑھیو! بریفنگ کے لیے تیار ہوجاؤ میڈیا والے آگئے ہیں......
تمام ساڑھیاں اپنی اپنی درازیں کھول کر اپنا اپنا سنگھار کرنے لگیں۔
سفید غرارے والی بولی......
دیکھیے میڈیا کے سامنے مجھے بھی بات کرنے دیجیے......
صدر ساڑھی نے مخنث چپراسی کو گھور کر دیکھا...... اور کہا...... سفید غرارے کو غسل خانے میں بند کر دو......
اسی وقت دھڑ سے دروازہ کھلا اور کیمرے قطار اندر قطار...... داخل ہونے اور سیٹ ہونے لگے۔ چپراسی حیران پریشان کھڑا تھا کہ اب غرارے کو کیسے ہاتھ لگاؤں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اکساتا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، اس کی 3 بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بہ غور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے 2 سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہوئے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو "اردو ڈائجسٹ" کے 6 شماروں کی انعامی و اعزازی ترسیل کے علاوہ منشورات کی 2 خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتا: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ** 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور

ماہ جنوری میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز1۔ (الف) کراچی (ب) قاضی عبدالرحمن

قصہ کوئز2۔ (الف) دلی دروازہ، لوہاری دروازہ (ب) بادشاہی مسجد کے باہر

قصہ کوئز3۔ (الف) ایک (ب) پانچ

درست جوابات دینے والوں کے نام

محمد شکیل عباس جنجوعہ (سرگودھا) ڈاکٹر خالد سیف اللہ خان (لاہور)، حمزہ شمشاد خان (سرگودھا) مشرف (وہاڑی) قیصر سرور، عائشہ عباس مرزا (لاہور) شگفتہ رحمن (راولپنڈی) ثمینہ امجد (ملتان) حاکم علی (راولپنڈی) محمد فیصل کمال (چارسدہ) فاطمہ ایوب (لاہور) میاں محمد ایوب (لاہور) میاں محمد اویس (لاہور) نائلہ کوکب (لاہور) عبداللہ انیس خان (لاہور) محمد عدنان اشرف (بہاولنگر) ارسلان اشرف (بہاولنگر) محمد فرحان اشرف (بہاولنگر) ایم ایس اختر (راولپنڈی) عزیز الرحمن قاری (شیخوپورہ) ظفر اسماعیل (راولپنڈی) صائمہ جہانگیر (میرپور) محمد نعیم (اسلام آباد) نوشین خضر (لاہور) علی اختر (جامشورو) رضیہ بی بی (میرپور) مریم رحمن (اسلام آباد) مدیحہ رحمن (اسلام آباد) اعجاز حسین بٹ (لاہور) محمود منور خان (سرگودھا) ونیحہ رحمن (اسلام آباد) اقبال احمد خان (کراچی) منیر احمد (حیدرآباد) عبدالنعیم انصاری (حیدرآباد)، آصف کریم (حیدرآباد) سلیم انصاری (حیدرآباد) طہٰ یٰسین (حیدرآباد) مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد) محمد احمد (کراچی) مرزا اسفار بیگ (حیدرآباد) محمد عبداللہ (منڈی بہاؤالدین) پرویز اختر واحد (ہری پور) طاہرہ عنایت (پشاور) حاجی شوکت علی (اوکاڑہ) معین الدین احمد (رحیم یار خان) ثمینہ تقی، رشید اعوان (گوجرانوالہ) شیخ شفاء الرحمن (فیصل آباد) احسان اللہ گھرتل (فیصل آباد) احمد معیز، شمیم اختر (فیصل آباد) محمد صہیب (فیصل آباد) محمد یوسف بھٹی (حافظ آباد) محمد اویس، دانش خانزادہ (سکرنڈ) عثمان تقی طاہر (کراچی) گلزار عثمانی (لاہور) حماد انور (راولپنڈی)

انچارج کوئز: غلام سجاد

دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، یہی ہے اس کوئز کا اصل مقصد

یہی ہے قصہ کوئز

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- ثمینہ امجد (مسلم کالونی چوک شاہ عباس ملتان)
- ظفر اسماعیل (سیکٹر 2 خیابان سرسید راولپنڈی)

آپ کو 6 ماہ تک اُردو ڈائجسٹ کے شمارے بطور تحفہ ملیں گے

نوٹ: تمام قارئین اپنا مکمل نام و پتا جس پر کوریئر پہنچ سکے درست لکھیں اور ساتھ میں اپنا موبائل نمبر یا پی ٹی سی ایل نمبر دینا لازم ہے وگرنہ انعامی کوریئر پیکٹ پہنچ نہیں پاتا۔ (ایڈیٹر)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

قصہ کوئز1

یہ معاہدہ حکومت برطانیہ اور مہاراجا کشمیر گلاب سنگھ کے درمیان امرتسر میں طے پایا۔ اس کے تحت انگریزوں نے وادی کشمیر کو مہاراجا کشمیر گلاب سنگھ کو فروخت کر دیا۔ طے پایا کہ گلاب سنگھ ان علاقوں کی سرحدیں کسی بھی وقت حکومت برطانیہ کی مرضی کے بغیر تبدیل نہیں کریں گے۔ گلاب سنگھ اور ان کے کسی اور پڑوسی کے درمیان کوئی تنازعہ اُٹھ کھڑا ہو تو اسے طے کرنے کے لیے انھیں حکومت برطانیہ کو ثالث مقرر کرنا ہو گا۔ حکومت برطانیہ کا فیصلہ فریقین کو قبول کرنا ہو گا۔ حکومت برطانیہ کی اطاعت قبول کرتے ہوئے، اس اطاعت کی نشانی کے طور پر ہر سال ایک گھوڑا، بارہ بکریاں اور تین جوڑے کشمیری شالوں کے حکومت برطانیہ کو پیش کرنا قبول کیں۔

(الف) یہ معاہدہ کب طے پایا؟

(ب) انگریزوں نے وادی کشمیر کو کتنے میں بیچا؟

قصہ کوئز2

بغداد پیکٹ بین الاقوامی فوجی معاہدہ جو مشرقِ وسطیٰ کے دفاع کے لیے برطانیہ، ایران، پاکستان، ترکی اور عراق کے درمیان طے پایا۔ امریکا معاون رکن تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر انقرہ تھا۔ 1959ء میں جب بادشاہت کے خاتمے کے بعد عراق اس معاہدے سے الگ ہو گیا، تو اس کا نام سینٹو رکھا گیا۔ 1979ء کے اوائل میں ایران اور اگست 1979ء میں پاکستان اور ترکی بھی اس سے الگ ہو گئے اور یوں یہ معاہدہ اور تنظیم ختم ہو گئے۔

(الف) یہ معاہدہ کب طے پایا؟

(ب) سینٹو کا کیا مطلب ہے؟

قصہ کوئز3

یہ معاہدہ حکومت پاکستان کی چھے سالہ جدوجہد کے بعد سوئٹزرلینڈ کے مقام جینوا پر اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل پریزڈی کوئیار کی موجودگی میں پاکستان اور افغانستان کے درمیان طے پایا۔ روس اور امریکا نے ضمانتیوں کی حیثیت سے اس معاہدے پر دستخط کیے۔ معاہدے کی رو سے طے پایا کہ دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات عدم مداخلت کی بنیاد پر فروغ پائیں گے۔ فریقین مسلح مداخلت سے گریز کریں گے۔ دہشت گردوں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی بھی مدد نہ کر سکے گا۔ پاکستان میں جتنے بھی افغان مہاجرین زندگی گزار رہے ہیں، انھیں حکومت پاکستان رضا کارانہ طور پر اپنے گھروں کو جانے کی اجازت دے گی۔ واپس جانے والے افراد کو وہ تمام سہولتیں فراہم کی جائیں گی جو مقامی باشندے پہلے ہی حاصل کر رہے ہیں۔ واپس جانے والے افراد کی پرامن واپسی کی ذمہ دار ہو گی۔ دونوں حکومتوں کی درخواست پر اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے مہاجرین افغانستان جانے والے افراد کو مالی امداد فراہم کریں گے۔ روس اپنے پندرہ ہزار فوجیوں میں سے آدھے فوجی 15 اگست 1988ء تک واپس بلا لے گا۔ نو ماہ تک تمام روسی افواج افغانستان سے واپس چلی جائیں گی۔

(الف) یہ معاہدہ کب طے پایا؟

(ب) اس معاہدے میں پاکستان کی ضمانت کس ملک نے دی؟

انعامات کے لیے تعاون

منشورات

خوبصورت اور معیاری کتب، کم قیمت اعلیٰ معیار

منصورہ، ملتان روڈ لاہور 042-35434909 042-35425356

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ایسے ...... ویسے

چٹ پٹی تحریریں، زندگی کے چار رنگوں کا ذائقہ لیے، ضروری نہیں یہ ذائقہ کھٹا بھی ہو

انجم انصار

بڑی خالہ مدتوں کے بعد امریکا سے آ رہی تھیں۔ اور آ بھی سیدھی ہمارے گھر رہی تھیں، مارے خوشی کے عجب حال تھا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لوگوں کو کیسے بتائیں کہ ہمارے گھر امریکا سے مہمان آ رہے ہیں۔ یوں تو آج کل ہر گھرانے کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار لندن، امریکا میں ضرور ہوتا۔ مگر ہماری فیملی اس لحاظ سے بے حد پسماندہ تھی کہ ایسے ممالک تو کیا، ہمارے عزیز و رشتہ دار تو کسی بڑے شہر تک میں نہ تھے۔ اونچی پوسٹوں پر بھی نہ تھے، مڈل، میٹرک کر کے کریانے کی دکانیں سنبھال لیں یا کسی دفتر میں منشی، کلرک وغیرہ لگ گئے۔ چھے کزن تو چپراسی تھے جو اپنے آپ کو پیغام رساں کہہ کر اپنی ویلیو خود ہی بڑھا لیتے تھے۔

ہم اپنے خاندان میں واحد تھے جو شہر کراچی میں آن بسے تھے۔ بابو جی کسی دفتر میں منشی تھے اور بھائی معمولی ملازم۔ ہم بہنیں ٹیوشن اور سلائی کر کے اپنا وقت اچھے سے اچھا گزارنے کی خواہش مند تھیں، یہی وجہ تھی کہ ہمارا ڈرائنگ روم ہماری اوقات سے زیادہ سجا تھا، صوفے اور قالین سے لے کر ٹرالی تک تھی۔ جو کسی بھی مہمان کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کافی تھی۔ بڑی خالہ کو اپنے گھر کی کافی تصاویر ہم نے امریکا بھیجی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ماموں کے گھر اترنے کے بجائے انھوں نے ہمارے ہاں قیام کا فیصلہ کیا، شاید وجہ یہ بھی ہو کہ ہم لوگ کراچی ہی میں تھے اور ماموں کا قیام ابھی چوہا سیدان کے قریب کسی گاؤں میں تھا۔

اور اب ہم بہنوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اطلاع دیں کہ ہمارے ہاں امریکا سے مہمان آ رہے ہیں۔ اماں تو بے وجہ پورے محلے میں گھوم آئی تھیں اور سب کو بتا دیا تھا کہ ان کی بہن امریکا سے آ رہی ہے اور ان کی یہ ملاقات پندرہ سال کے بعد ہو رہی ہے۔

خیر سے خالہ کے چار کماؤ پوت بھی آ رہے تھے۔ خطوط سے پتا چل گیا تھا کہ وہاں ڈالر کما رہے ہیں۔ خالہ اپنی دو بیٹیوں کو بھی لے کر آ رہی تھیں جن کو رجھانے کے لیے ہم نے خوبصورت سے ڈائیلاگ بھی یاد کر لیے تھے۔

اللہ میری فہمیدہ، شازیہ، نازیہ کے لیے بھی خبر بھیج

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

دے۔ تیرا کیا جاتا ہے۔ اگر یہ خبر امریکا سے ''آ جائے'' تیرے خزانے میں کوئی کمی تو نہیں آئے گی۔ اماں کی دعائیں بھی عجیب سی ہوگئیں تھیں۔ اللہ میاں کو بھی امریکا سے داماد بھیجنے کے لیے کہا جارہا تھا۔ (اور ہم سب بہنوں کے چہرے پر سرخی دوڑ رہی تھی)

آنے سے پہلے خالہ کا فون بھی آ گیا جس میں انھوں نے بڑی بے خبری سے کہا' صابرہ تیری بیٹیاں دیکھنے کو تو میری آنکھیں پیاسی ہیں اور اماں کے ساتھ ساتھ ہمارے کانوں میں صرف یہی جملہ رس گھولتا رہا۔ اور آخر کچھ سوچ کر ہم سب بہنوں نے اپنی لمبی دراز زلفیں کٹوادیں' کیا فائدہ امریکا میں کون چوٹی باندھنے کا جتن کرے گا۔ بڑی آپا اور چھوٹی باجی نے اپنے لیے اسکرٹ تک سی لیے۔ ان کا خیال تھا کہ باہر شلوار قمیص کو دیکھ کر سب ہنستے ہیں۔ خیر ہم دوسری بہنوں نے شرٹ اور پینٹ پر اکتفا کیا۔ جس دن خالہ آرہی تھیں' ابا بھی اپنے دوست سے مانگ کر سوٹ پہن کر ائیرپورٹ گئے۔ اماں نے پہلی دفعہ ساری باندھی اور سکھانے کے باوجود دونوں ہاتھوں سے فال اُٹھا کر چلتی رہیں اور جب خالہ اپنی فیملی کے ساتھ نظر آئیں' تو مت پوچھو کہ دل پر کیا گزری اور ان کی ساری لڑکیاں شلوار قمیص اور دوپٹوں کے ساتھ تھیں' لڑکے نہ صرف کرتے پاجاموں میں تھے بلکہ سب کی ڈاڑھیاں تک تھیں اور ماتھے پر نماز کے نشان۔ خالہ نے ایک نظر ہم سب کو دیکھا اور پوچھا' چوہاسیدان جانے والے بس کب جائے گی اور ہم سے مارے شرم کے کچھ بولا ہی نہیں جارہا تھا کہ ان سے کہہ دیں کہ ہم ایسے نہیں ویسے ہیں۔ یہ تو صرف آج تک رہے ہیں۔

☆☆

نسخہ

یہ سارا چکر فرزانہ بھابی کا تھا۔ انھوں نے ہی مجھے یہ مشورہ دیا تھا کہ تمہارے میاں کا گھر میں تکوانہیں ٹکتا انھیں گھر میں رکھا کرو۔ یہ کیا کہ جب دیکھو دوستوں کے ساتھ گھومتے ہیں۔

''گھومتے ہیں تو گھومنے دو آدھے درجن بچوں کے باوا آخر جائیں گے کہاں؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''مرد پر کبھی اتنا زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیے زیادہ تر بے ایمانیاں یہ شادی شدہ مرد ہی تو کرتے ہیں۔'' (انھوں نے خاصا دہلا دیا تھا)

''تو پھر ان کا ایک پیر پلنگ سے باندھ کر رکھا کروں۔'' میں نے ہنس کر کہا تھا۔

''میں نے باندھنے کو تھوڑی کہا ہے' بس اپنے گھر کا ماحول ایسے رکھو کہ وہ گھر میں زیادہ سے زیادہ رہیں۔''

تب میں خوب میک اپ میں لت پت رہنے لگی۔

''شاہجہاں بیگم! وحشت ہونے لگی ہے تمھیں اس ڈراؤنے روپ میں دیکھ کر' مت کیا کرو میک اپ خوامخواہ ڈپریشن سا بڑھ جاتا ہے' جب بھی تمھیں دیکھتا ہوں۔'' (انھوں نے بولا کر کہا)

پھر میں نت نئے جدید ملبوسات میں رہنے لگی بالوں کی چوٹی بھی کٹا کر بال سیٹ کروا لیے۔

اب تو گھر میں آ کر کوفت ہونے لگی ہے اس قدر مٹاپے پر تمہاری یہ ہیبت زدہ حالت دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ گھر سے کہیں دور بھاگ جاؤں۔''

لو پہلے تو گھر رات کو آ جاتے تھے بھابی کے مشوروں پر عمل کرنے سے وہ گھر سے فرار ہونے کے پروگرام تک بنانے لگے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

"تمھیں تو بات کرنے تک کا سلیقہ نہیں ہے۔ میاں کیا خاک گھر میں رہے گا۔ جہاں بیوی کا لٹھ مار لہجہ اس کا سواگت کرتا ہو۔ بھابی کو ساری شکایتیں میری ذات سے ہی تھیں (وٹے سٹے کی شادی کا یہ انجام ضرور ہوتا ہے)

ارے آج بہت اچھا کیا کہ رات کو دو بجے آئے ہیں اگر بارہ بجے آتے تو مجھے فلم چھوڑ کر آپ کے لیے گیٹ کھولنا پڑتا، کپڑے دینے پڑتے، کھانے کو پوچھنا پڑتا۔ تب میری ساری فلم کا ستیاناس ہو جاتا۔

اب میں رات کو بھی نہیں آیا کروں گا۔ وہ غصے سے ڈکرائے۔

پتا نہیں کیا ہو گیا ہے میاں جی کو ہر وقت ہی ناراض رہتے ہیں کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ میں نے تازہ رپورٹ بھابی کو سنانے کے بجائے بی پڑوسن کو سنائی۔

جب بیوی پچاس برس کی ہو جاتی ہے تو شوہر یوں ہی چیخ چیخ کر ڈکراتا ہے۔

تب میں کیا کروں؟

اس کی کسی بات کا جواب نہ دو۔

مگر اپنی برداشت کو کس طرح قابو میں کروں۔

گھر میں جوان نوکرانی رکھ لو تمہاری برداشت کو سہارا ملے گا۔

تب جوان نوکرانی رکھ لی گئی۔ اب میاں جی باہر تو کیا دفتر بھی بے دلی سے جانے لگے۔ ہر وقت گھر میں بسیرا۔

اور نوکرانی بھی ایسی چھلاوہ...... ارے صاحب جی! آپ دھوپ میں سے آتے ہیں یہ نارنگی کا جوس پی لیں۔ ارے صاحب تھکے تھکائے لگ رہے ہیں اور یہ دودھ کا گلاس پی لیں۔

سوہنی مجھے بھی جوس دے دیا کرو۔ ایک بار میں نے نوکرانی سے کہا۔

بیگم صاحبہ آپ تو گھر میں رہتی ہیں آپ نے کون سا باہر جانا ہوتا ہے۔ صاحب جی تو کمانے جاتے ہیں پورا ٹبر چل رہا ہے ان کے دم سے، ان کا تو خیال رکھنا چاہیے۔

اور ایک دن جب نوکرانی کو ان کا سر دباتے دیکھا

مزاحیہ غزل

اپنے شوہر کو تُو دے سخت سزا، باندھ کے رکھ
ڈانٹ کر کہہ اُسے پیمانِ وفا باندھ کے رکھ!
پھر نہ ہاتھ آئے گا اے ماہ لقا، باندھ کے رکھ
لقلقہ یوں نہ ہواؤں میں اُڑا، باندھ کے رکھ
میری نظروں کی بھی آوارگی رُک جائے گی
رخِ روشن کو چھپا، زلفِ دوتا باندھ کے رکھ
آج کل چور کوئی شے بھی چرا سکتے ہیں
تو کلائی پہ گھڑی، گھر میں گھڑا باندھ کے رکھ
زخم اُس دستِ حنائی نے لگایا جو تجھے
چند روز اُس پہ ذرا برگِ حنا باندھ کے رکھ
اتنی تدبیر تُو کر گھر کے تحفظ کے لئے
چھوڑ کتے کو کُھلا، اور گدھا باندھ کے رکھ
دال کھا کر بھی رئیسوں کی طرح گھر سے نکل
ایسے سوسائٹی میں اپنی ہوا باندھ کے رکھ
صرف تصویرِ بُتاں ہی تو نہیں زادِ سفر
ساتھ تو اپنے مرض کی بھی دوا باندھ کے رکھ
ڈھال کا کام یہ دیتا ہے لڑائی میں نسیم
روبرو بیوی کے تُو سر پہ توا باندھ کے رکھ
(نسیم سحر)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تو برداشت کی تمام سلیں ٹوٹ گئیں۔ نوکرانی کو بھی گالیاں دے کر باہر نکالا اور میاں جی کو بھی ہزار صلواتیں سنائیں۔

اور حیرت اس بات پر ہوئی کہ میری باتیں سن کر وہ ڈر سے گئے یا ہر شریف ڈرپوک بھی ہوتا ہے؟ تجربہ نے یہ بتایا کہ جب شادی کو پچاس سال ہو جائیں تو بیوی کو کبھی کبھی اپنے شوہر پر غرانا چاہیے۔ اس سے وہ ٹھیک ٹھیک چلتا ہے...... اور یہ ہی اصل نسخہ ہے جس کو استعمال کرنے سے پہلے ہر بہن سو روپے کا منی آرڈر ضرور بھیجے ہمارے نام، ورنہ کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

☆☆

غصہ

عالیہ آپا اپنے گھر جا چکی ہیں۔

میرے میاں میرے برابر کھڑے کچھ سوچ رہے ہیں۔ اور میں غصے سے بے حال ہوں...... سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کروں......!

ویسے بھی اس معاملے میں سارا قصور عالیہ آپا کے میاں کا تھا۔ انھوں نے پچھلی عید کو (شاید لاڈ میں آ کر) اپنی بیگم کو پیلی سینڈل ایسی مضبوط دلا دی تھی کہ پاؤں اس سینڈل میں پھنسے یوں نظر آتے تھے جیسے بیڑیوں میں کسے ہوں۔ اور وہ جب بھی ہمارے ہاں آتیں وہی سینڈل پہن کر آتیں۔

مجھے یاد تھا کہ اس سینڈل کے ساتھ کا سوٹ کب کا غارت ہو چکا تھا۔ مگر وہ میچنگ کا خیال کیے بغیر ہر سوٹ پر خوب دھڑلے سے اپنے کالے بھجنگ پیروں میں وہی سینڈل پہن کر آتیں۔

وہ جب تک ہمارے ہاں رہتی...... وہ سینڈل میرے اعصاب پر بری طرح برستی رہتیں......!

میں نفاست پسند طبیعت کی مالک چہرے کے ساتھ ساتھ پیروں کی صفائی اور چپلوں کی مناسبت کا خیال رکھتی اور وہ اس ٹائپ کی عورت تھیں کہ پیر دھونا کبھی ضروری نہیں سمجھا۔ نہانے میں خود ہی پانی پڑ جاتا ہوگا تو دوسری بات ہے مگر ان کو قصداً انہیں دھویا گیا ہوگا۔

ایک شام وہ ہمارے ہاں بیٹھی اپنی ہیل کی نوک سے میرے قالین کا رواں نوچ رہی تھیں کہ یکدم سینڈل کا تلوا نکل گیا۔

''ہائے میری سینڈل ٹوٹ گئی۔'' وہ بری طرح پریشان ہوگئیں اور میرا خوشی کے مارے برا حال تھا۔

''اللہ مجھے ننگے پیر گھر جانا پڑے گا۔'' وہ بدحواس ہو کر بولیں۔

''کوئی بات نہیں...... آپ کا گھر کون سا دور ہے۔ صرف چار گلیاں چھوڑ کر ہی تو ہے۔'' مجھے مزہ آیا کہ ان کے پیروں میں کانٹے چبھتے ہوئے گھر جائیں!

''بھابی! آپ سلمٰی کی چپل پہن لیں۔'' مجھے اپنے میاں کی ہمدردی اس وقت بری طرح کھلی مگر ان کا جواب اس سے زیادہ سوا تھا جو ہنستے ہوئے کہہ رہی تھیں!

''ارے بھائی صاحب...... سلمٰی کے پیر تو چھپکلی کی طرح سوکھے ہوئے ہیں۔ ان کے مدقوق پیروں میں سینڈل بھی غرارہ سی ہو جاتی ہے۔ پیروں میں گداز اور تناؤ تو ہے ہی نہیں ذرا برابر کی بھی نسوانیت ان کے پیروں میں نہیں ہے۔ ان کے تو بچکانہ سائز کی چپل آتی ہوگی۔ کس قدر چھوٹے چھوٹے سے پیر ہیں...... نرے بونے سے......! ہاں' آپ اپنی چپل دے دیں...... گھر جا کر بچے کے ہاتھ بھجوا دوں گے......!'' اپنے برابر ننگے پیر کھڑے میاں صاحب پر مجھے اس قدر غصہ آرہا ہے کہ کیا بتاؤں؟

○○○

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پانی بند رہے گا

ابنِ انشاء

ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد کے باشندوں کو مژدہ ہو کہ جمعے اور ہفتے کو ان کے گھروں کا پانی بند رہا کرے گا۔ یہ سہولت روزانہ تئیس گھنٹے پانی بند رہنے کی سہولت کے علاوہ ہے۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے فی الحال ہفتے میں دو دن سے زیادہ پانی مکمل طور پر بند رکھنا ممکن نہیں۔ ناغے کے دنوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھائی جائے گی۔ اُمید کی جاتی ہے کہ ماہِ محرم کی آمد تک ہفتے کے ساتوں دن پانی بند رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ بلدیہ کراچی اور کے ڈی اے نہایت مسرت سے اعلان کرتی ہیں کہ اہلِ ناظم آباد کے ایک دیرینہ مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے اس علاقے کے واٹر ٹیکس میں فوری طور پر تین سو فی صد اضافہ کیا جا رہا ہے۔ آگے چل کر اس میں اور بھی اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن کے ڈی اے اور بلدیہ کے روز افزوں وسائل اور محدود اخراجات کو دیکھتے ہوئے فی الحال اس کی قطعی طور پر ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

علامہ اقبال ٹاؤن نارتھ ناظم آباد کے پارک میں کامیاب تجربے کے بعد شہر کے دوسرے پارکوں کا پانی بھی بند کیا جا رہا ہے تاکہ زمین بھربھری ہو جائے اور کتے آسانی سے اس میں لوٹ لگا سکیں۔

بس مسافروں کے لیے مژدہ

کراچی میں ملک ایسوسی ایشن بڑے فخر اور مسرت سے اعلان کرتی ہے کہ آج سے شہر میں تمام بسوں کے کرائے دُگنے کر دیے گئے ہیں۔ اُمید ہے محبِّ وطن حلقوں میں اس فیصلے کا عام طور پر خیر مقدم کیا جائے گا۔ کیونکہ اس سے بس مالکان کی آمدنی پر ہی نہیں، مسافروں کے معیارِ زندگی پر بھی خوشگوار اثر پڑے گا۔

ایسوسی ایشن ہذا، کرایوں میں اضافے کے علاوہ مسافروں کے لیے کچھ اور سہولتوں کا بھی اعلان کرتی ہے۔ مثلاً ہر بس میں جہاں فقط چالیس سواریوں کی گنجائش ہوتی تھی، اب اس سے تین گنا مسافروں کو جگہ دی جایا کرے گی۔ اس مقصد سے ہر بس کی چھت میں کنڈوں اور تسموں کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور سیٹیں نکال دی گئی ہیں جو خواہ مخواہ کھڑے ہونے والوں کے گھٹنوں سے ٹکراتی تھیں۔

پبلک کی مزید آسانی کے لیے ہر بس کی چھت پر، پائیدانوں پر، مڈگارڈوں پر، انجن پر حتیٰ کہ سائلنسر تک پر مسافروں کے بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی گنجائش نکالی گئی ہے۔ ان خصوصی جگہوں کا کرایہ بھی کچھ زائد نہیں ہوگا۔ شرحِ ٹکٹ وہی رہے گی جو اندر بیٹھنے کی یعنی کھڑے ہونے اور لٹکنے والے مسافروں سے وصول کی جائے گی۔ آیندہ سے سب مسافروں کے حقوق بھی مساوی ہوں گے۔ یعنی ہر مسافر کو بس کو دھکا لگانے کا یکساں حق ہوگا حتیٰ کہ آدھا ٹکٹ لینے والے بچوں اور بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے معذوروں کو بھی۔ بسوں میں یتیم خانوں کے لیے چندہ اکٹھا کرنے والوں اور کھٹی میٹھی گولیاں بیچنے والوں کو بھی یہ حق دینے پر اس میٹنگ میں غور کیا جا رہا ہے جو کراچی ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کمشنر صاحب کے دفتر میں اگلے ہفتے ہو رہی ہے۔

(چند غیر ضروری اعلانات)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کلام شوخ و شنگ

یہ رہا معروف و مقبول مزاحیہ شاعری سے ایک محتاط سا انتخاب تا کہ آپ یوں مسکرائیں کہ دل کی کلی کھل اُٹھے

دردِ دل

دل کی بیماری کے اک ماہر سے پوچھا میں نے کل
یہ مرض لگتا ہے کیوں کر آدمی کی جان کو
ڈاکٹر صاحب نے فرمایا توقف کے بغیر
"دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو"

فطرت ثانیہ

بھولے سے ہو گئی ہے اگرچہ یہ اس سے بات
ایسی نہیں یہ بات جسے بھول جائیے
ہے کس بلا کا فوٹو گرافر ستم ظریف
میت سے کہہ رہا ہے ذرا مسکرائیے

اَن بیان ایبل

اپنی عادت، اپنا شیوہ یہی ہے ایک زمانے سے
اس نے کہا میں لیڈر ہوں اور ہم نے لیڈر مان لیا
اب اس ضمن میں حال ہمارا ناگفتہ ہی بہتر ہے
آخر واٹر کولر کو بھی ہم نے رہبر مان لیا

انور مسعود

پیار محبت

محبت ماں سے، اور بیوی سے جس کو پیار ہوتا ہے
گزارہ ایسے شوہر کا بہت دشوار ہوتا ہے
محبت کا مزا ہوتا ہے شادی کے ارادے تک
پھر اس کے بعد جو ہوتا ہے سب بے کار ہوتا ہے

عشق کے ٹوکرے

کیوں پریشان ہوتے ہو زوال کے اسباب پر
میں بتاتا ہوں تمھیں یہ آج کل کے چھوکرے
اپنے بستے میں کتابوں کی جگہ لاتے ہیں کیا
اک سیاست کا کریٹ اور عشق کے دو ٹوکرے

کالج کا معیار

پروفیسر بھی جب آتے ہوں ہفتہ وار کالج میں
تو اونچا کیوں نہ ہو تعلیم کا معیار کالج میں
مجھے ڈر ہے کہ ہم دونوں کہیں سمدھی نہ بن جائیں
تری گلنار کالج میں میرا گلزار کالج میں

بیمار

اک ڈاکٹر مریض کو سمجھا رہا تھا یوں
کرتا ہے میرے کام کو دشوار کس لیے
پیسے نہ تھے علاج کے گر تیری جیب میں
پھر یہ بتا ہوا ہے تو بیمار کس لیے

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

شعلہ

یوں تو خاصی دیر میں جا کر عشق کا شعلہ بھڑکا ہے
چھوٹی عمر میں شادی کے نقصان کا پھر بھی دھڑکا ہے
دلہا اور دلہن کی عمریں پوچھیں تو معلوم ہوا
پچپن سال کی لڑکی ہے اور ساٹھ سال کا لڑکا ہے

ٹھیک نہیں ہے

ایسا جینا ٹھیک نہیں ہے
قرض کی پینا ٹھیک نہیں ہے
عقل سبھی کی کہتی ہے یہ
عشق کمینہ ٹھیک نہیں ہے
بندہ درزی ہو جاتا ہے
کپڑے سینا ٹھیک نہیں ہے
کہنا ہے جو منہ پر کہہ دو
دل میں کینہ ٹھیک نہیں ہے
مرچ مسالا پورا دو
صرف پودینہ ٹھیک نہیں ہے
بہتر تھا وہ مانگ ہی لیتے
دل جو چھینا ٹھیک نہیں ہے
شادی کام دسمبر کا ہے
جون مہینا ٹھیک نہیں ہے

(رشید ارشد، وہاڑی)

دیوان

رات ہم اک شاعرِ اعظم کے گھر ملنے گئے
بادلِ نخواستہ کھانا اسے چکھنا پڑا
جو بھی دستر خوان پر تھا کھا کے ہم فارغ ہوئے
پھر ہمیں دیوان اس کا صبح تک سننا پڑا

ضیاء الحق قاسمی

رشتہ

وفا کے بدلے جفا کروں گا
تو کیا کرے گی میں کیا کروں گا
اگر ہے منظور ایسا رشتہ
تو آ میں تجھ سے بیاہ کروں گا

بشریٰ رحمن

فیملی پلاننگ

اے مرے بچے مرے لختِ جگر پیدا نہ ہو
یاد رکھ پچھتائے گا تو میرے گھر پیدا نہ ہو
تجھ کو پیدائش کا حق تو ہے مگر پیدا نہ ہو
میں ترا احسان مانوں گا اگر پیدا نہ ہو
ہم نے یہ مانا کہ پیدا ہوگیا، کھائے گا کیا
گھر میں دانے ہی نہ پائے گا تو بھنوائے گا کیا
اس نکھٹو باپ سے مانگے گا کیا پائے گا کیا
دیکھ کہنا مان لے جانِ پدر پیدا نہ ہو
یوں ہی تیرے بھائی بہنوں کی ہے گھر میں ریل پیل
بلبلاتے پھر رہے ہیں ہر طرف جو بے نکیل
میرے گھ کے ان چراغوں کو میسر کب ہے تیل
بجھ کے رہ جائے گا تو بھی بھول کر پیدا نہ ہو
پالتے ہیں ناز سے کچھ لوگ کتے بلیاں
دودھ وہ جتنا پئیں اور کھائیں جتنی روٹیاں
یہ فراغت اے مرے بچے مجھے حاصل کہاں
ان کے گھر پیدا ہو اور بن کر بشر پیدا نہ ہو

(شوکت تھانوی)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

خوفِ خدا رکھنے والے توجہ فرمائیں

200 یتیم بچوں کے لئے گرم بستروں اور کپڑوں کی شدید سردی میں فوری ضرورت ہے۔

عطیات صدقات اور زکوٰۃ کا بہترین مصرف ہے۔ صدقہ ہر بلا کو ٹال دیتا ہے۔

آن لائن اکاؤنٹ: الائیڈ بینک 0531-0010018634560012

مفتی محمد وحید قادری
ناظم اعلیٰ رضویہ ٹرسٹ (قائم شدہ 1985)
سنٹرل کمرشل مارکیٹ ماڈل ٹاؤن لاہور

0300-0515101
03234393422
فیکس نمبر 042-35855537
email: info@rizviatrust.com site: riziatrust.com

نوٹ: رضویہ ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کو دیے جانے والے عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

کیا شدید ترین غصہ کی حالت میں طلاق ہو جاتی ہے؟

شیخ القرآن والحدیث ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادریؒ (پی۔ایچ۔ڈی۔ سابق سینئر مشیر وفاقی شرعی عدالت حکومت پاکستان) کی تحقیقی کتاب ''شدید غصہ کی طلاق کا شرعی حکم'' انتہائی خوبصورت گیٹ اپ میں شائع ہوگئی ہے۔ یہ کتاب طلاق کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی سطح کا مکالہ بھی ہے۔ یہ کتاب ہر گھر اور لائبریری کی ضرورت ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ہزاروں گھر آباد ہو چکے ہیں۔ نیز قرآن وسنت کی روشنی میں اپنے سوالوں کے جوابات بھی آن لائن پوچھیں۔

ملنے کا پتہ: دارالافتاء جامعہ رضویہ ٹرسٹ (رجسٹرڈ 1985ء) خانقاہ نوریہ قادریہ سنٹرل کمرشل مارکیٹ ماڈل ٹاؤن لاہور۔
042-35855537 / 0300-0515101 rizviatrust@yahoo.com

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

وزن کم کریں صحت نہیں

کچھ عرصہ پہلے میرے پاس ایک بہت رکھ رکھاؤ والی خاتون آئیں، پلان لکھوایا اور چلی گئیں۔ ٹھیک ڈیڑھ دو ماہ بعد ایک خاتون اور تشریف لائیں۔ کھلے پائنچوں والا پاجامہ لانگ شرٹ بڑے سے گلاسز بہت سی Branded چیزیں پہن کر وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔

جب تک وہ بولی نہ تھی مجھے کوئی حیرت نہ تھی لیکن جیسے ہی وہ بولیں تو میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

”دیکھیں میڈم جی میرے کھاڑنے پینے دے پلان وچ چینا وی رکھو اور گریپ فولٹر دا جوس وی رکھو۔“

میں سوچ رہی تھی کہ یہ سب کیا ہے؟

جی یہ ایک بہت انوکھی چیز تھی کہ لمبی سی گاڑی سے اُترنے والی یہ خاتون جس نے Branded لباس پہن رکھا تھا دراصل پہلے آنے والی خاتون کی housekeeper تھی۔

”میں جی ڈیفنس چو آئی آں مسز زبیر دی جی میں ملازمت کردی آں۔

اوہ! اچھا! میں اب بہت دلچسپی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ میں بے حیران تھی کہ کیا اس طبقے کو بھی Dietrition کی لگژری افورڈ ہوجاتی ہے؟ آپ کو میرا کس نے بتایا؟ میں نے اس سے پوچھا۔

وہ جی جس دن زبیر لے کر گئیں تھیں کھاڑنے پینے دا نسخہ اُس دن میں بھی اُنہاں دے نال سی۔ میں جی بلقیس ہوں جی۔ بی بی ما۔ تو جی اس نسخے نال ٹھیک ہوگئے سن پھر وہ بڑبڑائی۔

صاحب لوگ تے پورے مہینے دا دس دیندے آں کہ کی کی پکنا اے۔ اور کھان نوں گھر تے آندے نہیں۔ (صاحب لوگ پورے مہینے کا بتا دیتے ہیں کہ کیا کیا پکنا ہے پھر پکوا کر گھر بھی اکثر نہیں آتے)

فیر جی پکا ہویا ساڈے ہی کام دا اے ناں۔ اوں جی مفت دا کھا کھا میں تے سنڈھی ہوئی پئی آں۔ (میں مفت کا کھا کھا کر موٹی ہوئی پڑی ہوں۔)

ناں میرا ویاہ ہوندا پیا ہے۔ (نہ میری شادی ہو رہی ہے) ہون ایک جگہ گل تے بنی اے پر او کہندا اے کہ تو اپنا وزن کم کرتے کُڑی کُڑی لگ۔“

(اب ایک جگہ بات تو بنی ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ تم اپنا وزن کم کر کے لڑکی لڑکی لگو۔)

مفت دا کھا کھا کے بہت موٹی ہوگئی آں ہُن تسی ڈائٹ دسو جیہڑی تُسی بیگم صاحب نوں وی دسی سی۔ (مفت کا کھا کھا بہت موٹی ہوگئی ہوں اور آپ ڈائٹ بتائیں جو آپ نے بیگم صاحبہ کو بتائی

نوشین ناز

نیوٹریشنسٹ رماہر غذائیات

دوا کو عادت مت بنائیے

پرہیز اور متوازن غذا آسان بھی ہے اور بہتر بھی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تھی۔)

وہ تو بڑے سمارٹ شمارٹ ہوندے جاندے آں۔

(وہ تو بہت سمارٹ ہو رہی ہیں۔)

پر ساری چیزاں بیگم صاحبہ والیاں دسو تا کہ میں انہاں دی چھڈی ہوئی چیزاں نال کم چلاواں (لیکن ساری چیزیں بیگم صاحبہ والی بتائیں تاکہ ان کی چھوڑی ہوئی چیزوں سے کام چلاؤں)

ایک اور فرمائش محترمہ کی طرف سے آئی تھی۔

تو تم یہ سب گھر میں ہی کر لیتی مجھے کیوں پوچھنے اور فیس دینے اتنی دور آئی؟

میں نے بمشکل اپنی مسکراہٹ دبائی تھی۔

میڈم جی ہوسکدا اے کہ او چکھ کھا پی کہ اُلٹا نقصان ہو جاندا؟ تے میں سوچیا کہ جا کر پچھ لیندی آں۔ نالے میں اپنے منگیتر نوں وی دساں گی کہ میں خراک والی ڈاکٹرنی کول گئی سی۔ (میڈم جی ہو سکتا ہے وہ چیزیں کھابی کر الٹا نقصان ہو جاتا۔ میں نے سوچا خود ہی جا کر پوچھ لیتی ہوں اور اپنے منگیتر کو بھی بتاؤں گی کہ میں خوراک پلان بتانے والی ڈاکٹرنی کے پاس گئی تھی)۔

(میڈم جی ہو سکتا ہے وہ چیزیں کھا پی کر اُلٹا نقصان ہو جاتا۔ میں نے سوچا خود ہی جا کر پوچھ لیتی ہوں اور اپنے منگیتر کو بھی بتاؤں گی کہ میں خوراک پلان بتانے والی ڈاکٹرنی کے پاس گئی تھی۔)

وہ رج کر مسکرائی تھی۔

سبحان اللہ!! میں نے با آواز بلند مسکرا کر کہا تھا۔

''تو اب آپ فرمائیں میں آپ کے لیے کیا کروں کیونکہ آپ تو پلان پر صرف میری ہاں کروانے آئی ہیں۔'' میں نے بہت تحمل سے کہا تھا۔

تسی دسو کہ اے ٹھیک اے نسخہ مسز زبیر والا میرے لئی؟

نے مسز زبیر کا پلان نکال کر میرے سامنے کر دیا۔

ال ہے وہ اپنی بیگم صاحبہ کا پلان بڑے آرام سے اُٹھا لائی تھی۔

دیکھیں وہ شوگر کی مریضہ ہیں۔تم اُن کا پلان نہ استعمال کرنا۔

میں نے فوراً منع کیا تھا۔

دیکھو نا اُن کا فزیکل ایکٹوٹی لیول مختلف ہے اُن کی اندرونی صحت مختلف ہے۔تم اگر اُن کا پلان فالو کرو گی تو اُلٹا نقصان ہو جائے گا۔

لے میں تے پہلے ای کیندی سی (لو یہ تو میں پہلے ہی کہہ رہی تھی۔)

او جی تسی فیر بدل دیو پر زیادہ چیزاں اور کھنا جیہڑی مسز زبیر لیندے آں (پر آپ زیادہ تر وہ چیزیں رکھیں جو مسز زبیر استعمال کرتی ہیں۔)

ٹھیک ہے!! میں نے پھر تحمل سے اسے دیکھا۔

وہ پلان لے کر پوری فیس دے کر جا چکی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ آگہی کہاں تک چلی گئی ہے۔ایک گھریلو ملازم طبقے کی خاتون کو بھی اندازہ ہوگیا ہے کہ کوئی غذائی ڈاکٹر بھی ہوتی ہے جس کے کہنے پر صرف غذا بدل لینے سے جسم اور وزن کو فرق پڑسکتا ہے۔

پرانے دور میں دوائیاں کہاں ہوتی تھیں۔ پیٹ درد ہوا تو سونف، الائچی اور پودینے کا قہوہ پی لیا گیا۔

بچہ بے چین ہے تو پیٹ کی مالش کر دی۔ موشن لگے ہیں تو صرف نرم غذا دے دی گئی! دوائی اور ڈاکٹر نہ تھے۔ اور مرض بھی کم تھے۔ اب دوائیاں بھی زیادہ ہیں، ڈاکٹر بھی اور مرض تو بہت ہی زیادہ ہیں۔ ایسے میں پرہیز اور پھر متوازن غذا کا استعمال ہی بہتر اور آسان ہے۔ جب محسوس ہو کہ مسئلہ زیادہ ہے تو دوائی لیں۔ کم مسئلے کے ساتھ دوائی کی ضرورت نہیں ہے اور دوائی کو عادت تو بالکل نہیں بنانا چاہیے یہ سخت نقصان دہ ہے۔ جسم کا پورا نظام تہ و بالا ہونے لگتا ہے۔ سائیڈ ایفیکٹس الگ ہیں۔ گائنی کی دوا تو سو بار سوچ کر لینی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

چاہیے۔ سالہا سال لگ جاتے ہیں اس دوا کے اثرات سے نکلنے میں۔ اب چلتے ہیں آپ کے سوالات کی جانب۔

سوال: میں ایک پریشان ماں ہوں۔ اپنی بچی کے Prolactin لیول بڑھ جانے سے۔ فوڈ پلان چاہیے تا کہ مسئلہ حل ہو۔ مسز عمران الٰہی۔ کراچی

جواب: Prolactin ایک ایسا ہارمون ہوتا ہے جو Pituitary gland میں Synthesized ہوتا ہے۔ اور اس کے بہت سے اہم کام ہیں جو یہ ادا کرتا ہے۔ یہ بریسٹ کی Development کو Stimulate کرتا ہے۔ چھاتیوں سے دودھ کی secretion اور Ovulation سے بھی تعلق رکھتا ہے۔

جن کھانوں میں امائنو (amino) ایسڈز ہوتے ہیں وہ Dopamine synthesis کو encourage کرتے ہیں۔ اس طرح کسی حد تک یہ کھانے آپ کے Prolectin لیول کو کم کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

ایسے کھانے Phenylalaning زیادہ رکھتے ہیں۔ وہ بہت اہم ہیں۔ جیسے فیٹس، انڈے، ڈیری، سویا کی چیزیں جیسے کہ سویا بین کا آٹا، Tofu اور Nuts وغیرہ۔ خاص طور پر بادام، مونگ پھلی اور اخروٹ۔

دس باداموں میں تقریباً ایک گرام Phenylalanine ہوتا ہے اور ایک ایوریج آدمی کو اس کی اتنی ہی مقدار تجویز کی جاتی ہے۔

اسی طرح جو کھانے Tyrosine اپنے اندر رکھیں وہ بہترین ہیں اور ہول ویٹ، oats Lima beans، تل اور کدو کے بیجوں میں یہ وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔

اسی طرح Yeast بھی Tyrosine اور Phenylalanine کا بہترین ذریعہ ہے۔

Pituitary ٹیومر کی نشانیوں میں نظر کا جاتے رہنا (Vision loss) ہوتی ہے۔ ہاتھوں اور پیروں کا بڑا ہونا، وزن کا گرنا وغیرہ شامل ہیں۔

ہر مرض سے لڑنا ہی پہلی اور آخری کامیابی ہے۔

جیسے جیسے یہ لیول بڑھتا ہے سر درد، اُلٹیاں اور پیریڈز کے نہ ہونے کی عام شکایات ہیں۔ Combination میڈیسن اور پرہیز اس کا بہترین علاج ہے۔

ناشتے سے پہلے گریپ فروٹ جوس + واٹر یا پھر ایک پیالہ اسٹابریز کا۔

ناشتا: ایک کینو، انڈا + سویا ملک + تین بادام۔

دس بجے: تین اخروٹ، 12 بجے، لیمن گراس کا قہوہ: 1 بجے: کالے، سفید چنے یا پھر لوبیا بوائل سلاد مکس کر کے بغیر نمک کے استعمال کریں۔ آپ دہی استعمال کر سکتی ہیں۔

2 بجے: لیمن گراس قہوہ، 3.30 بجے: دودھ + تین بادام، 4.30 بجے: بیریز یا پھر اسٹابریز کا پیالہ (درمیانہ سائز کا)

6.30 بجے: دودھ + دو اخروٹ یا ایک آلو کا دانہ

8.30 بجے شام: فش / مٹن / بیف پام سائز + سلاد + فور گرین آٹے کی روٹی + لیمن گراس قہوہ۔

جب درمیان میں بھوک لگے تو آپ 1/4 سپون Pumpkin کے بیج یا پھر ایک انڈا یا پھر مزید پام سائز فش لے سکتی ہیں۔ لیکن یہ صرف شدید ضرورت میں ہو۔

زیادہ پانی کا استعمال کریں۔ دوران نماز طویل سجدہ ادا کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے کاملہ، عاجلہ عطا فرمائے۔

سوال: میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں کھانا کھاتے ہی واش روم بھاگتی ہوں اور بار بار کھانا کھاتی ہوں۔ بہت بھوک اور کمزوری کا احساس رہتا ہے۔ اور وزن بہت بڑھ گیا ہے۔ میں غیر شادی شدہ ہوں، عمر 23 سال وزن 95 کلو اور ایکٹوٹی لیول بہت کم ہے۔ گھر میں ہر کام کے لیے ملازم ہیں۔ میں اکلوتی ہوں اس لیے بھی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کبھی کوئی خاص کام نہیں کیا۔ پلیز باجی میری مدد کریں۔

میں حکیم کی دوائی بارہا کھا چکی ہوں اُس سے مجھے قبض ہوجاتی ہے۔

میں واقعی بہت تکلیف میں ہوں۔ میری مدد کریں۔ پلیز پلیز......! (عائشہ رضوان چکوال)

جواب: عائشہ ایک گھنٹا صبح اور ایک گھنٹا شام واک کریں۔

ناشتے سے پہلے۔ سفید بدانہ انار ایک پیالی۔

8 بجے: دو چمچ اسپغول +Lowfat دہی + ایک براؤن سلائس۔

دس بجے: بدانہ انار ایک عدد، گیارہ بجے: لیمن گراس قہوہ۔ 12 بجے: دو ٹیبل سپون اسپغول کا چھلکا+ایک کیلا۔

2 بجے: ایک گلاس نیم گرم پانی، کدو کا رائتہ بنا مرچ کے یا پھر Lowfat دہی + ایک براؤن سلائس۔

4 بجے: دودھ اسکم + تین بادام، 6 بجے: انار/سیب/ایک کیلا۔ 8.30: ایک پیالی جو کا دلیہ + آدھا سیب۔

سونے سے پہلے دو سپون اسپغول کا چھلکا ضرور لیں۔ یہ پلان کم از کم دو ماہ استعمال کریں۔ ساتھ ہی وٹامن ای کی گولیاں استعمال کریں۔ نیم گرم پانی کا استعمال جاری رکھیں۔ نماز میں باقاعدگی رکھیں۔

سوال: میری عمر 21 سال ہے وزن 55 کلو ہے قد چھے فٹ ہے اور میرے بال تیزی سے گر رہے ہیں۔ قمر احمد، کراچی

جواب: آپ نماز کی باقاعدگی، طویل سجدہ پر توجہ اور زیادہ پانی پئیں۔

8 بجے: ناشتہ۔ دو کیلے +ایک گلاس دودھ۔ 10 بجے: دو کھجور +ایک گلاس دودھ۔ 12 بجے: چقندر + مولی کا سلاد + ایک پیالی + دال + روٹی + ادرک کا قہوہ۔ 2 بجے: دودھ + پانچ بادام۔ 4 بجے: تین پھلوں کی چاٹ بنا چینی کے سیرپ کے۔ 6 بجے: سیب کا جوس۔ 8.30 بجے: آپ گھر کا سالن + روٹی + مولی چقندر کا سالن + آدھی پیالی دہی + ادرک کا قہوہ لیں۔ سونے سے پہلے ایک ٹیبل سپون اسپغول کا چھلکا ضرور لیں۔

600mg وٹامن ای دن میں دو دفعہ چھے ماہ تک لیں۔ ساتھ ایک ملٹی وٹامن بھی ضرور شامل کریں۔ نماز میں سجدہ طویل کریں۔

اس ماہ کی خوشخبری میں منتہیٰ کراچی، عروہ گجرات، سکینہ بی بی فیصل آباد کو اللہ تعالیٰ نے اولاد جیسی نعمت کی خوشخبری دی ہے۔

یاد رکھیں بچے کے بعد بھی آپ کو بہت احتیاط سے غذا کا استعمال کرنا ہوگا۔

خرم علی آزاد کشمیر 126 کلو سے 119 پر آگئے ہیں۔ ایاز بٹ 103 سے 95 کلو پر آگئے ہیں۔ رضوان مجید 96 سے 83 پر آگئے ہیں۔

جویرہ 106 سے 95 پر آگئی ہیں۔ سدرہ جواد 80 سے 71 پر آگئی ہیں۔ آپ سب کو اللہ اپنی حفاظت میں رکھے۔ شکر گزاری کے لیے بھی لازم ہے کہ نماز کی باقاعدگی کم نہ ہو۔ واک کا ناغہ نہیں کرنا اور ہاں اچھا سوچنے، متوازی غذا کے استعمال اور پانی کے زیادہ استعمال کو معمول کا حصہ بنایئے۔

اندرون و بیرون ملک انٹرنیٹ کے ذریعے رابطے کے لیے کئی سوال اور SMS آئے ہیں۔ گزارش یہ ہے کہ صبح ساڑھے سات سے ساڑھے نو تک میں سبزہ زار کلینک کرتی ہوں پھر مصطفیٰ ٹاؤن چلی جاتی ہوں۔ شام کو 4 سے چھے بجے تک دوبارہ کلینک پر مریضوں کو دیکھتی اور پلان دیتی ہوں۔ پھر گھر بچوں اور میاں کو دیکھنا ہوتا ہے۔ ایسے میں انٹرنیٹ کے لیے وقت نہیں نکال پاتی۔ یونہی ممکن ہوا کالم میں ہی بتا دوں گی۔ اجازت سے پہلے اپنی آرزو دہراؤں گی کہ مجھے اور میرے اہل خانہ کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

○○○

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

چمنِ خیال

قارئین کے تبصروں، مشوروں
اور باتوں سے سجا کالم

اعزازی ڈاکٹرز۔لوگ مذاق اُڑاتے ہیں

ہمارے سیاستدان تو ماشاللہ بہت پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں جبھی تو تعلیمی میدان میں بغیر محنت کیے ہی پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بانٹی جاتی ہیں۔ ہمارے طالب علم جو کئی سال محنت کرتے ہیں اور طویل عرصے تک مواد لکھنے کے بعد جا کر کہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر پاتے ہیں۔یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے کے لیے اور کورس کے دوران طلبا کا لاکھوں روپے خرچ آتا ہے جس کے ساتھ طالب علموں کو انتھک محنت بھی کرنا پڑتی ہے جس کے بعد کہیں جا کر کامیابی ان کے قدم چومتی ہے اور وہ ڈاکٹر کہلاتے ہیں۔ کچھ سالوں سے رواج ہو چلا ہے کہ اپنے نمبر بنانے کے لیے سرکاری یونیورسٹیاں فری میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں بانٹ رہی ہیں۔ دور زرداری صاحب میں رحمٰن ملک کو کراچی یونیورسٹی نے یہ ڈگری دی تو بڑا شور ہوا تھا۔ پھر مشہور صحافیوں کو دی جانے لگیں اب وزیر اعظم نواز شریف کو گورنمنٹ یونیورسٹی لاہور نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی ہے۔ یقیناً یونیورسٹی کے پاس ٹھوس وجوہات ہوں گی مگر

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جس کام پہ لوگ مسکرائیں، مذاق اُڑائیں وہ باعث عزت نہیں رہتا۔ اعزازی ڈگری والے کل اپنے آپ کو اصل ڈاکٹر سمجھ کر نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنے بیٹھ گئے تو اور طرح کے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ (محمد فرقان۔اسلام آباد)

میری بھی ایک غزل

اس دورِ پُر آشوب میں اُردو ڈائجسٹ کا وجود کسی نعمت سے کم نہیں۔ یہ ہماری ذہنی، اخلاقی اور روحانی تربیت کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دے رہا ہے اور ذہنی و اعصابی تناؤ کو کسی قدر ختم کرنے کا باعث بھی بنتا ہے۔ آپ سب کی تحریریں چھاپتے ہیں مہربانی فرما کر میری بھی ایک غزل چھاپ دیں:

میری وحشت کا سبب پوچھو گے
اب نہیں پوچھا تو کب پوچھو گے
تم ہو اقلیمِ سخن کے وارث
تم جو پوچھو گے، غضب پوچھو گے
پہلے تو جان سے مارو گے مجھے
پھر مرا نام و نسب پوچھو گے
تم کہ آسائشِ دنیا میں مگن
عشق میں جینے کا ڈھب پوچھو گے
ذات کا کرب کسی روز بلال
مار دے گا تمھیں، تب پوچھو گے

(محمد بلال اعظم۔ساہیوال)

افسانے کا ترجمہ

دنیا کی دیگر زبانوں میں لکھے ادب کے تراجم اچھے ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے مصنفین کی سوچ اور علم کا پتا چلتا ہے۔ (اگر میں کسی افسانے کا ترجمہ کر کے بھیجوں تو چھپ سکتا ہے؟

غبار خاطر تو ہنوز نہیں پڑھی مگر مشتاق احمد یوسفی صاحب نے ایک سے زیادہ جگہ کچھ اسی طرح کی بات لکھی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنا ذکر ضرورت سے زیادہ کرتے ہیں اپنی تحریروں میں۔ اس حوالے سے آج کل بڑی دلچسپ بحث چل رہی ہے اس لیے خیال آیا۔)

(نمرہ۔ راولپنڈی)

(ضرور چھپ سکتا ہے۔ کسی نئے اور عمدہ لکھے افسانے کا انتخاب کیجیے اور بھجوایئے۔)

محض خانہ پوری

یہ گلہ ہے کہ آپ نے پرچے میں حمد ونعت کی شعری نگارشات کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی۔ دیگر ادبی اصناف بھی آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ غزلیات بھی محض خانہ پوری کے ذیل میں آتی ہیں۔ کوشش کیجیے کہ ان اصناف کو جگہ مل جایا کرے۔ (سید ریاض حسین زیدی۔ساہیوال)

زخم ہرا ہو گیا

بنگلہ دیش کی سیاسی صورت حال کے تجزیے نے سقوط ڈھاکہ کا زخم ہرا کر دیا۔ عبدالقادر مُلا کی شہادت پر آنکھوں سے زار و قطار اشک رواں ہو گئے۔ کیا میرا رب وہاں کے مسلمانوں کی بے حسی معاف کر دے گا؟ دل غم سے بوجھل ہوا جا رہا تھا۔ اُردو ڈائجسٹ نے جہاں احساسات جگا کر رُلانے کا اہتمام کیا وہیں ہنسی کا سامان بھی کر دیا۔ سفرنامہ سویڈن ہنسی کے پھول بکھیر گیا۔ یوسف اصلاحی کی تحریر نے صفحۂ قرطاس پر موتی بکھیر دیے۔ (فاطمہ طاہر۔لاہور)

غلطی

چمنِ خیال میں استادوں کا درجہ رکھنے والے جناب طاہر مسعود کا عاجزی وانکساری میں ڈوبا خط پڑھا۔ ہم تو

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

طاہر مسعود صاحب کو "آنکھ مچولی" کے حوالے سے بچپن سے جانتے ہیں۔ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے مگر جس انداز میں اُنھوں نے اپنی غلطی تسلیم کی ہے کیا، وہ قابلِ تحسین ہے۔ (رانا محمد شاہد۔ بورے والا)

افسوس کے ساتھ

نہایت افسوس کے ساتھ تحریر کر رہا ہوں کہ اُردو ڈائجسٹ کا معیار دن بدن گر رہا ہے۔ اس میں تحریری مواد کم سے کم کر کے تصویروں سے قارئین کو خوش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ فہرست مضامین پہلے صرف دو صفحات پر مشتمل ہوتی تھی جو کہ اب رنگا رنگ تصاویر کے ساتھ کم از کم پانچ صفحات پر محیط ہوتی ہے۔ کسی بھی کہانی کے عنوان کے ساتھ تقریباً ایک صفحہ پر رنگین تصویر دیکھ کر قاری کے دل میں یہ خیال آتا ہے نجانے یہ کہانی کتنی بڑی ہوگی مگر 3 یا 4 صفحہ کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہے۔ (خورشید اقبال۔ لاہور)

(آپ کی رائے ہمیں عزیز ہے اس لیے شائع بھی کر دی مگر آپ جانتے ہیں کہ ہزاروں قارئین کو یہی انداز اور ترتیب بھایا ہے۔ اس میں دُگنا نہیں تین گنا خرچ اُٹھتا ہے مگر ہماری کوشش ہے کہ آپ کے پرچے کا انداز اور پیش کش کسی بھی بہترین عالمی رسالے کے معیار سے کم نہ ہو)

ہماری اذیت بھی محسوس کریں

"ہم سانحے فراموش کرنے"...... شامل اشاعت کر کے بڑا ظلم کیا آپ نے۔ پہلی دفعہ جب خبر دیکھی تھی تو چیخیں نکل گئیں تھیں۔ آپ نے مستقل درد دے دیا۔ اچھا تو۔ کچھ ہمارے بارے میں بھی لکھیے۔ ہم بیویاں جن کے شوہر پہلے تو ایس ایم ایس پھر "موبائل پر" گھنٹوں باتیں۔ پھر ملاقاتیں اور پھر سب کچھ کرتے ہیں۔ گھر میں رکھی بیویوں کو بھول ہی جاتے ہیں۔ کچھ کہیں تو ہاتھ بھی اُٹھاتے ہیں کہ تم شک کر رہی ہو۔ میں تو کچھ بھی نہیں کرتا۔ بچے فیس نہ دینے کی صورت میں کلاس سے نکال دیے جائیں، گھر کا حلیہ ابتر رہے۔ مرمت طلب کام مہینوں پڑے رہیں۔ بیوی سو سو روپے کے اُدھار کے لیے شام گئے جاننے والوں کے ہاں گلیوں میں خوار ہو۔ اُنھیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسی خود غرضی، بے حسی پر کوئی کیا کہے۔ کبھی تو ہمیں rejection کا احساس نڈھال کیے رکھتا ہے۔ کام والی مائی سے زیادہ کی اوقات دینے کو شوہر تیار نہیں۔ اُمید ہوتی ہے کہ شاید کل، شاید پرسوں واپس آ جائیں۔

لکھنا، پڑھنا اور سمجھنا

یہ وہ ماہنامہ ہے جسے میں نے بچپن اور لڑکپن میں پڑھا اور اس سے اُردو لکھنا، پڑھنا، سمجھنا سیکھا۔ میری جانب سے اُردو ڈائجسٹ فیملی کے تمام اراکین کو سلام اور ہدیہ تبرک۔ میں چاہوں گا کہ غربت کے حوالے سے ہر ماہ باقاعدہ کچھ لکھوں اگر آپ شائع کرنا چاہیں تو خوشی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس عظیم جدوجہد میں سرخرو کرے۔ اچھا ادب ہی اچھے معاشرے کی بنیاد ہے۔ آپ ایک اچھے معاشرے کے استحکام کا باعث بن رہے ہیں (ڈاکٹر امجد ثاقب، ڈائریکٹر اخوت)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

لیکن نہیں دس بارہ سال گزر گئے۔ یہی کچھ سہتے۔

اللہ تعالیٰ نے بیٹوں کے ساتھ 2 بیٹیوں سے بھی نوازا ہے۔ اس فساد میں انھیں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ اور پھر ایک کربناک خوف کہ داماد بھی باپ کی طرح ایسے ہی ہوئے اور میری بیٹیاں میری طرح رات بھر روتی رہیں تڑپتی رہیں تو یقین کریں آنسو ہی نہیں تھمتے۔ کوئی بے بسی سی بے بسی ہے۔

دل کرتا ہے شوہر گھر لوٹ آئے۔ سال پہلے دل کا دورہ پڑا تھا۔ ہر طرح کا خیال رکھتی ہوں۔ سارا زیور بیچا، بہن بھائیوں اور ماں باپ سے پیسے مانگ کر لاتی رہی۔ اس سے زیادہ کوئی کیا کر سکتا ہے۔

میرا بھی دل کرتا ہے کہ گھر میں خوشیاں ہوں۔ نارمل گھر ہو۔ بچوں کو کیا پتا باپ کیا گل کھلا رہا ہے۔ اُنہی کی خاطر سب سہ رہی ہوں۔

اپنے قریبی لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ صبر کرو، خود ہی واپس آجائے گا۔ کوئی بڑا قدم نہ اُٹھائیے۔ گھر بچاؤ۔ مرد کو یہ مشورے کوئی کیوں نہیں دیتا؟ گھر بساتے ہیں تو نبھاتے اور سنبھالتے کیوں نہیں۔ رات بھر روتے رہو۔

ہماری اپنی حورم سلطان

میں بھی لاکھوں لوگوں کی طرح ''میرا سلطان'' بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ 260 قسطیں تو دیکھ چکی ہوں۔ پہلی بار اندازہ ہوا کہ بادشاہوں کی زندگی کوئی اتنی آسان بھی نہیں ہوتی تھی۔ خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس ڈرامے نے ہمیں ترکی کے بلند پایہ سلطان سلمان ذی شان سے متعارف کروایا۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ وہ بہت بہادر، باکمال اور نیک دل بادشاہ تھا، 50 سال کے لگ بھگ اس نے حکومت کی اور اپنی سلطنت کو تین براعظموں تک پھیلایا۔ میں ان پر لکھی ایک کتاب لائی تھی۔ اس کا نام تھا۔ ''سلمان پرشکوہ''۔ میری بیٹی نے اس کی تصویر دیکھی اور خوش ہو کر بولی ''سلطان پرشکوا سن کر بہت بے مزہ ہوئی'' پر آپ کتاب لائی ہیں۔ پاکستان کی تاریخ 47ء سے لیں یا محمد بن قاسم سے، میری خواہش اور آرزو ہے کہ ہمارے ڈرامہ نگار، پروڈیوسر اس طرف بھی توجہ دیں۔ ہماری تاریخ میں بھی بہت شاندار کردار اور واقعات ہیں جن پر سیریل بن سکتے ہیں۔ جنرل ضیاالحق مرحوم کے دور میں میری شادی ہوئی تھی تو اس زمانے میں میں نے آخری چٹان اور شاہین جیسے عظیم ناولوں پر مبنی ڈرامے دیکھے تھے۔ کاش میں اپنے بچوں کو وہ اور اس سے بھی اچھے بنے ڈرامے دکھا سکوں۔

کوئی ہماری تاریخ کی اپنی حورم سلطان بھی تو ہوگی۔ کوئی شہزادہ مصطفیٰ اور کوئی خزینہ سلمان۔ بالی صاحب، ابراہیم اور ماہِ دوراں۔ سلطان سلمان کبھی کبھی جب محبی بن کر شاعری کرتا ہے یا خود کلامی تو سچ کہوں بہت اچھا لگتا ہے۔ شاید کوئی ہمارا کردار بھی ایسے بولتا اور سوچتا ہو۔

(مسز عابدہ منہاس۔ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تڑپو، اللہ تعالیٰ سے چپکے چپکے، کبھی سسک سسک کر مانگو۔ اللہ تعالیٰ آزمائش کبھی کیوں کیے جا رہے ہیں۔

لکھیں نا۔ مجھ جیسی کتنی ہی عورتوں کو حوصلہ ملے گا جو تل تل مرتی ہیں۔ (رباب علی۔ ملتان)

والدین سے سلوک اور مکافاتِ عمل

والدین ہوں یا اولاد ان سب کی پریشانیاں اور تفکرات ایمان کے نور ہی سے اندھیروں سے اجالوں میں بدل سکتے ہیں۔ اگر آپ ایمان کے نور سے مالا مال ہیں تو دفتر ہو یا گھر یا دیارِ غیر، کہیں بھی آپ اپنے پیاروں اور بزرگ والدین کو نہیں بھلا سکتے۔ مجھے یاد ہیں جنوری 2013ء کے اُردو ڈائجسٹ میں لکھی گئی سطور۔ جو لوگ اپنے والدین کو بھول جاتے ہیں۔ میری ان سے التجا ہے کہ وہ اپنے والدین کا خیال رکھیں۔ پلیز مکافاتِ عمل کا سامنا ہو سکتا ہے اور یہ لازم ہے۔

(مسز فرحت قادر۔ سرگودھا)

آنکھیں برسنے کو تیار کیوں رہتی ہیں

میں اِدھر ڈربی میں ہی سیٹل ہوں۔ ہمارا شہر مانچسٹر اور برمنگھم کے درمیان واقع ہے جہاں سات سال سے مقیم ہوں۔ اُردو ڈائجسٹ کا انداز اور پیش کش بہت اچھی ہے۔ اس کی ہر بات دل میں اُتر جاتی ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا شبیر احمد عثمانی والی تحریر بہت اہم تھی۔ بلکہ معرکہ آرا کہنا چاہیے۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ ''گوشہ مودودی'' کی وجہ سے میں نے رسالہ لینا شروع کیا تھا۔ جن سے محبت ہوتی ہے۔ ان کا ذکر اچھا لگتا ہے۔ یہاں انگلینڈ میں اُردو ڈائجسٹ ملتا ہے تو لگتا ہے اس کے محبت سے بھرے لفظوں نے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا ہو۔ وطن سے دور تو آنکھیں ویسے ہی برسنے کو تیار رہتی ہیں۔ اپنی مٹی اور لوگ کتنے یاد آتے ہیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔

(عبدالرحمٰن باری۔ ڈربی انگلینڈ)

معمولی غلطی بھی اچھی نہیں لگتی

رسالے میں تو ایسا کوئی مواد نہیں چھپتا جس پر میں اعتراض کر سکوں۔ چونکہ آپ کے رسالے کا عقیدت مند ہوں اس لیے انسان کو اپنی محبوب چیز، شخصیت، ادارے، کی معمولی سے معمولی غلطی بھی اچھی نہیں لگتی۔ مجھے اُردو ڈائجسٹ میں لڑکیوں کی بغیر آستینوں والی تصاویر اچھی نہیں لگتیں جبکہ اس کے برعکس جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ معاشرے کی مذہبی معاشرتی، سماجی روایات کا آپ بہت خیال کرتے ہیں۔ میں اس سنجیدہ رسالے میں بہتری کی خاطر چند تجاویز دینے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں۔

(1) شعر و شاعری اور ادب کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے لیکن اِن صفحات میں تھوڑی بہت کمی کر کے معاشرے میں پھیلے ہوئے مسائل کی نشان دہی اور حل کے متعلق تحریریں شامل کریں۔

(2) مہنگائی بدامنی بے روزگاری اور ناانصافی نے لوگوں کی ٹینشن اور ڈپریشن میں کافی حد تک اضافہ کر دیا ہے جس کا جعلی پیر اور عامل فائدہ اُٹھا کر مزید دُکھوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ حل کے لیے اُردو ڈائجسٹ میں کسی ماہر نفسیات کا مستقل صفحہ ہونا چاہیے۔

(3) بیرونِ ملک سے آئی ہوئی کہانیوں کے ترجموں کے بجائے مقامی سچی کہانیوں کو ترجیح دی جائے۔

(4) ایسے طلبہ کے انٹرویو اور حالاتِ زندگی پر مبنی تحریریں ہونی چاہئیں جنھوں نے کالج، بورڈ اور یونیورسٹی میں ٹاپ کیا ہو۔

(ظاہر شاہ، صوابی۔ کے۔ پی۔ کے)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: غلام سجاد

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر نوجوانوں والی ہی ہے نا!)

ماہ جنوری میں دیے گئے اسلامی کوئز کے درست جوابات

اسلامی کوئز 1۔ (الف) 114
(ب) ایک رکوع

اسلامی کوئز 2۔ (الف) 8 رکوع
(ب) مکی

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ محمد قاسم رضا تتلے عالی گوجرانوالہ 2۔ سدرہ سحر انجم میرپور آزاد کشمیر 3۔ بشریٰ بشیر چوک قریشی روڈ کوٹ ادو 4۔ محمد عبداللہ گلزار مدینہ منڈی بہاؤالدین

درست جوابات دینے والوں کے نام

محمد قاسم رضا (گوجرانوالہ) محمد شکیل عباس مجوکہ (سرگودھا) راشد احمد بلوچ (ربوہ) عماد انور (راولپنڈی) مشفق ابرار (راولپنڈی) حاکم علی (راولپنڈی) عدیل ضیاء چوہدری (گوجرانوالہ) صدف ضیاء (گوجرانوالہ) محمد فرحان اشرف (بہاولنگر) ارسلان اشرف (بہاولنگر) سدرہ سحر انجم (میرپور آزاد کشمیر) منیر احمد (حیدرآباد) ایاز عقیل (حیدرآباد) مرزا اسلام بیگ (حیدرآباد) محمد یٰسین (حیدرآباد) اقبال سلیم (حیدرآباد) توصیف احمد (حیدرآباد) بشریٰ بشیر (کوٹ ادو) مسلم خان (ملاکنڈ) خورشید (ملاکنڈ) اشتیاق احمد (ملاکنڈ) مریم فاروق قریشی (کراچی) علی اختر (چاہ شورہ) حافظ احمد رضا (فیصل آباد) آمنہ امتیاز (سیالکوٹ) شمسی امتیاز (سیالکوٹ) وسیم رحمٰن (اسلام آباد) مدیحہ حسن (اسلام آباد) مریم حسن (اسلام آباد) محمد عبداللہ (منڈی بہاؤالدین) افضال حسین (گجرات) حافظ سعد عبداللہ (ہری پور) قمر عباس (ٹوبہ ٹیک سنگھ) امین احمد (ہری پور) طاہرہ عنایت (پشاور) نگہت [illegible] (پشاور) حافظ [illegible] (اوکاڑہ) [illegible] احمد (رحیم یار خان) فرقان احمد [illegible] رشید [illegible] (گوجرانوالہ) شیخ [illegible] (فیصل آباد) نبیلہ (لاہور) محسن حبیب (فیصل آباد) [illegible] (سرگودھا) انجم جاوید (کروڑ لعل عیسن) [illegible] (کراچی) عاصم [illegible] (لاہور) محمد یوسف [illegible] (حافظ آباد)

اسلامی کوئز 1

قرآن مجید کی 106ویں سورت۔ چونکہ آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت ابرہہ اور اس کے لشکر کا انجام تمام قریش اور اہل عرب کو معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنے گھر کو بچایا۔ اس وجہ سے ملک بھر میں قریش کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ وہ بلا خوف و خطر عرب کے ہر حصہ میں اپنے تجارتی قافلے لے جاتے اور کوئی بھی ان سے الجھنے کی جرأت تک نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس سورۃ میں اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان چار مختصر آیتوں میں بتایا ہے کہ جب اہل مکہ یہ جانتے ہیں کہ یہ اللہ کا گھر ہے نیز یہ کہ اس نے اس گھر کے طفیل امن عطا کیا ہے اور ان کی تجارتیں فروغ پا رہی ہیں۔ مزید یہ کہ بھوک ننگ سے بچا کر خوشحالی عطا کی ہوئی ہے، تو پھر ان کو چاہیے کہ اللہ ہی کی عبادت کریں اور بتوں کی پرستش سے باز آئیں۔

الف۔ اس سورۃ کے کتنے رکوع ہیں؟
ب۔ یہ سورۃ مکی ہے یا مدنی؟

اسلامی کوئز 2

یہودیوں کا ایک قبیلہ جس نے مدینہ کے ایک اطراف میں قلعے بنائے تھے۔ نبی کریمؐ نے مدینہ میں ریاستی نظام قائم کرتے وقت یہودیوں کے جن قبائل سے صلح و امن کے معاہدے کیے تھے ان میں یہ قبیلہ بھی شامل تھا۔ یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر کی جلاوطنی کے وقت دوبارہ معاہدہ کیا گیا لیکن جنگ خندق میں مسلمانوں پر ہر طرف سے کفار کے زور کو دیکھ کر معاہدہ توڑ دیا اور جس قلعے میں مسلمان عورتیں اور بچے محفوظ تھے اس پر حملہ کر دیا۔ جنگ خندق کے بعد نبی کریمؐ خود تین ہزار کا لشکر لے کر روانہ ہوئے اور اس قبیلے کا محاصرہ کیا۔ طویل محاصرہ سے تنگ آ کر یہودیوں نے صلح کی پیش کش کی اور حضرت سعد بن معاذؓ کو ثالث بنانے کی تجویز دی۔ حضرت سعد بن معاذؓ کے فیصلے کے بعد اس قبیلے نے مسلمانوں کی اطاعت اختیار کر لی۔

الف۔ کس قبیلے کا ذکر ہے؟
ب۔ اس قبیلے کے سردار کا نام کیا تھا؟

انعامات کے لیے تعاون
اسلامک پبلی کیشنز
منصورہ ملتان روڈ لاہور
تحریک اسلامی سے متعلق اور سید مولانا مودودیؒ کا تحریر کردہ لٹریچر ہماری پہلی ترجیح ہے۔

نوٹ: تمام قارئین اپنا نام و پتا جس پر TCS پہنچ سکے لازماً لکھیں۔ اپنا موبائل نمبر یا پی ٹی سی ایل نمبر بھی لکھیں۔ (مدیر اُردو ڈائجسٹ)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

درِ دل پہ دستک

اختر عباس

urdudigest.pk

akhterabas@ymail.com

معاشرتی زندگی کی پھٹی چادر رفو کرنے والے

یہ مسلسل پانچواں موقع تھا۔ اصغر رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ پورے دن میں وہ صبح صرف ایک ہی بار گھر سے باہر جاتا تھا۔ تب ابو آفس کی تیاری کر رہے ہوتے میں ایس ای کالج بہاولپور، چھوٹا بھائی صادق پبلک اسکول اور بہنیں سیٹلائٹ ٹاؤن میں واقع اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہی ہوتیں تو ایسے میں وحدت کالونی اور سیٹلائٹ ٹاؤن کے سنگم پر واقع چوک سے اسے صرف دہی اور چنے لانے ہوتے تھے۔ قریباً بغیر گھی کے پکے ہوئے نرم چنوں کے ساتھ کٹی سبز مرچیں بھی ملتی تھیں یہ سب ایک لفافے میں ڈال کر چنے ریڑھی والا اشرف ایک مسکراہٹ کے ساتھ گاہک کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ پہلے یہ فرض میرے ذمہ تھا۔ کبھی پیدل اور کبھی سائیکل پر میں یہاں سے لے کر جاتا۔ ہمارا گھر وحدت کالونی کی اس لائن میں تھا جس میں کل 5 گھر تھے، یہ نسبتاً بڑے اور کھلے تھے۔ تب تک والدہ انڈوں کا آملیٹ اور پراٹھے تیار کر چکی ہوتیں اور پھر اپنی باری پر سبھی ناشتا کرتے جاتے اور رخصت ہوتے جاتے۔

اصغر کو ہمارے گھر میں آئے ہوئے پہلا ہی ہفتہ تھا۔ فیصل آباد سے اس کا والد طارق اسے ہمارے گھر چھوڑ گیا تھا جہاں اس کی اہلیہ کئی بچوں کو بلکتا چھوڑ کر دنیا سے اچانک رخصت ہوگئی تھی۔ ابو امی کی خدا ترسی ہی تھی کہ جس کے باعث انھوں نے بچے کو پالنے کی حامی بھری تھی۔ ہمارے گھر میں الگ سے نوکر یا ملازم کی ضرورت کم ہی رہی، باہر کے کاموں کے لیے ابو کے آفس سے کوئی نہ کوئی آ کر کر جاتا اور گھر میں کام کے لیے والدہ کا ہاتھ بٹانے کے لیے بہنیں موجود تھیں۔ صفائی والی مائی الگ سے آتی تھی۔ ایسے میں کبھی اصغر کے لیے کسی سرکاری محکمے میں نئی آسامی پیدا کرنے جیسی مشکل سے دوچار تھے۔ دو چار دنوں میں ہی اس کا مزاج اور انداز سامنے آگئے تھے اور انھیں سمجھنا زیادہ مشکل نہ تھا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اسے صفائی کا بے حد شوق تھا۔ پرس، دراز، تکیے کے نیچے، کپڑوں کی جیبوں کپ یا گلاس میں رکھی ریزگاری وہ کہیں سے بھی سونگھ لیتا اور پھر بڑی سہولت کے ساتھ نکال لیتا۔ ایسے مواقع پہ افسوس اور غصہ غالب ہوتا ہے اور ہاتھ کی صفائی کی داد دینے کا خیال کم ہی آتا ہے۔ مجھے اپنی حیرت البتہ اچھی طرح یاد ہے کہ مال مسروقہ کی برآمدگی کے سنہری موقع پر اسے کسی نے کچھ نہ کہا، ہاتھوں میں البتہ کھجلی ضرور ہوتی رہی مگر ابو امی دونوں غصہ پی گئے۔ خدانخواستہ کسی اور کے ہاتھوں ایسی غلطی سرزد ہوئی ہوتی تو نتیجہ اچھا خاصا مختلف ہوتا۔

ایک روز رات گئے جب سب اکٹھے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک اصغر کے معمولات کا تذکرہ شروع ہوگیا۔ وہ برآمدے میں بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ ابو جی نے اپنی اکلوتی چپاتی کا کوٹہ پورا کیا اور بولے: ''حضرت ابوہریرہؓ بھی خوب صحابی تھے۔ ہم جیسوں کا کام آسان بھی کر گئے اور مشکل بھی۔ پھر خود ہی وضاحت کرنے لگے، حدیث کی چھے کتابوں میں سے ایک ابن ماجہ ہے اس میں لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا مسلمانوں میں سے بہتر گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس سے اچھا سلوک کیا جا رہا ہو، اور مسلمانوں میں بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ بُرا سلوک کیا جا رہا ہو۔'' یہ سن کر بھی خاموش تھے، کیونکہ جانتے تھے کہ ابو کا ارادہ تو اصغر کو گھر لا کر ثواب کمانے کا تھا مگر وہ چند دنوں ہی میں باقاعدہ آزمائش بن گیا تھا۔ اگلے روز وہ صبح ناشتے کا سامان لے کر پہنچا تو لفافہ آدھا تھا۔ بھلے مانس نے راستے میں سوراخ کیا اور ڈیک لگا کر پی گیا۔ گھر پہنچا تو بے جی کی نگاہ سے یہ حرکت بچ نہ پائی۔ انھوں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ہم سارے بہن بھائی اس ڈانٹ سے سہم سے گئے مگر زیادہ افسوس اس وقت ہوا جب ہم لوگوں نے اپنے طور پر اسے سمجھانے کی کوشش کی اور اس سے کسی طرح کی معذرت یا معافی کی کیفیت بھرے جملے سننے کی آرزو بری طرح ناکام ہوئی۔ یقیناً ایسا کرنے کے اس کے پاس مضبوط دلائل ہوں گے۔ انسان چھوٹا ہو یا بڑا اپنی ہر غلطی کے جواز کے لیے اس کے پاس وجوہات کی کبھی کمی نہیں ہوتی۔ اصغر بھی اس معاملے میں خودکفیل تھا تبھی تو ہر آنے والے دن کوئی نہ کوئی نیا شگوفہ کھلتا رہا۔ چند ہفتوں کے اندر ایسا لگنے لگا کہ اذیت اور پریشانی کا دریا ہے اور ہم سب اس میں غوطے کھا رہے ہیں۔ ٹیلی فون تب تھے نہیں، خدا جانے فیصل آباد کیسے اطلاع جا پہنچی۔ ایک روز طارق اچانک گھر پہنچ گئے۔ ابو نے انھیں خط لکھ کر بلوایا تھا۔ نہ نہ کرتے بھی بے جی نے اصغر کے کارناموں کی جھلکیاں دکھانی شروع کیں تو ہم اپنی اپنی جگہ یوں شرمندہ ہو رہے تھے کہ جیسے ہم ہی براہ راست قصوروار ہیں۔ فیصلہ ہوا کہ وہ کل جاتے ہوئے اصغر کو ساتھ لے جائیں گے۔ کسی یتیم کو پالنے کا ہمارا وہ تجربہ بری طرح ناکام ہوگیا اور پھر سالوں دوبارہ حوصلہ نہیں پڑا۔ حالانکہ جانتے تھے کہ یتیم بچے کے سر پر ہاتھ رکھنے سے جتنے بال ہاتھ کے نیچے آتے ہیں، اجر و ثواب اس سے بھی کہیں زیادہ ملتا ہے۔ آنے والے سالوں میں طالب بھائی کی وفات نے ابو کو اجر و ثواب کا یہ موقع دے دیا، انھوں نے اپنے آخری سانسوں تک ان کی بچیوں کو اپنے سایہ میں رکھا۔ اللہ ان سے بہت راضی ہو۔ دھیمے مزاج کے وہ بہت

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بے غرض مہربان اور دیالو باپ تھے۔

8ربیع الاول جسے اب یوم یتامیٰ کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے مجھے برسوں بعد اصغر یاد آیا۔ خدا جانے کہاں ہوگا۔ ہم جناب امجد اسلام امجد کو ان کے گھر سے لے کر جب یتیم بچوں کے لیے منعقد کی گئی واک میں شرکت کرنے کے لیے جیل روڈ پر واقع ریس کورس پارک جو اپنے خاموش طبع اور باکمال محسن جنرل غلام جیلانی کے نام پر جیلانی پارک کہلانے لگا ہے کے گیٹ پر اترے تو میں نے عبدالشکور صاحب کی طرف دیکھ کر کہا'' آپ بھی خوب ہیں، جس کام کے پیچھے لگتے ہیں۔ اس کے لیے پورا ماحول تیار کر دیتے ہیں۔ چند سال پہلے الخدمت فاؤنڈیشن کے سیکریٹری بنے تو ایمبیسڈر ہوٹل میں پریس کے سامنے پہلی تقریب رونمائی میں اپنے صدر جناب ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن سے متعارف کرواتے ہوئے بولے'' ہم نے آنے والے سالوں میں خدمت کے 7 میدان چنے ہیں اور ان میں ایک یتیم بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا ہے۔ چونکہ یہ کام اللہ کے رسول ﷺ کو بے حد عزیز تھا۔ پھر انھوں نے صحیح بخاری کا حوالہ دیا:

''جو شخص اپنے یا کسی اور کے یتیم کی کفالت کرے گا، وہ جنت میں میرے ساتھ رہے گا۔'' آپ ﷺ نے کلمہ کی انگلی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ فرمایا اور دونوں کے درمیان ذرا سا فاصلہ رکھا۔ ان چند سالوں میں انھوں نے اٹک، مری، شیخوپورہ اور گوجرانوالہ میں ''الخدمت آغوش'' کے نام سے یتیم بچوں کی پرورش کے لیے بہت عمدہ مراکز تعمیر کر دیے ہیں۔

واک کے شرکاء اس دوران پی ایچ اے کے دفاتر عبور کر رہے تھے۔ ہم پھر گاڑی میں بیٹھے اور کچھ ہی دور جا کر واک کو جا لیا۔ اپوا کالج کے سامنے پہنچتے پہنچتے آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ طے ہو چکا تھا کہ چلڈرن کمپلیکس جانے کے بجائے یہیں میڈیا سے بات کر لی جائے۔

کوئی مانے نہ مانے، کبھی جس کام اور پیغام کے لیے جلوس نکالے جاتے تھے نعرے لگا لگا کر گلے خشک ہو جاتے تھے۔ بیچاری پولیس کو الگ ڈنڈے استعمال کرنے کی زحمت ہوتی تھی، اب سیدھی سیدھی واک کریں۔ شریفانہ، بے ضرر قسم کی ریلی نکالیے، ہاں اس کی حاضری اتنی کر لیں کہ کیمرے کا پیٹ نہیں منہ بھر جائے۔ میڈیا والے مائیک لے کر آجائیں گے اور اخبار والے قلم پنسل۔ دو چار ایسی باتیں کہیے کہ خبر کی سرخی بن جائے، ٹی وی کے ٹکر کا مضمون ہو جائے۔ دو چار اہم لوگ ہوئے تو خبرنامے کی کسی نکڑ میں کلپنگ بھی لگ جائے گی۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری، رنگ بھی ٹھیک ٹھاک آجاتا ہے۔

واک سے واپسی پر Read ریڈ فاؤنڈیشن کے جناب محمود احمد مجھے بہت یاد آئے۔ جنھوں نے آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے چار ہزار سے زائد یتیم بچوں کے لیے اپنے اداروں کے دروازے یوں کھول دیے جیسے کوئی سگی اولاد کے لیے کھولتا ہے۔ مجھے 7-2006 میں اسلام آباد میں ان کے ہیڈ آفس بیٹھ کر ایک سال تک برطانوی ادارے FCO (فارن این کامن ویلتھ آفس) کے یوتھ لیڈرشپ پراجیکٹ کی سربراہی اور 300 بچوں کی ایک سال تک لیڈرشپ ٹریننگ کا موقع ملا تو میرا احساس تھا کہ ریڈ کے اسکولوں

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کی کامیابی اور زیرِ تعلیم باسٹھ ہزار سے زائد بچوں کی تعلیم میں خیر و برکت انہی یتیم بچوں کی محبت بھری پرورش کے باعث ہے۔ باٹا پاکستان سے خصوصی اسکول شوز بنتے۔ ان کی کتابوں، سٹیشنری اور یونیفارم کے پیکٹ بنتے۔ اس سے پہلے کئی ماہ قبل کتنے ہی کارکنان جناب شاہد رفیق اور مظہر بھائی کی زیرِ نگرانی ان بچوں کے کپڑوں اور جوتوں کے سائز جمع کرتے۔ پھر مطلوبہ کپڑے اور چیزیں یوں تیار ہوتیں جیسے وہ وی وی آئی پی ہوں۔ ایک پوری ٹیم ایک ایک اسکول جا کر ایک ایک بچے کو ان کے کپڑے اور جوتے پہنا کر آتی۔ اپنے بچپن میں فرضی یتیم خانوں کی خبریں اور گھر گھر جا کر یتیموں کے لیے مانگنے والے کالے ملیشیا والے جعلی رضا کاروں کو چندہ مانگنے والے ہم نے بہت دیکھ رکھے تھے۔ خاموشی اور اس قدر محبت سے کام کرنے والے دیکھے خانہ دل آباد و شاد ہو گیا۔

کالم لکھنے کے دوران اسلام آباد میں چیریٹی کے ایک اور بہت بڑے ادارے Helping Hand کے عابد بخاری سے بات ہوئی۔ وہ بتا رہے تھے کہ ریڈ کے پاس اب آرفن بچوں کی تعداد آٹھ ہزار سے بڑھ گئی ہے۔ پانچ ہزار کو ہیلپنگ ہینڈ الگ سے سپانسر کر رہا ہے جبکہ چار ہزار یتیم بچوں کو ان کے گھروں پر ہی الخدمت فاؤنڈیشن نے گود لے رکھا ہے۔ اس طرح غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ، ایس او ایس، روشنی، ایدھی، کتنے ہی ادارے اور ہیں جو اس نازک کام کو پوری تندہی اور سلیقے سے کر رہے ہیں۔ اسے ایک مسلم معاشرے کا اعزاز ہی کہیے کہ والدین کا سایہ اُٹھنے کے بعد بے دست و پا اور بے آسرا ہو جانے والے ہزاروں نہیں لاکھوں بچوں کی کفالت کا ایک پورا نظام کام کر رہا ہے۔

ہاں بہت سی جگہوں پر جہاں لالچ نے دلوں میں گھر بنایا ہے وہاں ان یتیم بچوں کے مال پر ڈاکہ بھی پڑتا ہے۔ ان پر ظلم بھی روا رکھا جاتا ہے، ان کی جائداد ہتھیا لی جاتی ہے اور یہ کوئی اور نہیں، ان کے اپنے اور سگے رشتہ دار کرتے ہیں۔ یقیناً انھیں کسی نے بتایا نہیں ہوگا کہ اللہ نے خود فرمایا تھا" جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں۔ حقیقت میں اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔ وہ لازماً جہنم کی بھڑکتی آگ میں جھونکے جائیں گے۔" (سورۃ النساء 10)

ایک محتاط اندازے کے مطابق ہمارے ہاں چالیس لاکھ سے زائد یتیم بچے ہیں۔ جن کو یہ معاشرہ اور چیریٹی کی تنظیمیں پال رہی ہیں۔ ان سپانسرڈ بچوں میں سے بیشتر کے ڈونر بیرون ملک ہیں، وہ ان یتیم بچوں کو ولنر ایبل (Vulnerable) پاتے ہیں اور اسی لیے دستِ تعاون دراز کر کے اللہ کے ہاں اپنے لیے عزت اور حفاظت چاہتے ہیں۔ ماں باپ کے بنا پروان چڑھنے میں جو تنہائی اور بے چارگی ہے اس کا کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ گھنے سایہ دار درخت کی طرح کسی مہربان سرپرست کی ہر آن ضرورت رہتی ہے۔

مجھے یاد ہے پیپر یئر یونیورسٹی میں شعبہ مینجمنٹ سائنس کی سربراہی کا میرا پہلا سال تھا جب ایک جوان رعنا طالب علم سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بال کندھوں تک آتے تھے۔ فیشن بھی وہ سارے ہی کرتا تھا جو اس عمر کے نوجوانوں کو عزیز ہوتے ہیں۔ ایک روز اس نے تنہائی میں ملنا چاہا۔ آفس ملاقات کے لیے آئے طلبہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سے بھرا ہوا تھا۔ ان کو نمٹا کر متوجہ ہوا تو اس نے ایک عجیب دُکھ سے ہمکنار کیا۔ بولا'' میں ایس او ایس ولیج میں رہتا ہوں اور یونیورسٹی کے ریکٹر صاحب کی خصوصی مہربانی سے یہاں پڑھ رہا ہوں۔ وہ ہر بار کچھ بچوں کو سپانسر کرتے ہیں۔ پڑھائی میں وہ اچھا تھا اور فیس کی ادائی کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ میں سوچ میں تھا کہ یہ اب کیا مسئلہ مجھے بتائے گا جس نے اسے پریشان کر رکھا ہے۔

اس نے اچانک سر اُٹھایا اور بولا سر! میرے والد سندھ میں ڈی آئی جی پولیس تھے۔ ہماری زندگی خوشیوں اور مسرتوں سے بھری تھی۔ بہترین گھر اور اسکول اور اس سے زیادہ اچھا ماحول اور خیال رکھنے والے لوگ۔ پھر ایک روز سب خواب ہوگیا۔ والد صاحب، والدہ، بہن بھائی سبھی ایک حملے میں مارے گئے۔ کسی نے خدا ترسی کی اور لاشوں کے بیچ میں سے مجھے اُٹھا کر لے گیا ورنہ میں بھی کسی قبر کا رزق ہوتا۔ کچھ عرصے بعد ایس او ایس کے حوالے کر دیا۔ میں وہیں پلا بڑھا اور وہیں تعلیم پائی۔ آپ میری بے بسی کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ قدرت نے مجھے کہاں سے کہاں لا پٹخا...... میں مشکلات کو خاموشی سے جھیلتے ہوئے پڑھ لکھ کر ایک اچھی اور باعزت زندگی شروع کرنے کا خواب آنکھوں میں سجائے یونیورسٹی آ گیا۔'' ایس او ایس ولیج میں یتیم بچے خصوصی طور پر بنے گھروں میں رہتے ہیں اور ہر گھر میں ایک ماں ہوتی ہے جو ان کا خیال رکھتی ہے۔ یہ جس کا بھی آئیڈیا تھا۔ اس نے بہت سے یتیم بچوں کی زندگی تباہی سے بچائی اور انھیں اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔

یاسر کو جس پریشانی نے گھیرا تھا وہ ان کا نیا انچارج تھا جسے خود بھی اسی ادارے نے پناہ دی اور پالا پوسا۔ اس بھلے آدمی نے اس احسان اور مہربانی کو محسوس کرنے اور اب لوٹانے کے بجائے یونیورسٹی میں پڑھنے والے بچوں کو آتے جاتے، بات بات پر بے عزت کرنا شروع کر دیا تھا۔ کمزور لوگوں کو جب جب اختیار ملتا ہے تو تکبّر ضرور دل دروازے پر آن بسیرا کرتا ہے۔ ایسے لوگ لفظوں، جملوں اور اشاروں سے دوسروں کو اذیت دیتے ہوئے خوشی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ زندگی اگر ریل کی پٹڑی ہے تو یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جہاں انسان اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا کانٹا بدل لیتا ہے اور وہ بدبختی کو اپنی منزل ٹھہرا لیتا ہے۔

دوسروں کو عقل سکھانا، مشورے دینا، سچ کہوں تو دنیا کا سب سے آسان کام ہے۔ اس لیے سپروائزر کو بلا کر سمجھایا بجھایا، احساس دلایا حالاں کہ خود ہم سے تو ایک یتیم بچہ نہ سنبھلا تھا اور اُس خوف کے مارے کہ کہیں ہمارا گھر یتیم سے سلوک میں کمی بیشی کے باعث بہترین ہونے کے بجائے بدترین کی قطار میں نہ کھڑا ہو، اسے اس کے وارث کے حوالے کر دیا تھا۔ اور اگر کسی کا وارث ہی نہ ہو تو...... یقیناً یہ اللہ کا ہی متبادل انتظام ہے کہ کمزوروں اور بے بسوں کا رزق اس نے دولت مندوں کے رزق میں شامل کر دیا ہے۔ جو کوئی اس انتظام کو سمجھ لیتا ہے اپنی دولت اور آمدنی کا ایک حصہ خیر اور خیرات کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ اور پھر دونوں ہاتھوں سے اللہ کی نعمتوں کو سمیٹتا ہے۔ جن کو لگتا ہے اپنی کمائی کے وہ واحد مالک ہیں اور انہی کے ہاتھوں نے وہ سب کمایا ہے وہ بیچارے اسی غلط فہمی میں مارے جاتے ہیں۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اُردو ادب و دانش کی آبرو جناب اشفاق احمد کے گھر ہمیشہ ایک آدھ بچہ کام کر رہا ہوتا تھا۔ صاف ستھرے کپڑے اور تمیز دار، یقین نہیں آتا تھا کہ ملازم ہے یا گھر کا فرد۔ ایک بچہ کافی عرصہ رہا۔ ایک بار نظر نہ آیا تو میں نے پوچھا خان صاحب وہ کہاں گیا؟ داستان سرائے کے مکین نے بتایا کہ تمھاری بانو آپا کہیں نہ کہیں سے کوئی یتیم مسکین اُٹھا لاتی ہے۔ سالوں منہ ہاتھ دھلاتی ہے، اچھے کپڑے پہناتی ہے۔ میٹرک، ایف۔اے کروا کے جب کہیں نوکری کروا دیتی ہے تو خوش ہو کر سوچتی ہے کہ "فرض ادا" ہوگیا مگر ہر بار ہی کچھ دنوں بعد دُکھی سی شکل بنائے میرے پاس آ کر کہتی ہے۔ "خان صاحب! ہم نے تو اسے اچھا کھلایا، پہنایا اور پڑھایا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے، نوکر بھی کروایا مگر پہلی تنخواہ سے پہلے ہی اس کی طرف سے جو سوغات ملی ہے وہ شکوے اور شکایت سے بھرے یہ جملے ہیں کہ اپنے بچوں کو تو افسر بنا دیا مجھے صرف انٹر تک پڑھا کر نوکر کروا دیا۔" ایسے جملے کی کاٹ بڑی تیز ہوتی ہے۔ خان صاحب مسکراتے نیکی کمانا آسان نہیں ہے۔ جملے نہیں سہے جاتے تو اپنا معمول بدل لو، مگر نہ تم بدلتی ہو نہ تمھارا معمول۔ بہتر ہے صبر کرو اسی کا پھل لے لیں گے۔

یتیمی کے دکھ کی چادر کو بے بسی کے ساتھ تان کر سونے والے اگرچہ بہت ہیں مگر تاریخ ایسے عظیم ناموں سے بھی بھری اور بجی ہوئی ہے جنھوں نے یتیمی کی کوکھ سے جنم تو لیا مگر انتھک محنت، مطالعہ اور خدا اور اس کی مخلوق سے محبت کے باعث نامور ہوئے۔ ان میں امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام ابن جوزیؒ، امام بخاریؒ، حافظ جلال الدین سیوطیؒ، شیخ سعدی ہی نہیں رابعہ العدویہ بھی شامل ہیں جو غلام بنا لی گئی تھیں مگر اپنی عبادت اور سیرت کے باعث نشانِ راہ بنیں۔ ابھی انٹرنیٹ سے ایک فہرست سامنے آئی ہے جس میں دنیا کے 700 ایسے یتیم بچوں کے نام ہیں جنھوں نے بعد میں شہرت اور عزت پائی۔ ان میں ارسطو، ٹالسٹائی، ورڈز ورتھ، جان کیٹس، سائرس اعظم اور نیلسن منڈیلا کے نام شامل ہیں۔

سوچتا ہوں اللہ جی نے انسان کو بھی خوب بنایا ہے۔ خوبیوں اور کمالات سے یوں نوازا ہے کہ ایک ہی وقت میں متضاد و متصادم کام کرتا ہے۔ خود ہی کپڑے میلے کرتا ہے۔ خود اسے دھوتا اور صاف کرتا ہے۔ خود ہی کپڑے بناتا اور خود ہی ان کو کھونچیں لگاتا اور پھر رفو کرتا ہے۔ اچھے ڈرائی کلینر اپنے ہاں رفوگر رکھتے ہیں۔ ماہر اور قابل جن کی آنکھیں اور ہاتھ دھاگے کے رنگ اور بناوٹ کا اتنا لحاظ کرتے ہیں کہ مرمت کے بعد پتا ہی نہیں چلتا کہ کہاں سے رفو کیا ہے۔ مجھے لگتا ہے الخدمت کے عبدالشکور احمد، ریڈ کے محمود احمد یا ہیلپنگ ہینڈ کے فضل الرحمن اور ان کے ساتھ کام کرنے والے ایسے ہی رفوگر ہیں جو ہماری معاشرتی زندگی کی پھٹی چادر رفو کرنے نکلے ہیں جو کبھی نہ کبھی خود ہم سے رفو نہ ہو سکی تھی۔ ایسا کام جس کے ساتھ بہت سارا رسک (Risk) وابستہ ہو کبھی آسان نہیں ہوتا۔ آسانی دینے والے ان محسنوں اور رفوگروں میں اپنا نام شامل کروانے کو دل لمحہ بھر کو ضرور مچلتا ہے مگر اس ڈر کا کیا کروں جو دل میں کہیں چوکڑی مار کر بیٹھا اب بھی ڈراتا رہتا ہے۔

○○○

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

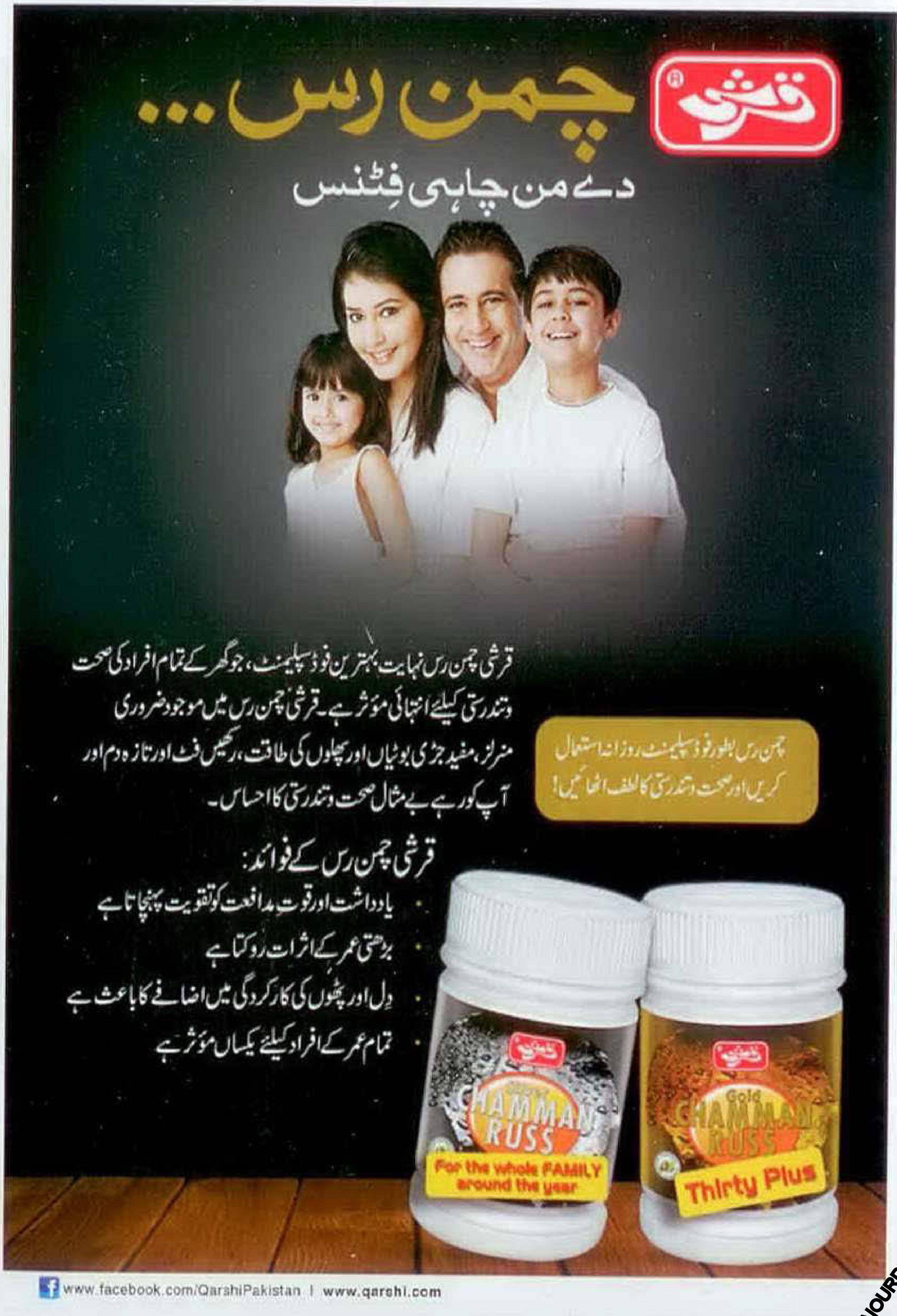

WWW.AIOURDUBOOKS.NET